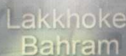
تذکرہ

مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ

حالات • خدمات • خاندان



تالیف محمد اسحاق بھٹی

تقدیم پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

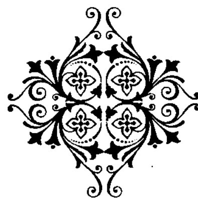
kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

تذکرہ

مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ

حالات ۔ خدمات ۔ خاندان



تالیف محمد اسحاق بھٹی

تقدیم پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی



مکتبہ اسلامیہ

کتاب

تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ

تالیف

محمد اسحاق بھٹی

کمپوزر

محمد لقمان سعید

ناشر ------------------ محمد سرور عاصم

اشاعت ------------------ 2015ء

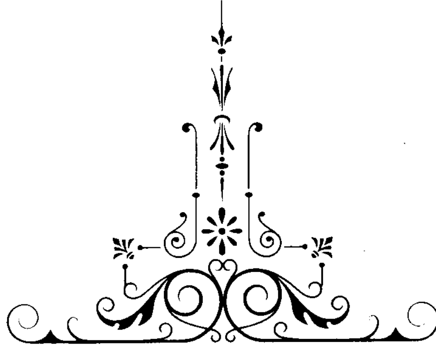
ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

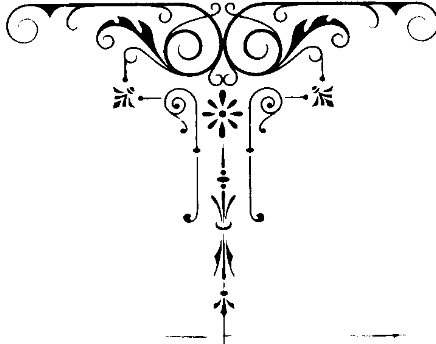
لاہور: بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

0300-8661763
/maktabaislamia1
www.maktabaislamiapk.com
maktabaislamiapk@gmail.com



بسم الله الرحمن الرحيم



انتساب

لکھوی اور غزنوی علمائے کرام کے درمیان ہمیشہ گہرے علمی اور روحانی مراسم قائم رہے۔ بعض لکھوی اصحابِ علم نے امرتسر جا کر غزنوی حضرات سے حصولِ فیض کیا اور متعدد غزنوی بزرگوں نے لکھو کے آ کر یہاں کے اساتذۂ فن کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ اس قسم کے بہت سے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ انھوں نے 16/ دسمبر 1963ء کو وفات پائی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو دونوں خاندانوں کے اس تعلق کی بنا پر میں اپنی اس متاعِ حقیر کو عقیدت کی طشتری میں رکھ کر نہایت احترام کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کرتا اور عرض گزار ہوتا۔

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زارِ تو ام
وگر کشادہ جبینم گلِ بہارِ تو ام

محمد اسحاق بھٹی

دو سو سال

[illegible]

مسلمانوں کی توجہ کی ضرورت ہے

[illegible]

خرچ ماہواری بابت تنخواہ ملازمین وغیرہ

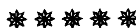
[illegible]

ابو الحسن محمد علی ... مہتمم و سیکرٹری ...

دار الاسلام لکھوکے ... ضلع فیروز پور پنجاب

حضرت مولانا محمد علی لکھوی کا شائع فرمودہ یہ اشتہار 1920ء کا ہے۔ اس وقت اس مدرسے کے اجراپر دو سو برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس حساب سے اب اس کی عمر تقریباً تین سو سال کو پہنچ گئی ہے۔

ترتیب



عرض ناشر

الحمدللّٰہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی رسوله الأمین، أما بعد:

تذکرۂ رفتگان یا وفیات نگاری میں مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ ایک ایسا نام ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ تذکرہ نویسی میں انھیں مہارت تامہ حاصل ہے جس کی بیّن دلیل اس سلسلے میں ان کی اہم، مفید اور مبسوط کتابیں ہیں جو ایک عرصے سے عوام وخواص سے داد تحسین وصول کر رہی ہیں۔ بھٹی صاحب کو اللہ رب العزت نے ایسا ملکہ عطا کیا ہے کہ اگر وہ کسی شخصیت کا ذکر کریں تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قاری خود اس ذات سے ہم کلام ہے، اگر کسی علاقے سے متعلق لکھیں تو یوں احساس ہوتا ہے گویا قاری خود اس سرزمین پر چل پھر کر مشاہدہ کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مکتبہ اسلامیہ اس سے قبل بھٹی صاحب کی تصنیفِ لطیف ''کاروانِ سلف'' شائع کر چکا ہے اور اب ''تذکرۂ مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ'' منظر عام پر لانے کی بھی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ، معروف اسکالر پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی حفظہ اللہ کے والد ماجد ہیں۔ مولانا لکھوی رحمۃ اللہ اپنے علمی کمالات میں ائمۂ سلف کی یادگار تھے، ان کی صحبت میں بیٹھ کر، ان کی باتیں سن کر ایمان میں تازگی محسوس ہوتی تھی، آپ فطرتاً پاک طینت، سراپا شرافت و انسانیت اور محبت و مروت تھے۔ مولانا لکھوی رحمۃ اللہ عزیزوں کے معاون ومددگار، دوستوں کے ہمدرد و غمگسار اور غریبوں کے غمخوار تھے۔ آپ ضبط وتحمل کا پہاڑ، ایثار وقربانی کا پیکر اور عفوودرگزر کی عملی تصویر تھے۔

تحریر، تقریر اور تدریس کے ذریعے سے اپنے اسلاف کی طرح ردِ بدعات وخرافات اور احیائے سنت میں بڑا اہتمام تھا۔ مولانا لکھوی رحمہ اللہ کی جھلک ان کے صاحبزادے محترم ڈاکٹر محمد حماد لکھوی حفظہ اللہ میں بھی نظر آتی ہے جو یقیناً مولانا لکھوی رحمہ اللہ ہی کی تربیت کا اثر ہے اور ڈاکٹر صاحب جن شخصیات سے زیادہ متاثر ہیں ان میں سرفہرست ان کے والد محترم ہی ہیں۔

قارئین کرام! زیر نظر کتاب کی جہاں بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے عبقری شخصیات کی تاریخ اور ان کی علمی خدمات محفوظ ہوگئی ہیں وہاں ایک عظیم خاندان کا مکمل تعارف بھی ہے جو ان خاندانوں میں سے ایک ہے جس کے برصغیر پاک و ہند میں گہرے نقوش ہیں، میری مراد خاندان لکھویہ ہے اور شاید اس سے پہلے اتنی تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ اس موضوع پر نہ لکھا گیا ہو۔

راقم الحروف محترم ڈاکٹر صاحب اور مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کا ممنون ہے جنھوں نے مکتبہ اسلامیہ پر اعتماد کرتے ہوئے اشاعت کی ذمے داری سونپی جسے ادارے نے اپنی روایت کے مطابق بھرپور طریقے سے نبھایا ہے۔ ولِلّٰہِ الْحَمْدُ

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو علماء وطلبا اور عوام وخواص کے لیے مشعل راہ بنائے اور مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ کے درجات کو بلند فرمائے۔ (آمین)

محمد سرور عاصم

مقدمہ

(پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰه وكفى وسلام على عباده الذين اصطفىٰ أشهدأن لااله الااللّٰه وحده لا شريك له وأشهدأن محمداً عبده ورسوله صلى اللّٰه عليه واله وسلم، امابعد:

ایک سوال جو مجھ سے اکثر طلبہ کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ کون سی شخصیت سے آپ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں؟ میرا جواب اس بارے میں یہ ہے کہ میں اپنے والدِ گرامی مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ سے متاثر ہوں کیوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عامل کوئی نہیں دیکھا، پھر میں سوچتا ہوں کہ طلبہ میری اس بات کو سوائے میری اپنے والد صاحب کے ساتھ وابستگی کے اور کیا سمجھ پائیں گے؟ والد صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ میرے الفاظ میں وہ طاقت نہیں اور شاید ہو بھی نہیں سکتی کہ جن حضرات کو والدِ محترم سے ملاقات کا موقع نہیں ملا اور ان کی مجلس میں بیٹھ کر ان کی گفتگو نہیں سن سکے، ان تک والدِ محترم کی شخصیت کا مکمل تاثر پہنچایا جا سکے، لیکن جن لوگوں کے والد صاحب سے روابط رہے اور انھیں ان کے دروس و مواعظ میں حاضری کے مواقع میسر آئے، وہ شاید میرے کمزور اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے باوجود ان کی شخصیت کی تاثیر کو محسوس کر سکیں۔ زیرِ نظر الفاظ کا سپردِ قلم ہونا محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کے حکم کے سبب ہے جنھوں نے والدِ گرامی کے تذکرے پر مشتمل اپنی کتاب کے

مقدمے کے طور پر چند حروف لکھنے کے لیے فرمایا۔

ہم تمام بھائیوں کا اپنے والد صاحب کے ساتھ تعلق صرف باپ بیٹے کا تعلق ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ انتہائی شفیق اور متحمل مزاج باپ ہونے کے ساتھ ساتھ درحقیقت ایک کامل مربی، مؤثر استاد اور ہمارے روحانی پیشوا بھی تھے۔ میری پیدائش دسمبر 1965ء کی ہے اور 1971ء کے کچھ واقعات مجھے یاد ہیں۔ والد صاحب کی وفات 28 فروری 1998ء کو ہوئی۔ اس طرح میں نے اپنے والد صاحب کو تقریباً ستائیس برس ہوش وحواس کی عمر میں دیکھا ہے۔ اور جتنا اولاد اپنے والدین کو جانتی ہے اتنا شاید کوئی اور نہیں جان سکتا۔ ان ستائیس برسوں میں والد صاحب کو میں نے صرف گھر میں نہیں دیکھا، ان کے ساتھ بچپن کے ابتدائی دور سے لے کر جوانی تک اکثر وبیشتر سفر بھی کیا، اس وقت بھی سفر کیا جب وہ میری انگلی پکڑ کے مجھے چلاتے تھے اور اس وقت بھی جب میں ان کے بڑھاپے میں بطور خادم ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ تنہائی میں دیکھا اور محفل میں بھی۔ عوام الناس سے گفتگو اور خطاب کرتے ہوئے بھی دیکھا اور خواص کی مجالس میں بھی، اور بہت پڑھے لکھے ماحول میں لوگوں سے ہم کلام ہوتے بھی دیکھا، انتہائی غم کی کیفیت میں بھی دیکھا اور خوشی کے عالم میں بھی۔ میں نے پوری زندگی میں ان کا ایک بھی عمل خلافِ سنت نہیں دیکھا۔ مثلاً میں نے زندگی بھر ان کو قہقہہ لگا کر ہنستے نہیں دیکھا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ قہقہہ لگانا خلاف سنت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ہنسی نہیں آتی تھی، بلکہ جب ہنسی آتی تھی تو مسکرا دیتے تھے اور اگر بہت زیادہ ہنسی آتی تو زور سے منہ بند کر لیتے مبادا کوئی آواز منہ سے نکل جائے اور قہقہے کی صورت اختیار کر جائے۔ اس طرح انتہائی غم کی کیفیت میں اس وقت دیکھا جب ہمارے دادا جان محترم مولانا محمد علی لکھوی مدنی کی 1973ء میں وفات کی خبر پہنچی۔ بہت روئے، اس کا پتہ یا تو آنسوؤں سے چلایا پھر ان جسمانی جھٹکوں سے جو آہوں اور سسکیوں کی آواز کو دبانے کی غرض سے زور سے منہ بند کر لینے کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن کوئی آواز نہیں نکالی۔ ویسے والد صاحب اکثر رویا کرتے تھے، موت یا آخرت کو یاد کر کے۔ بعض اوقات اپنے پردادا (حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ)

کی کتاب ''احوال الآخرۃ'' پڑھتے ہوئے اتنا روتے کہ اردگرد کے لوگ اور خاص طور پر بچے پریشان ہو جاتے کہ کہیں کوئی ناخوش گوار واقعہ تو پیش نہیں آ گیا۔ ہم سب (بچوں) کو بھی اکثر تلقین کیا کرتے تھے ﴿فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیرا﴾ (سورۃ التوبہ:۸۲) یعنی کم ہنسیں اور زیادہ روئیں۔ بعض اوقات ہمیں آپس میں بیٹھے ہوئے بہت زیادہ ہنستا دیکھ لیتے تو سوالیہ انداز میں یوں تلقین فرماتے کہ اتنا کیوں ہنس رہے ہو؟ کیا پاکستان میں اسلام نافذ ہو گیا ہے؟ یا کشمیر فتح ہو گیا ہے؟ یا کسی ذریعے سے جنت کی بشارت مل گئی ہے؟ اگر ایسی کوئی خبر نہیں تو اتنا زیادہ ہنسنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

والد صاحب اپنی اولاد سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ جب بھی سفر سے واپس تشریف لاتے ہمارے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لے کر آتے، پھل فروٹ، بسکٹ یا بیکری کی کوئی چیز۔ گھر میں سب سے چھوٹے بچے کے لیے خصوصی طور پر کوئی چیز الگ سے لاتے، مثلاً نائس (Nice) بسکٹ کا ڈبہ۔ گھر واپسی چاہے ایک دن بعد ہوئی ہو، ہم بچوں کو اس قدر محبت سے گلے لگاتے جیسے عرصے سے بچھڑے ہوں۔ خاص طور پر بیٹیوں کو پیشانی یا سر پر بوسہ بھی دیتے۔ اپنے بھانجے بھتیجوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کو بھی بالعموم اسی طرح ملتے۔ بعد ازاں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے بھی ایسا ہی سلوک کیا کرتے تھے۔ بچوں کی جائز ضروریات پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے، البتہ ناجائز باتوں سے منع کرنے کے لیے سختی سے کام بھی لیتے تھے۔

ایسے کھیل کو جس میں کوئی جسمانی ورزش نہ ہوتی فضول کھیل قرار دیتے اور ایسے کھیلوں مثلاً لڈو، کیرم بورڈ وغیرہ کھیلنے سے منع کرتے۔ جن کھیلوں میں جسمانی ورزش کا کوئی پہلو نکلتا اسے کھیلنے سے ہرگز منع نہ کرتے بلکہ اس کے لیے ضروری سامان خرید کر دینے میں بعض اوقات مدد بھی کرتے۔ صرف ایک بات کی تاکید بہت زور دے کر کرتے کہ کھیل کی وجہ سے نماز ضائع نہیں ہونی چاہیے۔ ہم بھائیوں کو کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا جس کو بعض مذہبی اکابر ''غیر اسلامی'' کھیل قرار دیتے ہوئے اس سے منع کرتے ہیں لیکن والد صاحب نے ہمیں کبھی

کرکٹ کھیلنے سے منع نہیں فرمایا، بس یہ تاکید کی کہ نماز ضائع نہیں ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کرکٹ میچوں کے درمیان نماز کا خصوصی اہتمام کرتے اور جب جمعہ کو کرکٹ میچ ہوتا اور کوئی مسجد قریب موجود نہ ہوتی تو ہم گراؤنڈ میں ہی جمعہ کا خطبہ و جماعت کراتے جس میں ہماری ٹیم کے علاوہ کبھی دیگر ٹیمیں بھی شریک ہو جاتی تھیں۔

والد صاحب نے ساٹھ کی دہائی میں گاؤں میں مکان تعمیر کیا تو پہلے مسجد تعمیر کی۔ بعد میں اس سے ملحقہ گھر تعمیر کیا اور مسجد کا ایک دروازہ گھر کی طرف رکھا، لہٰذا ہمیں مسجد جانے کے لیے گھر سے باہر نہیں نکلنا پڑتا تھا بلکہ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر۔ والد صاحب کے مہمان اتنی کثرت سے آتے کہ شاید کوئی دن ہی ایسا ہوتا جب کوئی مہمان موجود نہ ہوتا۔ مہمان خانے کے طور پر مسجد کے دائیں بائیں دو حجرے والد صاحب نے تعمیر کرا رکھے تھے، لہٰذا نماز کے علاوہ مہمانوں کی تواضع کے لیے ہم بھائیوں کو دن میں کئی بار مسجد کے چکر لگانا پڑتے۔ یوں ایک تو بچپن ہی سے ہمیں مسجد کا پاکیزہ ماحول میسر آگیا، جس نے ہماری تربیت میں بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا اور دوسرا یہ کہ والد صاحب اپنے تبلیغی سفر پر جاتے ہوئے بالعموم ہم بھائیوں میں سے کسی ایک کو یا بعض اوقات دو کو، اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ سلسلہ ہماری اوائل عمری سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ والد صاحب کی معیّت میں یہ تبلیغی اسفار بھی ہمارے اندر دینی ذوق پیدا کرنے اور ہمیں فہم و عمل کی طرف راغب کرنے میں انتہائی اہم اور مفید ثابت ہوئے۔ میں دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ آج میرے اندر جتنی دین داری بھی موجود ہے اس میں اللہ کے فضل سے 80۔90 فی صد کردار والد صاحب کی سفر و حضر میں تربیت اور گھر کے ماحول نے ادا کیا ہے، جس کی تاثیر آج تک محسوس کرتا ہوں۔

مسجد کے پاس سے گاؤں کی داخلی سڑک گزرتی تھی، جہاں سے جب کوئی بارات وغیرہ گزرتی اور ڈھول بج رہا ہوتا تو مسجد میں موجود نمازیوں کو بہت پریشانی ہوتی۔ والد صاحب لوگوں کو منع فرماتے کہ ڈھول باجے وغیرہ نہ بجایا کریں۔ بعض لوگ رک جاتے اور بعض لوگ اپنی خوشی کو ''بابا جی'' کے کہنے پر ''خراب'' نہ کرتے۔ لہٰذا دو ایسے واقعات بھی رونما ہوئے کہ

والد صاحب نے عملاً ڈھول کو اپنی چھڑی کی نوک سے پھاڑ دیا۔ ایک واقعہ تو میرے شعور سے پہلے کا ہے جو میں نے اپنے بڑے بہن بھائیوں اور والدہ صاحبہ سے سنا کہ گاؤں میں کسی کی شادی سے پہلے ''گھڑولی'' کی رسم کے دوران میں والد صاحب نے ڈھول بھی پھاڑ دیا تھا اور ''گھڑولی'' بھی توڑ دی تھی (یعنی ایک خاتون کے سر پر اوپر نیچے رکھے ہوئے چھوٹے بڑے کئی گھڑے) جس پر کوئی مقدمہ وغیرہ بھی کرانے کی کوشش کی گئی لیکن معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اور ایک واقعہ کا میں عینی شاہد ہوں کہ دن کے وقت والد صاحب گھر میں آرام کر رہے تھے اور مسجد کے پاس دو ڈھول والے بیک وقت ڈھول پیٹ رہے تھے، ہم سب بچے گھر میں پچھلی حویلی میں جو بالکل مسجد سے متصل تھی، کھیل رہے تھے کہ اچانک والد صاحب کو ہم نے چھڑی پکڑے گھر سے باہر نکلتے دیکھا تو ہم بھی پیچھے نکل پڑے۔ والد صاحب کی بارعب شخصیت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک ڈھول والا تو بھاگ گیا، جب کہ دوسرا والد صاحب کی چھڑی کی پہنچ سے بچ نہ سکا۔ چھڑی کی نوک ایک بار لگنے سے اس کا ڈھول پھٹ گیا جب کہ دوسری دفعہ چھڑی اس ڈھول والے کے اپنے جسم کے پچھلے حصے میں لگی جس کے بعد وہ بھی بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے والد صاحب کی سختی قرار دیں، لیکن بدعات اور معاشرتی خرابیوں کو ختم کرنے کی غرض سے بسا اوقات ایسی سختی بھی کرنا پڑتی ہے۔

والد صاحب کی تمام شعوری زندگی دین اسلام کی تبلیغ میں گزری۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں سترہ برس کا تھا جب مجھے میرے والد صاحب (مولانا محمد علی لکھوی) نے جمعہ پڑھانے کا حکم دیا۔ اس وقت سے لے کر اپنی عمر کے آخری حصے تک نہ صرف اپنے مسکن میں ہمیشہ جمعہ پڑھاتے رہے بلکہ اس کے علاوہ بھی پاکستان کے متعدد مقامات میں قریہ قریہ اور شہر شہر بالخصوص ساہی وال اور قصور کے اضلاع میں وعظ و دروس کے ذریعے سے احکام دین لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ دیہات میں لوگوں کے درمیان رہ کر دین کے عملی مسائل سکھاتے، یعنی عبادات واذکار میں لوگوں کی عملی وروحانی تربیت کے علاوہ زکوۃ وعشر کے عملی پہلوؤں کے بارے میں تربیت ومدد فراہم کرتے۔

ایک دفعہ والد صاحب کی وفات کے بعد غالباً 1999ء میں مجھے چچا جان محترم مولانا معین الدین لکھوی مرحوم کے ہمراہ بطور ڈرائیور ضلع قصور کے ایک گاؤں ''خرم ہٹھاڑ'' جانے کا اتفاق ہوا جہاں چچاجان نے جمعہ کا خطبہ دینا تھا۔ جمعہ کے بعد چچا جان کے اردگرد لوگ اکھٹے ہوگئے اور میں چوں کہ بطور ڈرائیوران کے ساتھ تھا اور میرا تعارف بھی یہاں کے لوگوں سے نہیں تھا لہٰذا میں مسجد میں ایک طرف ہوکر بیٹھ گیا، اس اثنا میں گاؤں کے ایک بزرگ میرے پاس آئے اور ایک اجنبی کو یوں بیٹھا دیکھ کر تعارف کی غرض سے باتیں کرنے لگے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ میں مولانا صاحب کے ساتھ بطور ڈرائیور آیا ہوں، انھوں نے میرا نام پوچھا اور نام جاننے کے بعد ان کی توجہ اور زیادہ ہوگئی، ان کو کچھ اندازہ تھا کہ ایسے نام مولانا محی الدین لکھوی کے بیٹوں کے ہیں۔ لہٰذا باباجی کے ''شوق تعارف'' میں مزید تیزی آئی اور براہ راست سوال کر دیا کہ تم مولانا محی الدین لکھوی کے بیٹے ہو؟ میرا اثبات میں جواب سنتے ہی انھوں نے مجھے گلے لگا لیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جب جذبات کچھ ٹھنڈے پڑے تو گویا ہوئے کہ بیٹا! تمھیں پتہ نہیں اس گاؤں سے تمھارے والد صاحب کا کیا تعلق تھا۔ ہمارے گاؤں کے لوگ بے دین اور بدعقیدہ تھے۔ ایک دن گاؤں کا ایک شخص اپنی زمین میں پانی لگا رہا تھا کہ فجر کے بعد درس قرآن کی آواز لاؤڈ سپیکر کے ذریعے سے جو قریبی قصبہ ڈھولن ہٹھاڑ سے آرہی تھی، اس کے کان میں پڑی۔ وہ شخص نہ تو درس دینے والے مولوی صاحب کو جانتا تھا اور نہ دین کا زیادہ ذوق رکھتا تھا، لیکن درس میں اتنی کشش اور للہیت تھی کہ وہ آدمی اپنا کام وہیں چھوڑ کر درس دینے والے مولوی صاحب کو ملنے ڈھولن ہٹھاڑ چلا گیا، اور ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے بعد ان سے اپنے گاؤں ''خرم ہٹھاڑ'' آنے کا وعدہ لے لیا۔ یہ درس دینے والے مولوی محی الدین لکھوی صاحب تھے۔ ان کی ہمارے گاؤں میں آمد کیا شروع ہوئی کہ رفتہ رفتہ پورے گاؤں کے لوگ صحیح العقیدہ مسلمان بن گئے۔

بیٹا! تیرے والد صاحب نے ہمیں صرف عقیدہ، نماز روزہ اور طہارت و پاکیزگی ہی

نہیں سکھائی بلکہ زکوٰۃ وعشر کے باقاعدہ رجسٹر بنوائے، اس میں تحریر شدہ حساب خود آکر ہر سال چیک کیا کرتے تھے۔ بزرگ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے مجھے بتایا کہ آج ہمارے پورے گاؤں میں بہت خوشی کا سماں ہے اور ہم نے گاؤں کی گلیوں میں جھاڑو دیا ہے اور یہ دکھانے کے لیے باباجی میرا بازو پکڑ کے مجھے مسجد سے باہر گلی میں لے گئے اور کہا کہ یہ ساری خوشی اس لیے نہیں کہ مولانا معین الدین لکھوی تشریف لا رہے ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ ہمارے ''باباجی'' کے چھوٹے بھائی تشریف لا رہے ہیں۔ اس بزرگ نے زکوٰۃ وعشر کا رجسٹر مجھے بھی دکھانے کے لیے ساتھ چلنے کی خواہش کی لیکن میں چچا جان کے ساتھ پابند ہونے کے باعث اس بزرگ کے ساتھ نہ جا سکا۔ اس واقعہ سے والد صاحب کے طریق تبلیغ اور اسلوب تربیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور وعظ وتبلیغ کا یہ سلسلہ ان کی پوری زندگی یعنی سترہ سال کی عمر سے 84 ویں سال تک جاری رہا۔

والد صاحب کا عام معمول یہ تھا کہ ہفتے میں چھ دن اپنے تبلیغی سفر جاری رکھتے اور صرف ایک دن کے لیے گھر تشریف لاتے۔ گھر رہنے کے لیے بدھ کا دن مقرر تھا۔ لہٰذا بالعموم منگل کی شام یا رات تک واپس گھر تشریف لے آتے کیوں کہ بدھ کے دن مہمانوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ اور پھر جمعرات کی صبح (اور بعض اوقات بدھ کی شام کو ہی، اور کبھی جمعہ کی صبح) اگلے ہفتے کے تبلیغی سفر پر روانہ ہو جاتے۔ بعض اوقات کئی کئی دن مسلسل گھر بھی رہتے۔ لیکن لوگوں کے اصرار پر پھر عازم سفر ہو جاتے۔ اکثر وبیشتر ان کے وعدے لوگوں نے کئی مہینے پہلے سے لے رکھے ہوتے تھے۔ ان وعدوں کا ریکارڈ رکھنے کے لیے ایک پاکٹ سائز ڈائری والد صاحب کے پاس ہمیشہ موجود رہتی۔ جہاں کہیں ان کے وعظ یا جمعے کے خطبے کا پروگرام ہوتا اس کے فوراً بعد کچھ مزید لوگ وعدہ کے لیے تقاضا کرتے اور والد صاحب ڈائری کے اوراق دیکھ کر خالی دنوں کے وعدے دے دیتے۔ بعض اوقات ان وعدوں کا دورانیہ پورے سال تک پہنچ جاتا۔ والد صاحب کے عقیدت مندوں کی اکثریت ان کے مریدین کی تھی یعنی ان لوگوں کی جنھوں نے باقاعدہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ والد صاحب اس شخص سے

''بیعتِ ارشاد'' لیا کرتے جو کوئی ان کا مرید ہونے کا مطالبہ کرتا۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ان کے والد صاحب (یعنی میرے دادا مولانا محمد علی لکھوی مدنی) بھی ''بیعتِ ارشاد'' لوگوں سے لیا کرتے تھے، اور یہ کہ وہ خود بھی اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ والد صاحب یہ بھی بتایا کرتے تھے کہ ان کے والد صاحب نے جو ان کے مرشد بھی تھے خود انھیں حکم دیا تھا کہ لوگوں سے ''بیعت'' لیا کرو۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے والد (یعنی میرے دادا مولانا محمد علی لکھوی مدنی) مسجد نبوی کے مدرسِ حدیث کی حیثیت سے مدینہ منورہ میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے (اور 45 سال مسجد نبوی میں درسِ حدیث دینے کے اعزاز کے ساتھ ساتھ جنت البقیع میں دفن ہونے کا شرف بھی انھیں حاصل ہوا۔) والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اصل ''بیعت'' جو ہر مسلمان پر شریعت اسلامیہ نے لازم کی ہے وہ تو خلیفۃ المسلمین کی بیعت ہے، لیکن نظام خلافت کے عدم قیام کے باعث کم ازکم بیعتِ اصلاح یا بیعتِ ارشاد ضرور کر لینی چاہیے، سلسلہ بیعت کلیۃً ساقط نہیں ہوا لہٰذا کسی بھی پابندِ شریعت مصلح کی بیعت کر لی جائے تا کہ ایک تو کسی نہ کسی سطح کی اجتماعیت قائم ہو کر باہمی معاملات کو ایک نظم کی شکل دی جا سکے اور دوسرے ''فریضۂ بیعت'' کی حسبِ توفیق ادائیگی کے ذریعے ''جاہلیت کی موت'' کی وعید سے بچا جا سکے جو حدیثِ نبوی ﷺ کے مطابق نظامِ خلافت کی موجودگی میں بیعت نہ کرنے والے کو سنائی گئی ہے۔ والد صاحب جو بیعت اپنے مریدوں سے لیتے تھے اس کے الفاظ میری اور برادر محترم ڈاکٹر محمد حمود لکھوی کی یادداشت کے مطابق حسب ذیل ہیں۔ مردوں سے ہاتھ پکڑ کر بیعت لی جاتی اور خواتین سے بوقت بیعت پردے کے پیچھے صرف عربی یا پنجابی الفاظ دہروائے جاتے۔

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ھادی لہ و اشھدان لاالہ الااللّٰہ وحدہ لاشریک لہ واشھدان محمداً عبدہ و رسولہ امابعد:

امنت باللّٰہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ والقدر خیرہ وشرہ والبعث بعد الموت:

من لیا میں اللہ پاک نوں، اتے اوہدے فرشتیاں نوں، اتے اوہدیاں کتاباں نوں، تے اوہدے رسولاں نوں، تے چنگی تے مندی تقدیر نوں، تے مرنے توں بعد جی اٹھنے نوں۔ میں توبہ کرنا ہاں: کفر شرک توں، بدعت والی رسماں توں، چوری بدکاری توں، شراب جوئے توں، گلے شکوے توں، لڑائی جھگڑے توں، گال مندے توں، جھوٹ بہتان توں، تے سارے غیر شرع کماں توں۔ میں وعدہ کرنا ہاں نماز نوں قائم کراں گا، روزے رکھاں گا، زکوٰۃ دیاں گا۔ ہر مسلمان دی خیر خواہی کراں گا۔ ان شاء اللہ

پنجابی کے ان الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے:

میں نے مان لیا اللہ پاک کو، اس کے فرشتوں کو، اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو، اچھی اور بری تقدیر کو اور موت کے بعد زندہ ہونے کو۔ میں توبہ کرتا ہوں کفر شرک سے، بدعت کی رسموں سے، چوری اور بدکاری سے، شراب اور جوئے سے، گلے شکوے سے، لڑائی جھگڑے سے، گالی گلوچ سے، جھوٹ اور بہتان سے اور تمام غیر شرعی کاموں سے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نماز قائم کروں گا، روزے رکھوں گا، زکوٰۃ دیا کروں گا۔ ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا۔ ان شاء اللہ

یہ بیعت تین حصوں پر مشتمل تھی، اقرار، توبہ اور وعدہ۔ بعد از بیعت اپنے مریدوں کے انفرادی معاملات کے علاوہ والد صاحب ان کے خانگی، خاندانی اور معاشرتی معاملات میں بھی ان کی رہنمائی کرتے۔ ان کے بڑے بڑے باہمی تنازعات کا فیصلہ بھی والد صاحب شرعی اصولوں کی روشنی میں اس طرح کر دیتے کہ مریدوں کو قانونی وعدالتی پیچیدگیوں سے بچنے کے ساتھ ساتھ باہمی اصلاح و خیر خواہی کے لیے رہنمائی میسر آ جاتی۔ یوں اصلاح و تربیت اور اقامتِ دین کا اپنی سطح کا ایک ایسا نظام از خود وجود پذیر ہوگیا تھا کہ اس کی تاثیر اور افادیت اس سے منسلک لوگ ہی بخوبی جانتے ہیں۔

میں بھی اپنے والد صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھا، ہم سات بھائیوں میں سے چھوٹے چار بھائیوں نے والد صاحب کے ہاتھ پر بیعت اکھٹے کی جب والد صاحب ہمارے گاؤں کی مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے۔ والد صاحب کا معمول تھا کہ ہر رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے۔ والد صاحب نے ہم چاروں کو اپنے معتکف (خیمہ) میں بٹھایا، بیعت کی اہمیت بتائی اور چاروں بھائیوں کا اکٹھا ہاتھ پکڑ کر بیعت کے الفاظ دہروائے۔ یوں شفقتِ پدرانہ اور تربیت وتعلیم کے ساتھ ساتھ رشد وہدایت کی روحانی نسبت بھی والد صاحب سے ہی ہمیں میسر آئی۔

ہم اگرچہ والد صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھے لیکن ہم میں سے کسی کو بھی والد صاحب نے بیعت کا سلسلہ آگے جاری رکھنے کا حکم نہیں فرمایا۔ اس کی اصل مصلحت تو وہ خود یا اللہ ہی جانتا ہے، لیکن ایک وجہ جو والد صاحب کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ معاملہ بھی اللہ کے سپرد کیا جس طرح انھوں نے اپنے اور اپنی اولاد کے دیگر معاملات ہمیشہ اللہ کے سپرد کیے، خود اللہ کی بندگی اور اس کے دین کی تبلیغ ہی میں ہمہ تن مصروف رہے، اور بے فکر اور مطمئن رہے کہ ہر چیز کی حفاظت وانتظام اللہ تعالیٰ خود فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتماد وتوکل کی لاج رکھی۔ ہم نے ساری زندگی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ اپنے مالی وخاندانی امور سے مکمل بے فکری وبے پروائی، زیادہ تر تبلیغی اسفار کے سبب گھر میں کئی کئی روز غیر موجودگی اور کثرت عیال کے باوجود ان کے تمام داخلی اور خارجی امور اس درجہ خوبی سے سرانجام پاتے رہے کہ بڑے بڑے منصوبہ ساز اس کی منصوبہ بندی نہ کر سکتے ہوں گے۔

ہم الحمدللہ دو ماؤں سے کل سولہ بہن بھائی ہیں۔ چھوٹی والدہ صاحبہ سے ہم چھوٹے چھوٹے گیارہ بہن بھائی، تقریباً اڑھائی کنال کے وسیع صحن والے گھر میں سکونت پذیر تھے۔ وہ گاؤں کے ایک کنارے پر نوتعمیر شدہ گھر تھا جس کے ساتھ ہی کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ صرف ایک مکان ہمارے گھر سے بھی آگے تھا، وہ تھا ہمارے حقیقی ماموں خلیل الرحمان کا

گھر، جس کی ایک دیوار ہمارے گھر کے ساتھ مشترکہ تھی اور باقی تینوں دیواریں کھیتوں کی طرف تھیں۔ اس دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر دونوں طرف بات کرنے کا انتظام موجود تھا، ماموں کے کمرے کی ایک کھڑکی بھی ہمارے صحن کی طرف کھلتی تھی۔ یوں ہمہ وقت باہمی رابطے اور والد صاحب کی غیر موجودگی میں گھر کی نگرانی کا ایک ''خود کار'' نظام وضع ہو گیا تھا۔ ماموں جان، جن کو ہم سب بہن بھائی ''ماما جی'' کہتے تھے، سکول ماسٹر تھے اور اپنی ذات تک محدود (Self Centered) قسم کی شخصیت تھے۔ لیکن ہمارے گھر کے لیے دیگر امور کے علاوہ ایک مستقل ''بنک'' کی حیثیت بھی رکھتے تھے کیونکہ والد صاحب کی طرف سے والدہ صاحبہ کو ہدایت تھی کہ ''میری غیر موجودگی میں جب کبھی گھر کا خرچہ ختم ہو جائے تو اپنے بھائی خلیل سے ادھار لے لیا کرو، میں واپس آ کر چکا دوں گا''۔ (ماموں خلیل الرحمان اب ضعیف العمر ہیں اور اب تک اسی گھر میں قیام پذیر ہیں۔ اگر چہ ان کے گھر کا اندرونی و بیرونی نقشہ اب مکمل تبدیل ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت و سلامتی اور برکت والی زندگی عطا فرمائے) والد صاحب کی معاشی بے فکری کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے اس طرح کر دیا تھا کہ وراثت میں اتنی زرعی اراضی ان کے حصے میں آ گئی تھی کہ اس کی آمدنی سے خاندان کی مناسب گزر اوقات ہو سکے۔ زیادہ تر زمین ٹھیکے پر دے رکھی تھی جس کا حساب کتاب چچا جان محترم یا ان کے بیٹے رکھتے، اور کچھ زمین بٹائی پر دے رکھی تھی جس سے فصل میں سے اتنا حصہ آ جاتا کہ پورے سال کے اناج کا بندوبست ہو جاتا۔

والدہ صاحبہ بتایا کرتی تھیں کہ اس نو تعمیر شدہ گھر میں بعض مجبوریوں کی بنا پر دو سال دروازے کھڑکیوں کے بغیر رہے۔ صرف باہر والا دروازہ موجود تھا۔ گاؤں کا ماحول، اور اس کنارے پر غیر محفوظ گھر، لیکن بحمد اللہ کبھی کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا اور گاؤں کے اس غیر تعلیم یافتہ ماحول میں بچوں سمیت اللہ نے سب کی حفاظت فرمائی۔ پروردگار عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہماری انسانی کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود بغیر ہماری کسی خوبی کے، خاص اپنی رحمت سے ہمیں ضائع ہونے سے بچائے رکھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ فقط والد صاحب کے

اللہ تعالیٰ پر لامحدود توکل اوران کی دعاؤں ہی کا نتیجہ ہے۔ والدہ صاحبہ ہمیں اس ماحول کی آلودگیوں سے بچانے کا واحد موجود ذریعہ سمجھتے ہوئے گھر کے ساتھ واقع پرائمری سکول بھیج دیتیں لیکن والد صاحب سکول میں پڑھنے کے زیادہ حق میں نہیں تھے۔ البتہ چار زبانوں (عربی، فارسی، انگریزی اور اردو) کی تعلیم کو ضروری خیال کرتے تھے، تاکہ دین کی تبلیغ مؤثر طریقے سے کی جا سکے۔ دین کی تعلیم سے مراد والد صاحب قرآن پاک اور مشکوٰۃ شریف لیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے مشکوٰۃ شریف میں تمام ضروری مسائل زندگی بیان ہو گئے ہیں۔ قرآن پاک اور مشکوٰۃ شریف کو سوچ سمجھ کر تفصیلاً پڑھ لیا جائے اور اسی پر عمل کر لیا جائے اور اسی کو آگے پہنچانے میں ساری زندگی لگا دی جائے، یہی مکمل دین ہے۔ قرآن کی تعلیم میں مختلف تفاسیر اور علوم تفسیر کو، اور مشکوٰۃ شریف کی تعلیم میں اس کی شروح اور علوم الحدیث کو بھی شامل تصور کرتے۔ اس غرض سے ان کا جذبہ یہ تھا کہ وہ ہمیں خود تعلیم دیں۔ لہٰذا انھوں نے ہم سب بہن بھائیوں کو قرآن اور مشکوٰۃ المصابیح گھر میں پڑھانا شروع کر رکھا تھا۔ یہ سلسلہ تعلیم، جو والد صاحب کے تبلیغی اسفار کے باعث بار بار آغاز و انقطاع کے مراحل سے گزرتا رہتا، سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی حد تک جاری رہا۔

درحقیقت والد صاحب ہمیں مسجد سے متعلق شخصیات (یعنی مؤذن، امام، خطیب یا خادم وغیرہ) بنانا چاہتے تھے۔ لہٰذا جب کبھی زندگی کے کسی موڑ پر ہم نے والد صاحب سے زندگی کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے مشورہ مانگا تو بالعموم ایک فقرہ بولا کرتے تھے۔ ''میرا تاں جی کرداا ے اسیں سارے پیو پتر مسیتڑ بن جایئے'' (یعنی میرا تو دل چاہتا ہے کہ ہم تمام باپ بیٹے مسجد میں بیٹھنے والے بن جائیں)۔

اللہ کی رحمت سے حالات ایسے پیدا ہوئے کہ ہم تمام بھائی بغیر کسی خاص منصوبہ بندی کے دین کے طالب علم بھی بن گئے، مسجدوں سے مستقل تعلق بھی قائم ہو گیا، فللّٰہ الحمد ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہماری آئندہ تمام نسلوں کو دین اسلام کا سچا خادم بنائے، اسے والد صاحب کے تبلیغی مشن کی قبولیت اور ان کے توکل پر ربانی وفا اور نزولِ رحمتِ الٰہی کے علاوہ اور کیا نام

دیا جا سکتا ہے۔

الختصر والد صاحب نے ماحول اور حالات کی ستم سامانیوں کے باوجود اپنے جملہ امور اور اپنی تمام اولاد کو اللہ کی حفاظت میں دے کر توکل واطمینان کی دولت پائی۔ والد صاحب کے ساتھ میری زندگی کی آخری ملاقات میں، بتاریخ 23 فروری 1998ء سوموار کی صبح مجھے الوداع کہتے ہوئے ان کے آخری الفاظ ان کے اسی تیقّن کی عکاسی کرتے ہیں، جب انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور الوداعی مسنون دعائیں پڑھنے کے بعد ہاتھ پکڑے پکڑے تین دفعہ ''اللہ حافظ'' فرمایا اور چوتھی دفعہ فرمایا: ''فاللّٰہ خیر حافظا'' اس کے بعد 28 فروری 1998ء (یکم ذوالقعدہ 1418ھ) ہفتہ کی شام میں یونیورسٹی سے واپس ان کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ دنیا و مافیھا سے بے نیاز موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا تھے اور پھر رات 9 بجے کے قریب خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جنت الفردوس میں اکٹھا فرمائے، گویا اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ان کی کامیاب پالیسی'' توکل علی اللہ'' جاری وساری تھی اور میں اپنی زندگی کے ہر موڑ پر جب اپنے آپ کو اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اللہ کی حفاظت میں محفوظ پاتا ہوں تو والد صاحب کے آخری دعائیہ الفاظ سرمایۂ حیات کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

اسی ''پالیسی'' کی وجہ سے غالباً والد صاحب نے بیعت کے لیے اپنے کسی بیٹے کو حکم جاری کرنے کی بجائے یہ معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر دیا کہ جب اللہ ان کی حفاظت فرمائے گا تو سلسلۂ بیعت کی حفاظت کا انتظام بھی وہ اپنی رضا کے لیے خود ہی فرما دے گا۔ اس کی عملی صورت کئی برس بعد اس وقت نظر آئی جب والد صاحب کے بعض ارادت مندوں کے بار بار مجبور کرنے پر برادر اصغر پروفیسر محمد زید لکھوی نے بیعت لینا شروع کر دی۔ بعد ازاں اسی طرح برادر محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی کو بھی بعض عقیدت مندوں نے انتہائی مجبور کر کے ان کے ہاتھ پر ''بیعتِ ارشاد'' کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو اس کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آباواجداد کے لیے صدقہ جاریہ اور ان کی بلندیٔ درجات کا

باعث بنائے۔

جملہ دنیوی امور اور خاص طور پر مالی امور سے متعلق والد صاحب کی اس درجہ بے نیازی و بےفکری بچپن میں میرے لیے ناقابلِ فہم تھی، سنِ شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو یہی بات باعث تشویش ہوگئی کیوں کہ فکرِ معاش تو یہاں لازمۂ حیات ہے، والد گرامی اس سے اس قدر آزاد کیوں ہیں؟ اور اس پر مستزاد یہ کہ بےفکر و مطمئن بھی۔ لہٰذا ایک دفعہ میں نے والد صاحب سے پوچھ لیا کہ ابا جی! آپ بھی آخر گوشت پوست اور فکر وفہم رکھنے والے انسان ہیں، کیا آپ کو ساری زندگی روزی کمانے کی کوئی فکر نہیں ہوئی؟ اس پر والد صاحب نے بتایا کہ ابتدائے شباب میں خیال آتا تھا کہ روزی کا کوئی ذریعہ بنانا چاہیے۔ مختلف منصوبے بھی ذہن میں گردش کرتے تھے لیکن عملی صورت اختیار کیے بغیر ہی ختم ہو گئے۔ والد صاحب نے بتایا کہ میں جوانی سے ہی مختلف اذکار کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ انہی دنوں یہ حدیث میری نظر سے گزری کہ ”لاحول ولاقوۃ الا باللہ“ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ والد صاحب کہتے ہیں کہ میں نے سوچا جس کو جنت کا خزانہ مل جائے اسے اور کیا چاہیے؟ لہٰذا میں نے باقی اذکار میں کمی کردی اور ”لاحول ولا قوۃ الا باللہ“ کا ذکر بہت زیادہ کثرت سے شروع کردیا۔ صبح وشام لاتعداد حد تک اس ”خزانے“ کو بذریعہ ذکر اپنی زندگی میں شامل کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن خواب میں مجھے دکھایا گیا کہ میرا آدھا جسم سر سے لے کر پاؤں تک لمبائی کے رخ کاٹ کر مجھ سے علیحدہ کردیا گیا ہے، لیکن میرا وجود اس کے باوجود مکمل ہے۔ اور مجھے خواب میں ہی سمجھایا گیا کہ آپ کی زندگی میں دنیا کا جس قدر حصہ تھا وہ الگ کردیا گیا ہے۔ والد صاحب کہتے ہیں کہ یہ ایام جوانی کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد زندگی میں کبھی روٹی روزی کمانے کا خیال بھی نہیں آیا، عمل تو پہلے بھی اس کے بارے میں نہ تھا۔ گویا فکرِ معاش اور مادی خواہشات سے آزادی و بے نیازی بکثرت ذکرِ الٰہی کی بدولت نصیب ہوئی۔

1951ء میں والد صاحب ایم ایل اے (ممبر لیجسلیٹو اسمبلی) منتخب ہوئے۔ یہ الیکشن

والد صاحب نے ضلع قصور کی سیٹ (پتوکی، چونیاں، کنگن پور) پر سردار آصف احمد علی کے والد سردار احمد علی کے مقابلے میں آزاد حیثیت سے جیتا تھا۔ جماعت اسلامی نے والد صاحب کے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا بلکہ انھیں ہی اپنا امیدوار قرار دیا۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس الیکشن میں یہ واحد سیٹ تھی جو پورے پاکستان میں جماعت اسلامی کو ملی۔ گویا جماعت اسلامی کے پہلے پارلیمنٹرین والد گرامی قدر تھے۔ سیاست و اسمبلی کا یہ سلسلہ والد صاحب کے مزاج کے منافی تھا، اس لیے کئی دفعہ استعفا دینے کا ارادہ کیا مگر استعفا دیا نہیں۔ اسی اثنا میں ون یونٹ کا قیام عمل میں آ گیا اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ اس کی تفصیلات محترم محمد اسحاق بھٹی نے اس کتاب میں درج کر دی ہیں۔ بعد کے سالوں میں جب مولانا معین الدین لکھوی رحمہ اللہ الیکشن لڑا کرتے تھے (اور تین بار ایم این اے منتخب ہوئے) تو والد صاحب الیکشن مہم کے لیے اگر جاتے بھی تھے تو اس بے نیازی کے ساتھ کہ عین الیکشن مہم کے دوران بھی مختلف مقامات پر درسِ قرآن ہی دیتے، فکرِ آخرت لوگوں کو یاد دلاتے اور اپنے تبلیغی مشن کو جاری رکھتے۔ بالعموم ووٹوں کی بات ہی نہ کرتے۔ اگر کوئی ووٹوں کے بارے میں خود پوچھ لیتا تو کہہ دیتے، تمام امیدواروں کو دیکھ لیں جو آپ کو اچھا لگتا ہے اسے ووٹ دے دیں۔

والد صاحب کے اسمبلی کے استعفا اور بعد کے انتخابات میں بے نیازانہ رویے کے بارے میں ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا تو قبل از تقسیمِ ہند کے اپنے ایک خواب کے بارے میں بتایا جس کی عملی تعبیر کئی سال بعد انھوں نے اسمبلی میں پہنچ کر ملاحظہ کی۔ اس خواب کی تفصیلات بھی اس کتاب میں درج ہیں۔ لیکن میں چوں کہ اس خواب کا والد صاحب سے براہِ راست راوی ہوں لہٰذا اس کا مختصراً تذکرہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس لیے بھی کہ اس سے پاکستانی نظامِ سیاست کی نوعیت و مقصدیت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ والد صاحب نے بتایا کہ قبل از تقسیم ہند انھوں نے خواب دیکھا کہ متحدہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے علماء ایک جگہ جمع ہیں۔ صفیں بنائے ملکہ وکٹوریہ کا جنازہ پڑھنے کے لیے تیار کھڑے ہیں، صفیں

سیدھی کی بجائے یوں گولائی میں ہیں کہ دونوں کناروں سے آگے کی طرف نکلی ہوئی ہیں۔ والد صاحب بھی ان کے درمیان صف میں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں صف سے باہر نکل گیا اور زوردار آواز میں علماء کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایک کافرہ کا جنازہ پڑھنے کے لیے جمع ہوئے کھڑے ہیں۔ ابھی میں نے اتنا کہا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ بعدازاں کئی سال بعد جب والد صاحب 1951ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن بنے تو حلف برداری کے دوران ہی ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی جس نے والد صاحب کو کئی برس پیشتر کا دیکھا ہوا یہ خواب یاد دلا دیا۔ والد صاحب نے بتایا کہ حلف کا طریقہ کار یہ تھا کہ ہر ممبر سپیکر اسمبلی کے سامنے حلف کی عبارت دہراتا تھا۔ پھر سیکرٹری اسمبلی کے پاس رکھے رجسٹر میں دستخط کرتا اور سپیکر سے مصافحہ کرنے کے بعد سامنے والے دروازے سے باہر نکل جاتا۔ پھر پچھلے دروازے سے واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ جاتا۔ تمام ممبر حلف کی جو عبارت باری باری پڑھ رہے تھے، وہ اپنی باری پر مجھے بھی پڑھنا تھی، اس میں کچھ اس طرح کے الفاظ تھے ''میں آئین کا پابند رہوں گا۔۔۔۔ تمام آئینی حدود کی پابندی کروں گا'' وغیرہ۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ کس آئین کی پابندی کا حلف ہم سے لیا جا رہا ہے؟ جب کہ پاکستان کا آئین ابھی بنا ہی نہ تھا، اور یہ کہ پورے حلف میں قرآن و سنت کا کوئی ذکر ہی موجود نہ تھا۔ تمام ممبران حلف اٹھا چکے تو سیکرٹری اسمبلی نے اعلان کیا کہ ہال میں موجود کسی رکن نے اگر حلف نہ اٹھایا ہو تو وہ بھی آجائے۔ اس پر والد صاحب کہتے ہیں میں کھڑا ہو گیا اور زوردار آواز میں سپیکر سے مخاطب ہو کر سوال کیا کہ ''جناب سپیکر! اگر یہ وفاداری کسی مقام پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی وفاداری سے ٹکرا گئی تو پھر کیا صورت ہوگی؟'' سپیکر سے استفسار کے یہ وہ الفاظ ہیں جو میری یادداشت کے مطابق والد صاحب نے مجھے بتائے، لیکن پنجاب اسمبلی کی کارروائی کے ریکارڈ 7۔مئی 1951ء کی تاریخ میں صفحہ نمبر 11 پر جو الفاظ درج ہیں وہ یہ ہیں ''حلف اٹھانے سے قبل میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی مقام پر یہ حلف وفاداری اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف ہو تو پھر کیا صورت ہوگی؟'' بہر حال

والد صاحب فرماتے ہیں کہ میرے سوال پر پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ایک طرف سے ایک ممبر مولانا عبدالستار خاں نیازی اٹھے اور کہا "ایسی صورت میں ہم حلف کی وفاداری کو چھوڑ دیں گے۔" پھر ایک رکن جو جھنگ سے تعلق رکھتے تھے ان کا نام مولانا محمد ذاکر تھا اور وہ ضعیف العمر تھے، آہستہ آہستہ اٹھے اور اپنی نحیف سی آواز میں بولے "میں بھی مولانا کی تائید کرتا ہوں۔" والد صاحب فرماتے ہیں میں نے "جزاکم اللہ" کہا، دستخط کیے، سپیکر سے مصافحہ کیا اور حسبِ ضابطہ اسمبلی کے سامنے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی سامنے جس چیز پر نگاہ پڑی وہ ملکہ وکٹوریا کا بت تھا، جو چوک میں بنے چبوترے پر نصب تھا جس کو بعدازاں اکھاڑ دیا گیا۔ وہ چبوترہ ابھی بھی موجود ہے، آج کل اس پر ایک قرآن پاک رکھا ہوا ہے۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ ملکہ وکٹوریا کا بت دیکھتے ہی مجھے اپنا خواب یاد آگیا۔ پاکستان طویل عرصے تک انگریز کے بنائے ہوئے آئین اور قانون کے مطابق چلتا رہا۔ ملکہ وکٹوریہ کا جنازہ ایک استعارہ ہے پاکستانی نظام سیاست وحکومت کی نوعیت ومقصدیت کا۔ خواب میں صفوں کے گولائی میں ہونے کی حکمت بھی سمجھ میں آگئی کہ اسمبلی کی سیٹیں بالکل اسی طرح گولائی میں ہوتی ہیں۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ اسی دن میرا دل اسمبلی سے بیزار ہوگیا اور میں نے تہیہ کرلیا کہ اسمبلی کی رکنیت سے استعفا دے دوں گا۔ بعدازاں محض چند اجلاسوں میں شرکت کی اور اسمبلی جانا ترک کردیا۔ یہ خواب اور اس کی حقانیت کا اپنی نظروں سے مشاہدہ کرنا والد صاحب کی پاکستانی سیاست سے بیزاری کا سبب بنا۔

حلم وبردباری، سادگی، للہیت، خشیت الٰہی اور دنیا ومافیھا کے مادی علائق سے بے نیازی والد صاحب کی شخصیت کے بنیادی اوصاف تھے۔ بالعموم ان کی زبان پر اللہ کا ذکر جاری رہتا۔ گھر میں سوئے بھی ہوتے تو وقفے وقفے سے اللہ اکبر، استغفراللہ وغیرہ کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ دادی جان محترمہ بتایا کرتی تھیں کہ "محی الدین کو جوانی سے ہی بہت زیادہ ذکرِ الٰہی کی عادت ہے۔ اور بعض اوقات روزہ رکھ کر، لوٹا اور مصلیٰ پکڑ کر اکیلا

جنگلوں میں نکل جاتا اور کسی جگہ اکیلا بیٹھ کر اللہ سے مناجات کرتا، اور افطاری سے پہلے گھر واپس آجاتا۔"

والد صاحب ہمیشہ سفید لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔ فرماتے: یہ لباس اللہ کو پسند ہے۔ ان کا معمول تھا کہ کپڑے کی سلی ہوئی گول ٹوپی سر پر لیتے جو سر کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی تھی۔ فرمایا کرتے کہ سر سے اوپر اٹھا ہوا عمامہ یا کسی بھی قسم کی ٹوپی (جناح کیپ وغیرہ) جو سر سے اوپر اونچائی میں ہو، خلاف شرع نہیں تو خلافِ سنت ضرور ہے، کیوں کہ نبی پاک ﷺ کا عمامہ یا ٹوپی سر کے ساتھ چپکی ہوتی تھی۔

والد صاحب کی خوراک بہت ہی کم تھی۔ فرمایا کرتے تھے زندہ رہنے کے لیے کھانا چاہیے، کھانے کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہیے اور یہ حدیث سنایا کرتے تھے کہ مومن ایک آنت سے کھاتا ہے جب کہ کافر و منافق ساتوں آنتیں بھر کے کھاتے ہیں۔

غرور اور کبر و ریاء ایسی چیزیں والد صاحب کی شخصیت کے پاس سے بھی نہیں گزریں۔ یہ ان پر اللہ کا خاص کرم تھا۔ فرمایا کرتے تھے دوسروں کے فائدے کے ایسے جائز کام، جن کے کرنے سے طبیعت انکار کرتی ہے، وقتاً فوقتاً ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے اور انسان عجب وغرور کی بیماری سے بھی بچا رہتا ہے۔ مثلاً گلی کی نالی ہفتے میں ایک آدھ دفعہ خود صاف کر دینا، کبھی گلی میں جھاڑو لگا دینا، مسجد میں جھاڑو لگا دینا یا وضو خانہ وغیرہ کی صفائی خود اپنے ہاتھوں سے کرنا وغیرہ۔ والد صاحب خود بھی یہ اور اس طرح کے دوسرے کام اپنے ہاتھوں سے بالعموم کیا کرتے تھے اور ہمیں بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایسی درویشی، سادگی اور بے نیازی پیدا کر دی تھی جو بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وعظ و دروس کی کثرت وعادت کے باوجود عام مجلسوں میں بہت کم بولتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ زبان اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر کرنے کے لیے دی ہے، فضول باتیں کرنے کے لیے نہیں دی۔ حدیث سنایا کرتے تھے کہ یا تو اچھی بات کہو یا چپ رہو، یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ فرمایا کرتے کہ بولنے کی ضرورت ہو تو بولنا چاہیے وگرنہ خاموش ہی رہنا

چاہیے۔ دوسروں کے بارے میں بات کبھی نہ کرتے، ہمیں بھی یہی تلقین فرماتے کہ کسی کی بات چاہے سچی ہو، چاہے جھوٹی، بلا ضرورت کرنے سے گناہ ہوگا۔ کیوں کہ سچی بات اگر کسی کی غیر موجودگی میں کی تو وہ غیبت ہوگی اور اس کے منہ پر کی تو طعنہ۔ جھوٹ تو ہے ہی جھوٹ۔ لہٰذا اللہ کے ذکر کے علاوہ بولنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ مولانا نور محمد سوتری رحمہ اللہ کا یہ شعر اکثر گنگناتے اور اپنے دروس میں بھی سناتے۔

سرور عالم ﷺ چپاں وٹیاں حاجت باجھ نہ بولے
تھوڑے لفظ تے معنے بہتے دانشمنداں تولے

قارئین کرام! جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا، والد صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت واقعتاً ایسی نابغۂ روزگار تھی کہ تمام تفصیلات کے باوجود ان کی شخصیت کا پورا تاثر قائم کرنا اس شخص کے لیے شاید ممکن نہیں جس نے ان کو دیکھا نہیں۔ تاہم اس کتاب میں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے، اس سے تقریباً ہر بات واضح ہوجاتی ہے اور والد صاحب کی شخصیت کے سب مبنی برصالحیت پہلو نکھر کر قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مصنفِ کتاب جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کو تاریخ نویسی اور خاکہ نگاری کا وہ خاص ملکہ عطا فرمایا ہے جو صدیوں اور دہائیوں میں بھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ویسے تو وہ عالمِ دین ہیں اور علومِ شرعیہ کے جملہ پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں لیکن انھوں نے تحریر و تصنیف کے لیے زیادہ تر علماء کی تاریخ و حالات کو موضوع بنایا ہے۔ اس میدان میں ان کی تین درجن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کی قبولیتِ عامہ اللہ کے فضل سے اس قدر ہے کہ مسلسل اشاعت کے باوجود مکمل سیٹ شاذونادر ہی دست یاب ہوتا ہے۔ مصنف محترم کے قلم سے مختلف رسائل و جرائد اور انسائیکلوپیڈیا وغیرہ میں شائع شدہ مضامین و مقالات کی ایک کثیر تعداد اس کے علاوہ ہے۔ ان کے اندازِ تاریخ نویسی اور اسلوبِ خاکہ نگاری کے موضوع پر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور شعبہ اسلامیات میں ایم فل کی سطح کے تحقیقی مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ پاکستان، کویت اور دیگر ممالک کے علماء کی طرف

سے محترم اسحاق بھٹی صاحب کو ''مؤرخِ اہل حدیث'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں وہ ''مؤرخِ اسلام'' ہیں کیونکہ انھوں نے صرف علمائے اہل حدیث کی تاریخ کو ہی اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ برصغیر کے مختلف مکاتبِ فقہی کے ان ہزاروں علماء کے حالات کا احاطہ کیا ہے جو گزشتہ بارہ تیرہ صدیوں میں پیدا ہوئے، اس کے لیے ان کی کتاب "فقہائے ہند" کا ذکر کافی ہوگا جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں جن علمائے کرام کے ساتھ محترم بھٹی صاحب کا تعلق رہا، یا ان کا کوئی تاریخی واقعہ یا شخصی خاکہ ان کی یادداشت میں محفوظ رہا اس کا انھوں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں ذکر کر دیا ہے۔

بھٹی صاحب کی یادداشت اور حافظہ بھی ماشاء اللہ غیر معمولی ہے، محض اپنی ذاتی زندگی کے واقعات ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگی کے حالات و واقعات بھی دنوں اور تاریخوں کی تعیین کے ساتھ ان کو اب تک یاد ہیں جب کہ ان کی عمر میرے خیال میں نوّے برس کے قریب ہے۔ یعنی اس بڑھاپے میں بھی ماشاء اللہ ان کا حافظہ ''جوان'' اور قلم توانا ہے۔ اس کتاب میں والد صاحب کے تذکرے کے ساتھ ساتھ لکھوی خاندان کی تاریخ بھی اس طرح مرتّب کر دی ہے کہ بہت سے واقعات ہمارے باقی ماندہ خاندانی بزرگوں کی یادداشت سے بھی محو ہو چکے ہیں۔ سادہ و عام فہم اسلوب اور زبان کی سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ بھٹی صاحب کے سنجیدہ عالمانہ تجزیوں سے کتاب کی اہمیت و افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

محترم اسحاق بھٹی صاحب کا ہمارے خاندان اور خصوصاً والد صاحب کے ساتھ تعلق کئی پہلوؤں پر محیط ہے۔ عقیدت، دوستی، تعلّم (شاگردی) اور دیگر کئی معاشرتی، دینی اور جماعتی جہات نے اس تعلّق کو ایک بیش قیمت اور لازوال رشتے کی صورت دے دی ہے۔ مرکز الاسلام (نزد لکھو کے، ضلع فیروز پور) میں اپنے قیام کے دوران بھٹی صاحب، والد صاحب کے ہم سبق اور ہم جماعت بھی رہے، شاگرد بھی رہے، دوستی کا تعلق بھی بنا اور روحانی عقیدت کا رشتہ بھی قائم ہوا۔ بھٹی صاحب کی زیادہ دوستی ہم عمری کی بنا پر چچا جان محترم مولانا معین الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔ یہ ساری تفصیلات کافی حد تک جناب بھٹی صاحب

نے اس کتاب میں اور دیگر کتب میں بیان کر دی ہیں۔ اکثر و بیشتر بھٹی صاحب اس تاریخی خاندانی تعلق کو دینی و روحانی عقیدت سے ہی تعبیر کرتے ہیں۔ اسی خاندانی وابستگی کی بنیاد پر وہ ہم سب بھائیوں کے ساتھ، جو سب ان کے بچوں کے مرتبے پر ہیں، ہمیشہ انتہائی محبت اور شفقت کا رویہ رکھتے ہیں۔ لیکن لفظی اعتبار سے اسے ''پیری مریدی'' کا تعلق ہی گردانتے ہیں۔ اکثر مجھے فرمایا کرتے ہیں'' ہم دونوں پیر ہیں، میں عمر کے اعتبار سے پیر (یعنی بوڑھا) ہوں اور تم خاندانی اعتبار سے پیر (یعنی روحانی پیشوا) ہو''۔ ایسا وہ میری کسی خوبی کی بنا پر نہیں فرماتے بلکہ اس کی وجہ ان کی میرے والد صاحب اور دیگر خاندانی بزرگوں سے روحانی و دینی وابستگی اور عقیدت مندانہ مراسم کی پون صدی پر مشتمل تاریخ ہے۔ گویا محترم اسحاق بھٹی صاحب ہماری خاندانی تاریخ کے محض عینی شاہد ہی نہیں بلکہ وہ روحانی کیفیات، قلبی احساسات، اخلاقی روایات اور معاشرتی تعلقات کے امین بھی ہیں۔ اس کتاب میں محترم بھٹی صاحب کے ایک ایک لفظ سے یہ حقیقت عیاں ہے جس کو ہر وہ شخص واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے جو ان کیفیتوں کا شناسا اور ان لذتوں سے آشنا ہو۔ اللہ تعالیٰ محترم بھٹی صاحب کو صحت وسلامتی اور برکت والی زندگی عطا فرمائے، ہمارے مرحوم بزرگوں کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب کو جنت الفردوس میں اکٹھا فرمائے۔ آمین

محمد حماد لکھوی

23۔ اگست 2014ء بمطابق 26۔ شوال 1435ھ



ابتدائیہ

(پنجاب کا لکھوی خاندان ۔ 1720ء سے 2014ء تک)

مولانا محمد اسحاق بھٹی کا تحریر کردہ زیرِ نظر مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے شمارہ 17 جلد 66 (24 جمادی الثانی 1435ھ / 25 اپریل 2014ء) میں شائع ہوا تھا جس میں خاندان لکھویہ کی تین صد سالہ تاریخ کا خلاصہ اختصار و جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ والد گرامی مولانا محی الدین لکھوی کے تذکرے پر مشتمل اس کتاب میں چوں کہ لکھوی خاندان کی تاریخ کو بھی بیان کیا گیا ہے، لہٰذا موضوع کی مناسبت اور مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اس کو ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

(محمد حماد لکھوی)

پنجاب کے اہل حدیث علمی خاندانوں میں لکھوی خاندان سب سے قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے اکابر کا تعلق ضلع قصور کی ایک بستی ''ڈھنگ شاہ'' سے تھا۔ پھر حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ ان لوگوں نے وہاں کی سکونت ترک کر دی اور ان کے ایک بزرگ جن کا نام حافظ احمد تھا، وہ آج سے کم و بیش تین سو سال پیشتر تقریباً 1720ء میں ضلع فیروز پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''لکھوکے'' میں جا بسے۔ حافظ احمد نے اس وقت کے حالات کے مطابق وہاں ایک دینی مدرسہ قائم کیا اور بچوں کو تعلیم دینا شروع کی۔ علم کی یہ اوّلین کہکشاں تھی جو اس گاؤں کی فضا پر نمودار ہوئی۔

1743ء کے آگے پیچھے حافظ احمد کے گھر بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام بارک اللہ رکھا گیا۔ بارک اللہ نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد مکرم سے حاصل کی۔ قرآن مجید بھی انھی سے حفظ کیا۔ اس وقت دہلی میں شیخ غلام علی شاہ صاحب کا سلسلہ فیض جاری تھا، حافظ بارک اللہ لکھوی دہلی کو روانہ ہوئے اور شاہ صاحب ممدوح کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اخذِ فیض کیا۔ دہلی کو اس وقت طلباء کے مرجع اور علماء کے ماویٰ کی حیثیت حاصل تھی۔ حافظ

بارک اللہ لکھوی کے طبعی میلان کی روشنی میں حالات بتاتے اور قرآن شہادت دیتے ہیں کہ وہ شاہ غلام علی کے علاوہ وہاں کے بعض دیگر علماء سے بھی مستفید ہوئے۔ پھر واپس اپنے وطن لکھو کے آئے اور طلبائے علم کو باقاعدہ تعلیم دینے لگے۔ وہ پیکر حسنات اور مجسمہ صالحیت عالم تھے۔ ان کی تمام زندگی درس و تدریس میں گزری۔ تصنیفی خدمات بھی سر انجام دیں۔ ایک سودس (110) سال کے قریب عمر پائی اور 1850ء کے لگ بھگ سفر آخرت اختیار کیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ''لکھوی'' کی نسبت سے شہرت پائی اور یہ نسبت اب تک اس خاندان کے اہل علم کے ساتھ وابستہ چلی آرہی ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کا لازمہ اسماء اور ذریعہ تعارف بن گئی ہے۔ لکھوی کا لفظ سنتے ہی ذہن میں ایک خاص علمی خانوادے کا نقش اُبھرتا ہے۔

حافظ بارک اللہ لکھوی کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی تھے، جنھوں نے بہ زبانِ فارسی قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور سات جلدوں پر مشتمل ''تفسیر محمدی'' کے نام سے پنجابی نظم میں قرآن کی تفسیر لکھی۔ 1871ء میں عربی زبان میں سنن ابی داود کے اور 1872ء میں مشکاۃ المصابیح کے حواشی لکھے جو اسی سال شائع ہو گئے۔ اُنھوں نے عربی، فارسی، پنجابی تینوں زبانوں میں تصنیفی خدمات انجام دیں اور یہی زبانیں اس دور کے پنجاب کے علمی حلقوں میں مروّج تھیں۔ اس عالم جلیل نے 27۔ اگست 1893ء کو وفات پائی۔

حافظ محمد لکھوی کی نرینہ اولاد میں سے ایک بیٹے مولانا محی الدین عبدالرحمان لکھوی تھے۔ پارسائی اور علم و حلم کا خوب صورت ترین مجسمہ۔ ان کی وفات 10۔ مئی 1895ء کو مسجد نبوی میں بہ حالتِ سجدہ ہوئی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ اس فقیر کے پردادا حکیم دوست محمد کے چھوٹے بھائی میاں امام الدین ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔

مولانا محی الدین عبدالرحمان لکھوی کے گرامی قدر فرزند حضرت مولانا محمد علی لکھوی تھے جو 1890ء میں بہ مقام ''لکھو کے'' پیدا ہوئے اور 19۔ دسمبر 1973ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ تقریباً 45 سال مسجد نبوی میں قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں

ان سے حجاز، نجد، یمن، مصر، مراکش، شام، فلسطین، الجزائر، انڈونیشیا اور افریقہ وغیرہ ملکوں کے ہزاروں طلباء نے تحصیلِ علم کی۔ پھر یہ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں اس علم کو پھیلانے کے لیے کوشاں ہوئے۔ برصغیر کے بے شمار علماء نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قرآن و حدیث کی تدریس فرمائی، لیکن اس فقیر کے محدود علم میں نہیں کہ ان حضرات میں سے کسی عالم نے اتنا طویل عرصہ مسجد نبوی میں قرآن و حدیث کی تدریس کا فریضہ انجام دیا ہو جتنا عرصہ مولانا محمد علی لکھوی نے دیا۔

مولانا محمد علی لکھوی کے فرزند تھے: مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین لکھوی۔ ان کو ملنے اور دیکھنے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

لکھوی خاندان کی ایک قابل تحسین زریں کڑی حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ حافظ بارک اللہ لکھوی کے پوتے اور حافظ محمد لکھوی کے بھتیجے تھے۔ 1834ء میں لکھوکے میں ان کی ولادت ہوئی اور 1924ء میں انھوں نے وفات پائی۔ وہ مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین لکھوی کے نانا تھے۔ جلیل القدر عالم اور رفیع المنزلت معلّم۔ تمام زندگی اپنے خاندانی مدرسے (لکھوکے) میں مصروفِ تدریس رہے۔ اس کے علاوہ انھیں کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مولانا عبدالقادر لکھوی مرحوم و مغفور کی نرینہ اولاد میں سے ایک بیٹے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی تھے۔ سادہ مزاج اور ممتاز ترین مدرّس۔ انھیں استاذِ پنجاب کہا جاتا تھا اور وہ واقعی استاذِ پنجاب تھے۔ مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین کے ماموں۔ 1882ء میں ان کی ولادت لکھوکے میں ہوئی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے خاندانی مدرسے میں مشغولِ تدریس ہوئے اور حیاتِ مستعار کے آخری دم تک یہی خدمت ان کا مرکز توجہ رہی۔ سیکڑوں اصحابِ علم نے ان سے تحصیلِ علم کی۔ دیگر علومِ متداولہ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو میں وہ درجہ امامت پر فائز تھے۔ ان کے بیٹوں کا ذہن بھی ان علوم کے سلسلے میں بڑا زرخیز تھا۔ موجودہ حضرات میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ 26۔ فروری 1952ء کو مولانا

مرحوم کا انتقال ان کے مرکزِ تدریس جامعہ محمدیہ اوکاڑا میں ہوا اور چک نمبر 18 (نزد رینالہ خورد) میں انھیں دفن کیا گیا، جہاں تقسیم ملک کے بعد سے لے کر اب تک بے شمار لکھوی آسودہ لحد ہوئے۔

حافظ احمد سے لے کر لمحہ موجود تک کا عرصہ تین سو سال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس عرصے میں لکھوی خاندان کے علمائے عالی مرتبت جن خدماتِ دینی میں مشغول رہے، وہ یہ ہیں:

1: تصنیف و تالیف
2: درس و تدریس
3: وعظ وارشاد
4: لوگوں کی روحانی تربیت

ان خدماتِ چہار گونہ میں اُنھوں نے بڑی شہرت پائی۔ خاص طور پر پنجاب کے زیادہ تر علمائے اہل حدیث یا تو براہِ راست لکھوی علماء کے شاگرد ہیں یا ان کے شاگردوں کے شاگرد۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

✿......علمائے غزنویہ میں سے حضرت مولانا احمد علی غزنوی، مولانا محمد یحییٰ غزنوی، مولانا حافظ عبداللہ بن عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالرحیم غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی اور مولانا عبدالاول غزنوی نے لکھو کے جا کر مولانا عبدالقادر لکھوی اور مولانا محی الدین عبدالرحمان لکھوی سے استفادہ کیا۔ اس اعتبار سے جن حضرات نے ان غزنوی علماء سے تحصیل علم کی، وہ مولانا عبدالقادر لکھوی اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے بالواسطہ شاگرد ٹھہرے۔ ان شاگردانِ گرامی علماء میں حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی، حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا سید محمد داود غزنوی اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ اسی تعلقِ تلمذ کی بنا پر مولانا داود غزنوی چھوٹے بڑے تمام لکھوی علماء کا بے حد احترام کرتے تھے۔ لکھویوں کے متعلق مولانا داود غزنوی کی اولاد میں بھی یہ جذبہ احترام پایا جاتا تھا۔ اپریل 1976ء میں سید ابوبکر غزنوی ایک حادثے میں لندن میں فوت ہوئے تھے۔ ان کی میت لاہور آئی تو کسی نے کہا جنازہ کون صاحب پڑھائیں گے؟ مولانا داود غزنوی کے بڑے بیٹے مولوی عمر فاروق

غزنوی نے جواب دیا: ہمارے بزرگوں کے لکھوی خاندان کے بزرگوں سے استادی شاگردی کے تعلقات تھے، اس لیے جنازہ مولانا معین الدین لکھوی پڑھائیں گے، چنانچہ انھیں اوکاڑا اطلاع دی گئی، وہ لاہور آئے اور اُنھوں نے جنازہ پڑھایا۔

❁......مولانا عبدالوہاب دہلوی بانی جماعت غربائے اہل حدیث کا آبائی تعلق پنجاب کے ضلع جھنگ کے ایک گاؤں ''واسو آستانہ'' سے تھا۔ اُنھوں نے صرف ونحو اور بعض دیگر علوم مروّجہ کی کتابیں لکھو کے جا کر لکھوی علماء سے پڑھیں۔ قرآن مجید بھی وہیں حفظ کیا، اس صورتِ حال کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ جن علماء وطلباء نے مولانا عبدالوہاب دہلوی سے حصول فیض کیا، ان کا سلسلہ تعلم لکھوی علماء تک پہنچا۔

❁......سوہدرہ (ضلع گوجرانوالا) کا علوی خاندان علمائے دین کا مشہور خاندان ہے۔ اس خاندان کے معروف عالم مولانا غلام نبی ربانی تھے، اُنھوں نے کتبِ حدیث حافظ محمد لکھوی سے پڑھیں اور سند لی۔ مولانا غلام نبی ربانی سے جن حضرات نے تحصیل علم کی، ان کا سلسلہ تلمذ حافظ محمد لکھوی تک پہنچا۔

❁......حضرت حافظ عبداللہ روپڑی طالب علمی کے ابتدائی دور میں اپنے برادرِ مکرم رکن الدین کے ساتھ لکھو کے گئے اور مولانا عبدالقادر لکھوی سے بعض فنون کی کتابیں پڑھیں، لہٰذا حافظ صاحب روپڑی کے شاگردوں کا تعلق تعلیم بھی اُس دور کے لکھوی علماء سے قائم ہوا۔

❁......مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی طلبِ علم کے لیے اپنے وطن راجستھان سے لکھو کے پہنچے اور لکھوی علماء سے فیض یاب ہوئے، اس بنا پر ان کے تلامذہ کرام کا شمار بھی ان کی وساطت سے لکھوی علماء کے فیض یافتوں میں ہوا۔

❁......ماضی قریب کے بے شمار حضرات براہِ راست لکھوی علماء کی بارگاہِ فضیلت میں دوزانو ہو کر بیٹھے اور ان سے اکتسابِ علم کیا جن میں سید مولا بخش کوموی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف

بھوجیانی ، مولانا عبدالرحیم شہید بھوجیانی ، حافظ محمد بھٹوی ، مولانا محمد یوسف راجووالوی ، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی ، مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی ، مولانا حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی ، مولانا حافظ عبدالرشید گوہڑوی ، مولانا حافظ عبدالغفور جہلمی اور دیگر بہت سے حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ان بزرگانِ کرام سے موجودہ دور کے لاتعداد اہلِ علم کو استفادے کے مواقع میسر آئے۔ اس لحاظ سے وہ لکھوی علماء کے دائرہ شاگردی میں گردانے گئے۔ یہ سب حضرات ہمارے لیے بے حد قابل احترام ہیں۔ اس فقیر کو اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی کہ یہ ان سب اساتذہ کرام کے حالات اپنی مختلف کتابوں میں لکھ چکا ہے۔

اب آیئے موجودہ دور کے لکھوی اہل علم کی طرف!

1947ء میں لکھوی خاندان کے لوگ اوکاڑا اور اُس کے قرب وجوار میں آباد ہوئے اور ان کا دارالعلوم جس کا نام ''جامعہ محمدیہ'' ہے، اوکاڑا میں منتقل ہوا۔لکھو کے میں اس کے ناظم مولانا محی الدین لکھوی تھے، یہاں اس کی زمامِ نظامت مولانا معین الدین لکھوی کے سپرد ہوئی۔ 1947ء سے لے کر اب تک جامعہ محمدیہ اوکاڑا کا تدریسی نظام بہترین انداز میں چل رہا ہے، جب کہ اس کی دو شاخیں جامعہ محمدیہ نور شاہ ضلع ساہی وال اور مدرسہ مرکز الاسلام (الٰہ آباد،قلعہ تارا سنگھ) تحصیل دیپال پور میں بطریقِ احسن خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

66 سال کی اس طویل مدت میں پاکستان کے متعدد جید علمائے کرام جامعہ محمدیہ کی مسندِ تدریس پر متمکن ہوئے۔ان مدرسین کی طویل فہرست میں استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی، حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا عبدالحلیم، مولانا عبداللہ امجد، مولانا ہدایت اللہ ندوی، حافظ شفیق الرحمان لکھوی بن مولانا عطاء اللہ لکھوی شامل ہیں۔

اس وقت جامعہ محمدیہ کے منصب شیخ الحدیث پر مولانا حافظ عبدالغفار اعوان متمکن ہیں۔ طالب علم کی حیثیت سے بھی وہ جامعہ میں رہے اور اُنھوں نے حافظ محمد بن مولانا محی الدین

لکھوی مرحوم اور مولانا منیر الدین لکھوی سمیت بعض دیگر اساتذہ سے تحصیلِ علم کی۔

جامعہ محمدیہ کے فارغ التحصیل قدیم علماء وطلباء کے علاوہ قیامِ پاکستان کے بعد جو حضرات جامعہ محمدیہ (اوکاڑا) میں حصولِ علم کرتے رہے، ان میں مولانا محمد اکبر سلیم مرحوم بانی مرکز ابن الخطاب (الٰہ آباد، ضلع قصور) مولانا عبداللہ امجد شیخ الحدیث مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ، مولانا عبدالعزیز علوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد، قاری خالد مجاہد، مولانا عبدالسلام بھٹوی، حافظ عبدالوحید سوہدروی (امریکا)، مولانا عبدالکریم ثاقب (برطانیہ)، مولانا میاں محمود عباس، مولانا احمد علی سیف، مولانا محمد یوسف قصوری، مولانا محمد ابراہیم خلیل، پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفور راشد اور دیگر علماء و اساتذہ شامل ہیں۔

اب لکھوی خاندان کی موجودہ نسل کے بارے میں چند اشارے۔

پینتیسویں پشت میں ان کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، اس حساب سے یہ علوی ہوئے۔ ہم نے گزشتہ سطور میں اشاراتی اسلوب میں ان سے متعلق گفتگو کا سلسلہ حافظ احمد سے شروع کیا ہے جو موضع لکھو کے میں سکونت پذیر ہونے والے اس خانوادے کے اوّلین فرد تھے۔ ان سے لے کر اب تک ان کی ساتویں آٹھویں نسل کی تدریسی اور علمی سرگرمیاں ہمارے سامنے ہیں جنھیں وہ بلا انقطاع احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔

نہایت اختصار کے ساتھ اس کی موجودہ صورتِ حال ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

پہلے مولانا محی الدین لکھوی کے صاحب زادوں کے متعلق بات کرتے ہیں۔ ان کے سات بیٹے ہیں۔ سب سے بڑے حافظ محمد تھے، حافظ محمد نے جامعہ محمدیہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر یہیں انھیں مدرس مقرر کر دیا گیا۔ جامعہ کے وہ نائب شیخ الحدیث تھے۔ جون 1937ء میں ان کی ولادت ہوئی اور 16۔فروری 1995ء کو انتقال کیا۔ صرف ساڑھے ستاون سال عمر پائی۔

اب ذیل میں باقی چھے حضرات کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیں:

1: حافظ احمد لکھوی: اُنھوں نے درسِ نظامی کی تکمیل جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) سے کی۔ عصری تعلیم بی اے تک حاصل کی۔ دیپال پور کے ہائی سکول میں عربی کے استاذ ہیں۔ صالح فطرت اور نیک اطوار عالم۔

2: محمد حامد لکھوی: پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کیا۔ جامعہ ابوبکر اسلامیہ (کراچی) میں بھی تعلیم پائی۔ وفاق المدارس السّلفیہ سے الشہادۃ العالمیہ حاصل کی۔ عربی زبان سے خاص طور پر لگاؤ ہے۔ ہائر سیکنڈری سکول منڈی احمد آباد (ضلع اوکاڑہ) میں عربی زبان وادب کے سینئر استاد ہیں۔

3: ڈاکٹر محمد حمود لکھوی: ان کی تعلیم ہے، ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی۔ پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ موضوع تھا ''حافظ محمد بن بارک اللہ لکھوی کا تفسیری منہج''۔ دینیات کی تعلیم بھی مکمل کی۔ گورنمنٹ ڈگری کالج رینالہ خورد میں پرنسپل ہیں۔ جامعہ محمدیہ کے ناظم ہیں۔ مختلف مقامات پر خطبہ جمعہ بھی دیتے ہیں اور اپنے خاندانی عقیدت مندوں کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں۔

4: ڈاکٹر محمد حماد لکھوی: تعلیم ایم اے اسلامیات (گولڈ میڈلسٹ)۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور ایل ایل بی کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ''حریتِ فرد کا اسلامی تصور'' کے موضوع پر پی، ایچ، ڈی کی۔ اور پوسٹ ڈاکٹریٹ (یونیورسٹی آف گلاسکو، یوکے) سے۔ جامعہ محمدیہ کے شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم مرحوم سے سندِ حدیث لی۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ علوم اسلامیہ کے ایک تحقیقی مجلّہ ''القلم'' کے مدیر ہیں۔ اور پنجاب قرآن بورڈ کے ممبر بھی ۔۔۔ مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے تحقیقی مقالے پیش کرتے رہتے ہیں۔ ملکی اور عالمی سطح پر دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کے علاوہ مختلف ٹیلی ویژن چینلوں پر تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے بھی نظر آتے

ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ معروف مبلغ اسلام ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بھی ان کو اپنے تبلیغی ٹی وی چینل ''پیس ٹی وی'' کے لیے دبئی آنے کی دعوت دی اور انھوں نے وہاں ایک سو سے زیادہ پروگرام ریکارڈ کرائے۔ جامع مسجد مبارک، لاہور میں اہل حدیث کی 95 برس پرانی مسجد ہے جو 1920ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس مسجد میں گزشتہ کئی سال سے ڈاکٹر محمد حماد لکھوی خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اسی مسجد میں پروفیسر عبدالقیوم مرحوم کے فرزند گرامی میجر زبیر قیوم نے اپنے خرچ سے ایک تحقیقی تصنیفی ادارہ دارالمعارف کے نام سے قائم کیا ہے، جس میں متعدد اہلِ علم خدمات سرانجام دینے پر مامور ہیں۔ آج کل نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ سے متعلق کام ہو رہا ہے، ڈاکٹر محمد حماد لکھوی اس ادارے کے تحریری کام کے نگران ہیں۔

5: محمد حُمید لکھوی: تعلیم ایم، اے اسلامیات اور ایم اے اُردو۔ گورنمنٹ ہائی سکول دیپال پور میں سینئر استاد ہیں۔ اپنے موجودہ گاؤں الہ آباد (قلعہ تارا سنگھ ضلع اوکاڑا) میں اپنے والدگرامی مولانا محی الدین لکھوی کی تعمیر کردہ مسجد میں خطیب ہیں اور دیگر دو مساجد کے مہتمم بھی ہیں۔

6: محمد زید لکھوی: ایم۔ اے اسلامیات اور ایم۔ اے عربی۔ ڈی، پی، ایس اوکاڑہ کے کالج سیکشن میں اسلامیات اور عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ عربی مقالے کا عنوان ہے ''الموازنة بين العصر الحاضر و الجاهلي في القيم الاخلاقيه الحربية۔'' وعظ و خطابت میں اپنے اسلاف کا نمونہ ہیں۔۔۔ ان کے خطبہ جمعہ کے لیے مختلف مقامات کے لوگ مہینوں قبل وعدے لے لیتے ہیں۔

خوانندگانِ محترم نے ملاحظہ فرمایا کہ مولانا محی الدین لکھوی کے سات بیٹے ہیں اور ساتوں اپنے ذی تکریم اسلاف کی طرح تدریسی خدمات میں مشغول ہیں۔ فرق صرف یہ ہوا ہے کہ ان کے اسلاف کی تدریس کا محور مساجد اور مدارس تھے، اس لیے کہ اس وقت تدریس

کے اصل مراکز یہی دو مقام تھے، سکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے لوگوں کا زیادہ تعلق نہ تھا۔ لیکن اب حالات میں ایسا تغیر رونما ہوا ہے کہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم بھی بنیادی اہمیت اختیار کر گئی ہے، اس لیے ان لوگوں نے بھی قدیم تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید انداز کی تعلیم حاصل کی اور سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ تاہم اس کے ساتھ مدارس و مساجد میں بھی اپنے اسلاف کی طرح ان کی خطابتی اور تدریسی سرگرمیاں باقاعدگی سے جاری ہیں۔ یعنی یہ سکولوں اور کالجوں میں بھی علوم اسلامیہ ہی کی تدریس میں سرگرم ہیں اور مساجد و مدارس میں بھی ان کے درس و تدریس اور تقریر و تذکیر کے سلسلے جاری ہیں۔

اب آئیے مولانا معین الدین لکھوی کے صاحب زادگانِ گرامی کا پتا کرتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ یہ حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کے نواسے ہیں، یعنی علمی طور پر ددھیال اور ننھیال کی جانب سے نجیب الطرفین۔

یہ تین بھائی ہیں اور علی الترتیب ان کے نام یہ ہیں: مولانا بارک اللہ انجم لکھوی، ڈاکٹر زعیم الدین عابد لکھوی اور ڈاکٹر عظیم الدین زاہد لکھوی۔

مولانا بارک اللہ انجم لکھوی کا صبح سے شام تک زیادہ تر وقت جامعہ محمدیہ میں گزرتا ہے۔ اوکاڑہ اور اس کے قرب و جوار کے بے شمار لوگ ان کے پاس آتے ہیں اور یہ ان کے لیے دعا اور دَم وغیرہ کرتے ہیں اور اللہ انھیں شفا عطا فرماتا ہے۔ دینی تعلیم کے علاوہ یہ ایم اے (اکنامکس) ہیں۔ عمل و کردار اور وضع قطع میں اپنے اسلاف کا صحیح ترین نمونہ۔ بلکہ وضع قطع کا تو یہ حال ہے کہ ان کے جن اسلاف کو میں نے دیکھا ہے، ان سب سے ماشاء اللہ بازی لے گئے ہیں اور چہرے کے پورے رقبے پر سنت رسول (ﷺ) پھیلی ہوئی ہے۔ ان سے چھوٹے دونوں بھائی ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور امراضِ قلب کے ماہر معالج۔ ڈاکٹر زعیم الدین عابد کا کلینک اپنے مسکن اوکاڑہ میں ہے اور کثیر تعداد میں مریض ان کے پاس آتے ہیں۔ مجھے متعدد لوگوں نے بتایا کہ وہ مالی اعتبار سے کم حیثیت مریضوں سے کوئی پیسا نہیں

لیتے بلکہ ان کی مالی مدد کرتے ہیں۔ بہت سالوں سے ان کا معمول ہے کہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ضلع قصور کے قصبہ ''کھڈیاں خاص'' جاتے اور وہاں میڈیکل کیمپ لگاتے ہیں۔ اپنی گاڑی پر آتے اور جاتے ہیں اور مریضوں کا مفت علاج معالجہ کرتے ہیں۔ بیماروں کا ایک ہجوم ان کے جانے سے پہلے ان کا منتظر ہوتا ہے۔ وہ ہر مریض کا اطمینان سے چیک اَپ کرتے ہیں۔ شام تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، کسی مریض سے کوئی پیسا نہیں لیتے۔ سب کام فی سبیل اللہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر انگریزی ماہ کے دوسرے اتوار بہاول نگر جاتے ہیں۔ بہاول نگر میں میرے بہت سے دوست اور عزیز رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے مقررہ تاریخ کو صبح صبح مجھے ٹیلی فون آنا شروع ہوجاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب آج یہاں تشریف لائیں گے، ہمارا نام لے کر ان سے کہہ دو کہ ہم بہ حیثیت مریض ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ یہ بہت بڑی معاشرتی اور دینی خدمت ہے جو مولانا معین الدین لکھوی کے فرزند گرامی ڈاکٹر زعیم الدین عابد فی سبیل اللہ انجام دے رہے ہیں۔ جب حدیث پاک کی رو سے مریض کی عیادت کرنا نیکی ہے تو ظاہر ہے اس کا مفت علاج کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچنا بہت بڑی نیکی کا باعث ہوا۔

ڈاکٹر عظیم الدین زاہد کا بھی یہی حال ہے، اپنے ڈیرے اللہ آباد ضلع قصور میں تو وہ ہر روز مریضوں کو دیکھتے اور ان کا علاج کرتے ہی ہیں۔ لیکن جمعرات کو صبح سے شام تک بالالتزام سلسلہ علاج جاری رہتا ہے۔ علاوہ ازیں فری میڈیکل کیمپس میں بھی وہ مختلف علاقوں میں خدمت انجام دیتے ہیں۔ ملک بھر کے آفت زدہ علاقوں میں میڈیکل ٹیموں کے ہمراہ طبی خدمات میں مصروف رہنا بھی ان کے معمولات میں شامل ہے۔

میں لاہور کے علاقہ ساندہ میں رہتا ہوں۔ یہاں کے رہنے والے ایک شخص محمد سلیم نے مجھے بتایا کہ ان کی بیوی پر مرضِ قلب کا حملہ ہو گیا۔ ہسپتال میں گئے تو ڈاکٹروں نے کہا بائی پاس آپریشن ہوگا، اس پر جو کچھ خرچ اُٹھے گا اس کے متعلق سن کر محمد سلیم صاحب گھبرا گئے۔ اب وہ ڈاکٹر عظیم الدین زاہد لکھوی سے ملے اور ان سے بات کی تو اُنھوں نے متعلقہ

ڈاکٹروں سے رابطہ کیا اور مسئلہ حل ہو گیا۔ آپریشن پر کوئی پیسا خرچ نہیں ہوا۔ انھی عادات و اطوار کے حامل لوگوں کو عالمِ انسانیت میں خلعتِ تحسین کے مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، یہ اپنے اسلاف کی طرح تدریس سے لے کر جسمانی اور روحانی علاج تک لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ تقسیم ملک سے قبل لکھوکے میں جہاں اس عالی قدر خاندان کے علماء مسجدوں اور مدرسوں میں طلباء کو تعلیم دیتے تھے، وہاں سرکاری سکولوں میں بھی ان میں سے بعض لوگ بہ طور معلم خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ اس وقت مجھے پانچ حضرات کے نام یاد آ رہے ہیں: (1) مولوی حیدر علی لکھوی (2) مولوی عبدالرحمان لکھوی (3) مولوی قدرت اللہ لکھوی (4) مولوی عبدالغفار لکھوی اور (5) ماسٹر عبداللطیف۔

اب استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی اولاد و احفاد کی تدریسی خدمات کی ایک جھلک!

حضرت مولانا ممدوح کے چار بیٹے تھے۔ بہ ترتیب ولادت ان کے نام یہ تھے:

مولانا عبدالرحمان، مولانا حبیب الرحمان، حافظ شفیق الرحمان اور حافظ عزیز الرحمان۔

ان میں سے مولانا عبدالرحمان لکھوی کا تقسیم ملک سے پہلے بھی پنجاب کے بعض مدارس میں سلسلہ تدریس جاری رہا اور بعد میں بھی۔ پھر یہی خدمت انجام دیتے ہوئے اُنھوں نے 4۔ مارچ 2001ء کو وفات پائی۔ ان کے چار بیٹے ہیں دو ایم بی بی ایس ڈاکٹر، ایک ریٹائرڈ کرنل اور ایک عالم دین۔

استاذِ پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی کے دوسرے بیٹے مولانا حبیب الرحمان لکھوی تھے۔ اپنے آباء و اَجداد کی طرح اُنھوں نے بھی تا دمِ حیات درس و تدریس کو اپنا معمول قرار دیے رکھا۔ صرف 58 برس عمر پا کر طویل علالت کے بعد 20۔ مئی 1973ء کو فوت ہوئے۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ ایک مولانا حفیظ الرحمان لکھوی جو بے حد شائق تدریس اور اس موضوع کی سرگرم شخصیت ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی کے فاضل۔ لاہور میں ان کی رہائش ہے اور اس لکھوی

عالم دین نے لاہور میں تین مدرسے جاری کر رکھے ہیں، ایک علاقہ نواب صاحب رضا آباد میں جامعہ ابن تیمیہ۔ دوسرا ملتان روڈ پر موضع سندر میں اور ایک چوبرجی کے علاقے میں۔ ان مدارس میں کئی فاضل مدرس فرائض تدریس انجام دے رہے ہیں اور خاصی تعداد میں طلباء حصول علم میں مشغول ہیں۔ ''نداء الجامعہ'' کے نام سے سہ ماہی مجلّہ بھی جاری ہے۔

مولانا حبیب الرحمان لکھوی کے دوسرے بیٹے مولانا خلیل الرحمان لکھوی ہیں۔ فاضل مدینہ یونیورسٹی۔ مدیر معہد القرآن الکریم کراچی۔ تیسرے بیٹے ہیں ڈاکٹر مجیب الرحمان لکھوی ایم بی بی ایس۔

حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے تیسرے بیٹے حافظ شفیق الرحمان لکھوی تھے۔ وہ رینالہ خورد (ضلع اوکاڑہ) میں پڑھاتے ہے۔ ان کے مدرسے کا نام جامعہ ابوہریرہ ہے۔ اپنے گاؤں چک نمبر 18 میں امامت و خطابت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ انھوں نے 26۔ مئی 2014ء کو رینالہ خورد میں وفات پائی۔ یہ فقیر (اپنے دوستوں مولانا ابوبکر سلفی، حافظ احمد شاکر اور سلیم چینیوٹی کے ساتھ) ان کے جنازے میں شامل تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ ایک پروفیسر خلیق الرحمان لکھوی۔ یہ درس نظامی کے فاضل تھے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا اور ایک سرکاری کالج میں عربی پڑھانے لگے۔ اچھے خطیب اور مقرر تھے۔ عین عالم جوانی میں 5۔ ستمبر 2004ء کو اپنے گاؤں چک 18 میں وفات پا گئے۔ جنازہ مولانا معین الدین لکھوی نے پڑھایا۔ میں اور حافظ احمد شاکر نمازِ جنازہ میں شامل تھے۔ حافظ شفیق الرحمان لکھوی کے دوسرے بیٹے کا نام مولانا رفیق الرحمان لکھوی ہے۔ یہ مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ہیں اور آج کل شارجہ میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ حافظ صاحب موصوف کے تیسرے بیٹے مولانا سعید الرحمان لکھوی ہیں۔ فاضل درسِ نظامی اور جامعہ ابوہریرہ رینالہ خورد میں خدمتِ تدریس میں مشغول۔

حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے چوتھے فرزندگرامی حافظ عزیز الرحمان لکھوی تھے عالم و فاضل اور لائق مدرس۔ اُنھوں نے 1961ء میں رینالہ خورد میں مدرسہ محمدیہ

جاری کیا تھا، جسے جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کی شاخ قرار دیا جاتا تھا، اسی ادارے کا نام آج کل جامعہ ابوہریرہ ہے۔ وہ 22۔ دسمبر 1991ء کو چک نمبر 18 میں فوت ہوئے۔ عمر بھر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ ایک حافظ حفظ الرحمان لکھوی جو جامعہ ابوہریرہ رینالہ خورد کے ناظم ہیں اور بی اے پاس ہیں۔ دوسرے بیٹے ہیں ذکی الرحمان لکھوی، ان کا تعلق جماعت الدعوۃ سے ہے۔ 26۔ دسمبر 2008ء کو بمبئی میں پیش آنے والے واقعہ کے بعد اُنھوں نے پوری دنیا میں شہرت پائی۔ تیسرے بیٹے کا نام وحیدالزمان لکھوی ہے۔ سنا ہے ان کا تعلق بھی جماعت الدعوۃ سے ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی تعلیمی قابلیت اور تدریسی خدمات کا مجھے علم نہیں، ظاہر ہے وہ بھی علمائے دین ہی ہوں گے۔

لکھوی خاندان کے ایک عالم مولانا صلاح الدین حیدر لکھوی ہیں۔ اُنھوں نے درس نظامی کی تکمیل کے بعد مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں کا نصاب تعلیم مکمل ہوا تو انھیں دارالافتاء ریاض کی طرف سے بہ طور مبعوث افریقی ملک نائیجیریا بھیج دیا گیا۔ وہاں اُنھوں نے تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں، تقریری صورت میں بھی کام کیا اور عربی اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر کتابیں بھی تصنیف کیں۔

خانوادۂ لکھویہ کی ایک قابل ذِکر شخصیت پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین لکھوی ہیں، جو مولانا صلاح الدین حیدر لکھوی کے بھتیجے ہیں۔ وہ طویل مدت سے جامعہ ابوبکر اسلامیہ (کراچی) میں بہ حیثیت استاذ کام کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے "برصغیر پاک و ہند میں لکھوی خاندان کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ وہ اس سلسلے میں اس فقیر سے بھی ملتے رہے۔ میں نے اپنی محدود معلومات کے مطابق نہایت مسرت کے ساتھ ان سے تعاون کرنے کی کوشش کی۔ اس کا تذکرہ اُنھوں نے اپنے مقالے میں کیا ہے، جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ مقالہ مکمل ہونے اور یونیورسٹی کی طرف سے ڈگری ملنے کے بعد وہ میرے غریب خانے پر لاہور تشریف لائے۔ مجھے مقالہ دکھایا اور ازراہ کرم مٹھائی بھی عنایت کی۔ میری یادداشت کے مطابق ان کا نسب نامہ یہ ہے: محمد حسین بن نورالدین بن مولوی

حیدر علی بن مولانا محمد حسین بن حافظ محمد بن حافظ بارک اللہ لکھوی۔ میں نے ڈاکٹر محمد حسین لکھوی سے لے کر مولانا محمد حسین لکھوی تک کو دیکھا ہے۔

طلباء کی تعلیم کے علاوہ لکھوی حضرات کی نگرانی میں طالبات کی تعلیم کا سلسلہ بھی کئی سال سے جاری ہے، اوکاڑہ میں دو مدارس جامعہ محمدیہ للبنات اور مدرسہ تعلیم الصالحات قائم ہیں، ایک رینالہ خورد میں جامعہ عائشہ اور ایک مدرسہ دیپال پور میں پروفیسر سرفراز احمد لکھوی کی زیر نظامت مرکز تعلیم القرآن والسنہ کے نام سے خدمات سرانجام دے رہا ہے جس کی طلباء اور طالبات کے لیے دو الگ الگ شاخیں ہیں۔ایک مدرسہ للبنات مولانا منیر الدین لکھوی کے اہتمام میں چک نمبر 18 نزد رینالہ خورد میں جاری ہے۔

لائق احترام قارئین غور فرمائیں اس خاندان کی علمی خدمات کا دائرہ کس قدر وسعت پذیر ہے۔ پاکستان میں بھی ان کے علمائے کرام درس وتدریس میں مصروف ہیں اور پاکستان کے باہر بھی بعض ممالک میں ان کی جہودِ علمیہ اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ان کی وضع قطع اور دینی حالت بھی اللہ کے فضل سے اپنے بزرگوں کی طرح ہے۔ان کے عقیدت مندوں کی بہت بڑی تعداد ملک اور بیرون ملک میں موجود ہے۔ یہ لوگ ان لکھوی حضرات سے رابطہ بھی رکھتے ہیں اور ان سے مختلف پہلوؤں سے دینی و دنیوی رہنمائی کے علاوہ اپنے نکاح اور جنازے پڑھوانے میں سعادت سمجھتے ہیں۔

تاریخ اور عمرانیات کے ماہر علامہ ابن خلدون نے ایک نظریہ ایجاد کیا ہے، جسے وہ نظریۂ جیل قرار دیتے ہیں۔''جیل'' کے معنی ہیں مدت اور زمانہ یا گروہ (جنریشن) یعنی کوئی ایسا خاندان یا قبیلہ جس میں حکمرانی یا کسی تعلیمی سلسلے وغیرہ کا آغاز کیا گیا ہو، اس کی مدت کو ابن خلدون نے چار اجیال پر تقسیم کیا ہے۔جیل دس سال کی بھی ہوسکتی ہے اور تیس یا اس سے زیادہ سال کی بھی۔لیکن ابن خلدون نے اسے چالیس سال کی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قبیلے یا گروہ سے اس کا آغاز ہوا ہے، وہ تو اپنے شروع کردہ اس اہم کام کی پوری حفاظت کریں گے اور اس کے ارتقا کے لیے کوشاں ہوں گے ہی۔ دوسری جیل کے لوگ بھی

جنھوں نے پہلے گروہ کو دیکھایا ان کے ساتھ کام کیا، اس کی حفاظت اور ترقی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ تیسری جیل اس سلسلے میں سستی کا شکار ہو جائے گی اور چوتھی جیل میں یا تو معاملہ ختم ہو جائے گا یا اس میں اتنی کمزوریاں اُبھر آئیں گی کہ سلسلہ اختتام کی حدوں کے قریب جا پہنچے گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ لکھوی خاندان کے علماء نے ابن خلدون کے اس نظریے کی عملی اعتبار سے تغلیط کر دی ہے۔ اُنھوں نے تین سو سال قبل تدریس کا جو سلسلہ نہایت محدود پیمانے پر چند گھروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں شروع کیا تھا، وہ بڑے بڑے مشہور شہروں بلکہ ملکوں میں پہنچا اور آثار بتاتے ہیں کہ ان شاء اللہ مزید ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔

ان سطور میں ان حضرات کی سیاسی خدمات کا میں نے تذکرہ نہیں کیا، اپنی گزارشات کو تصنیفی و تدریسی اور خطابتی خدمات تک محدود رکھا ہے، وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ۔ ان خدمات میں پنجاب بلکہ کہنا چاہیے کہ برصغیر کا کوئی اہل حدیث (یا غیر اہل حدیث) خاندان ان کا حریف نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر فرد کسی نہ کسی انداز سے خدمتِ علم میں مشغول ہے۔



حرفے چند

متحدہ پنجاب میں کئی خاندان پیدا ہوئے جنھوں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے سلسلے میں نہایت اہم خدمات سرانجام دیں اور لوگ ان سے مستفید ہوئے لیکن ان سب سے قدیم لکھوی خاندان ہے۔ تقسیم ملک سے قبل ''لکھوکے'' ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو ضلع فیروز پور میں فیروز پور شہر سے جنوب مغرب میں تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس گاؤں میں جس عالمِ دین اور حافظِ قرآن نے سب سے پہلے سکونت اختیار کی، ان کا نام حافظ احمد تھا۔ انھوں نے آج سے کم و بیش تین سو سال قبل 1720ء میں چند گھروں پر مشتمل اس بستی کو اپنا مسکن بنایا۔ اس نواح میں یہ اجنبی شخص تھے جنھوں نے وہاں کی کچی اینٹوں کی چھوٹی سی مسجد میں بچوں کو قاعدے سیپارے کی تعلیم دینا شروع کی۔ اس کے بعد ان کی قابلیت کے مطابق انھیں عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے لگے۔ یہ مغل حکومت کا زمانہ تھا اور حافظ احمد نے تمام عمر آزادی کی فضاؤں میں بسر کی تھی۔

حافظ احمد بہ درجہ غایت متقی بزرگ تھے۔ جلد ہی اردگرد کے دیہات میں ان کی علمیت اور صالحیت کی شہرت پھیل گئی تھی۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا عطا فرمایا، جس کا نام بارک اللہ رکھا گیا جو حفظ قرآن کے بعد حافظ بارک اللہ لکھوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ کتاب جو ''تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی'' کے نام سے تکمیل کی منزل کو پہنچی چھوٹے بڑے چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں لکھوی خاندان کا پس منظر بھی بیان کر دیا گیا ہے اور اس کے عالی قدر اسلاف کا بھی مناسب تفصیل سے تذکرہ آ گیا ہے۔ اس طرح ان کی موضع

لکھو کے میں آمد، ان کے تدریسی و تصنیفی کارنامے، ان کی تقویٰ شعاری کے واقعات اور ان کی علمی و عملی سرگرمیوں کے نقوش کتاب کے صفحاتِ قرطاس پر خاص ترتیب کے ساتھ مرتسم ہو گئے۔

اس دودمانِ رفیع المرتبت کے بزرگوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ کسی زمانے میں پورے متحدہ پنجاب میں ان کے آثارِ صالحیت نمایاں طور پر دکھائی دیتے تھے اور ان کے زہد وورع کا روح پرور شامیانہ دریائے اٹک کی لہروں سے لے کر دلّی کی دیواروں تک پھیلے ہوئے اس صوبے کی سرزمین میں تنا ہوا تھا۔

پھر پنجاب کے اس مدرسے کا جو محدود سے پیمانے پر جاری کیا گیا تھا، دائرۂ شہرت اور حلقۂ اثر اس قدر وسیع ہوا کہ پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے بعض جلیل القدر علماء نے اس کے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ اور پھر ہم نے دیکھا کہ ان کے فیض یافتہ وہ علماء استاذ الاساتذہ کے مقامِ رفیع پر پہنچے اور برصغیر کے بے شمار شائقینِ علوم دینیہ نے ان کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیے۔

حافظ احمد اپنے عہد اور علاقے کے ولی اللہ اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کا ذکر مندرجہ ذیل حضرات نے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔

- مولانا خدا بخش واعظ نے پنجابی نظم کی کتاب ''تحفۂ واعظ'' میں ان کا تذکرہ کیا، جس کا اصل نام ''مختصر سوانح عمری محبوب رب العالمین مولانا محی الدین عبدالرحمٰن'' ہے۔ یہ کتاب آج سے ایک سو بائیس برس پہلے 1313ھ میں چھپی تھی۔ مولانا خدا بخش واعظ موضع مندراں والا تحصیل اجنالا ضلع امرتسر (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ کتبِ حدیث انھوں نے حضرت حافظ محمد لکھوی سے پڑھیں اور انہی سے سند لی اور ان کے فرزندِ گرامی مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔
- مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی نے اپنی تین کتابوں میں حافظ احمد کا ذکر کیا اور وہ کتابیں یہ ہیں:

ایک ''رحلۃ محی الدین الی رب العالمین'': جو مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا سفر نامہ

حج ہے۔

دوسری اربعین مظہری: جو چالیس احادیث پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب آج سے ایک سو بیس برس قبل 1316ھ میں شائع ہوئی۔

تیسری کتاب ہے ایقاظ غفلاء الزمان۔۔۔!

مولانا عبدالحق مالیرکوٹلوی نے حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی سے تحصیلِ علم کی۔ پھر 1305ھ (1887ء) میں دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین سے فیض حاصل کیا۔ 1307ھ (1890ء) میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوئے۔ 1309ھ (1892ء) میں حضرت حافظ محمد لکھوی سے سندِ حدیث لی۔

✪ مولانا الٰہی بخش کلیروی نے اپنی پنجابی نظم کی کتاب ''کرامت نامہ'' میں حافظ احمد کے حالات لکھے۔ اس کتاب میں حافظ احمد سے لے کر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی تک اس عہد کے تمام لکھوی اکابر کے چیدہ چیدہ واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ [1]

کرامت نامہ میں حافظ احمد کی جو کرامتیں بیان کی گئی ہیں ان میں دو کرامتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ فیروز پور کی مسجد غلام فرید میں ایک شخص شام دین نے حاضرین مجلس کو ضلع امرتسر کے ایک شخص کے حوالے سے بتایا کہ وہ کنوئیں صاف کیا کرتا تھا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ نے اسے کہا تم ہمارے بھی دو کنوئیں صاف کر دو۔ دوسری رات بھی اس نے یہی خواب دیکھا۔ تیسری رات بھی خواب میں اس بزرگ نے اسے یہی الفاظ کہے۔ اب اس نے بزرگ سے عرض کیا: مجھے کچھ پتا نہیں چلا آپ کا کیا مقصد ہے اور آپ کن کنوؤں کی بات کرتے ہیں۔ بزرگ نے کہا میرا نام احمد ہے۔ فیروز پور سے بارہ کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام لکھوکے ہے۔ وہاں جاؤ، ایک

---

[1] ملاحظہ ہو الفیوض المحمدیہ (از مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری) صفحہ 9 تا 13

کنواں مسجد کا ہے اور ایک کنواں کسی کے مکان کا۔ انھیں صاف کر دو۔ وہ شخص بزرگ کی خواب میں بیان کردہ نشان دہی پر لکھو کے پہنچا اور دونوں کنوئیں صاف کر دیے۔ حافظ احمد صاحب اسے مزدوری دینے لگے تو اس نے مزدوری لینے سے انکار کر دیا اور کہا میں نے یہ کام اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے، اجرت کی غرض سے نہیں کیا۔

2۔ یہی حافظ احمد فوت ہوئے تو انھیں غسل دے کر اور کفن پہنا کر تدفین کے لیے قبر میں رکھا تو قبر پر مٹی ڈالنے سے پہلے سر کی طرف ایک سوراخ دکھائی دیا جس سے روشنی نمودار ہوئی جو پاؤں کی جانب چلی گئی۔ روشنی میں ایک نہایت خوب صورت میوہ نظر آیا۔ حافظ احمد کے بیٹے حافظ بارک اللہ لکھوی بھی وہیں تھے۔ انھیں بتایا گیا تو فرمایا میوہ نکال لو۔ چنانچہ میوہ نکال لیا گیا اور حاضرین کی تعداد کے مطابق اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے گئے اور ہر شخص کو ایک ایک ٹکڑا دیا گیا۔ اس کے کھانے والے بیان کرتے ہیں کہ وہ میوہ اس قدر لذیذ تھا کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا لذیذ میوہ کھانے کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد نصیب ہوا۔ اپنی نوعیت اور ذائقے کا وہ الگ ہی قسم کا میوہ تھا۔

یہ دونوں واقعات ''کرامت نامہ'' میں مذکور ہیں جو پنجابی نظم کی کتاب ہے۔ لیکن کرامت نامہ میرے پاس نہیں ہے۔ اس کے پنجابی اشعار جو ان واقعات پر مشتمل ہیں، مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری (خطیب جامع مسجد اہل حدیث حجرہ شاہ مقیم) کی آج سے 35 سال قبل کی تصنیف ''الفیوض المحمدیہ'' میں مندرج ہیں اور میں نے وہیں سے ان کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ [1]

حقیقت یہ ہے کہ لکھوی خاندان کے تمام بزرگ اصحابِ رشد و خیر تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی اسی دودمانِ رفیع المرتبت کے خوش نوا رکن اور علم و عمل کا دلآویز مجموعہ

[1] اشعار کے لیے ملاحظہ ہو الفیوض المحمدیہ صفحہ 28 تا 30۔ المکتبۃ العزیزیہ حجرہ شاہ مقیم۔ ضلع اوکاڑہ۔ مطبوعہ 1980ء

تھے۔ اس کتاب میں ان کی زندگی کے وہ تمام پہلو، جن سے ہم آگاہ ہیں، خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ ہر پہلو ان کی حسنات کا آئینہ دار اور صالحیت کا عکاس ہے رحمہ اللہ تعالیٰ۔ کتنے ہی مبلغینِ دین اور واعظینِ اسلام کو ہم نے دیکھا کہ وہ دوسروں کو تو دین کی تبلیغ کرتے اور اسلام کے اوامر و نواہی سے آگاہ فرماتے ہیں، لیکن اپنے رشتے داروں اور اہل خانہ کو اسلام پر عمل پیرا ہونے کی تلقین نہیں کرتے۔۔۔ مولانا محی الدین لکھوی کا معاملہ اس قسم کے واعظین و مبلغین سے مختلف تھا۔ وہ قرآن کے حکم **وانذر عشیرتك الاقربین** پر عامل تھے۔ ❶

مولانا ممدوح زبانی بھی اور خطوط میں بھی اپنے اہلِ خانہ اور رشتے داروں کو احکامِ اسلام سے مطلع کرنا اور ان پر عمل کی تاکید کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک خط ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ جو انھوں نے اپنے داماد داؤد امجد کے نام تحریر فرمایا۔ یہ خط تبلیغ دین پر مشتمل ہے اور اس کا مختصر متن بہت سی تفصیلات پر محیط ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

3۔ محرم الحرام 1406ھ

من محی الدین لکھوی

الیٰ عزیزی داؤد امجد جوہر آباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ اما بعد

الدین النصیحة لله ولرسوله ولکتابه ولائمة المسلمین وعامتهم۔

جواب مطلوب ہے۔

1۔ کیا آپ مسجد کے مکان میں رہتے ہیں؟

---

❶ یہ سورہ الشعراء کی آیت نمبر 214 ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اے پیغمبر ﷺ! اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈراؤ۔

2۔ کیا آپ پانچوں نمازیں با جماعت پڑھتے ہیں؟

3۔ کیا آپ صبح سورہ یٰسٓ کی تلاوت کرتے ہیں؟

4۔ کیا آپ کے والدین آپ سے خوش ہیں؟

5۔ آپ بمع بر یہ بیگم دعاءِ حاجت یاد کریں اور روزانہ دو رکعت اشراق پڑھ کر وہ دعا کیا کریں۔۔۔ اللہ تعالیٰ ننھے جواد کو نیک، صحت منداور عمر والا کرے۔ (آمین)

والسلام

18/9/85

یہ آج سے انتیس (29) برس قبل کی تحریر ہے۔ اس وقت کا ننھا جواد ماشاء اللہ اب زندگی کی تیس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا ہے۔ امید ہے انھیں اپنے عالم وصالح بزرگ مولانا محی الدین لکھوی کے اس خط کا اپنے والدین کی وساطت سے علم ہوا ہوگا اور وہ اس پر عامل ہوں گے۔

بہر کیف عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ مولانا محی الدین لکھوی کتاب وسنت کے احکام پر عمل کے لیے اپنے قریبی رشتے داروں اور اہل وعیال کو پورے اہتمام سے تبلیغ فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ماشاء اللہ ان کے بیٹے وضع قطع، میل جول، بول چال اور لباس وغیرہ میں پابندِ شریعتِ مطہرہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد حماد لکھوی نے ایک دفعہ بتایا کہ مولانا فرمایا کرتے تھے میرا جی چاہتا ہے ہم سب باپ بیٹے ''مسیتڑ'' ہو جائیں، یعنی مسجد کو اپنا ٹھکانا بنالیں اور علائقِ دنیوی سے منقطع ہو کر قرآن وحدیث کی تبلیغ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

یہاں ایک اور گزارش سنیے!

آج سے بتیس سال قبل 1982ء میں میری ایک کتاب فقہائے پاک وہند کے نام سے چھپی تھی جو تیرھویں صدی ہجری کے برصغیر کے علما وفقہا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حافظ بارک اللہ لکھوی کے واقعاتِ حیات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ میں نے لکھا تھا کہ

حافظ بارک اللہ لکھوی 1201ھ یا 1202ھ (1786ء) میں پیدا اور چھیاسی یا ستاسی برس عمر پا کر 1287ھ (1871ء) میں فوت ہوئے۔ گزارش یہ ہے کہ ان کی ولادت و وفات کی یہ تاریخیں لکھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ اصل بات یہ ہے (جیسا کہ زیر مطالعہ کتاب کے دوسرے باب ''حافظ بارک اللہ لکھوی'' میں بیان کیا گیا ہے) ان کی ولادت 1156ھ (1743ء) کے لگ بھگ ہوئی اور وہ تقریباً 1266ھ (1850ء) میں فوت ہوئے۔ انھوں نے ایک سو دس سال عمر پائی۔ [1]

اس عالی منزلت خاندان کے بزرگوں کے حالات چوں کہ ابتدائی دور میں عربی، فارسی یا اردو میں نہیں لکھے گئے اس لیے بعض امور (بالخصوص تواریخِ ولادت ووفات کے متعلق) الجھن پیدا ہوئی۔ اس زمانے کے پنجاب کے دِیہات میں اظہارِ واقعہ کے لیے زیادہ تر پنجابی نظم سے کام لیا جاتا تھا، اس لیے لکھوی علماء کے تلامذہ اور اصحابِ عقیدت نے ان کا تذکرہ پنجابی اشعار میں کیا (اور اشعار بھی خالص دینی نوعیت کے) اس کے بعد وقت آیا کہ اس زبان و بیان سے لوگوں کو دلچسپی نہ رہی، لہٰذا وہ کتابیں ایک ہی مرتبہ چھپیں، دوبارہ ان کی طباعت کی نوبت نہ آئی۔

اردو میں ان بزرگانِ ذی شان کے بارے میں صرف مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی نے لکھا، جن کا تذکرہ گزشتہ سطور میں ہوا، لیکن وہ اردو بھی سوا سو سال پہلے کی ہے اور کلیۃً دینی پس منظر رکھنے والے بزرگ کی جو مرورِ زمانہ کے ساتھ متروک ہوگئی، اس لیے دوبارہ ان اردو کتابوں کی اشاعت بھی نہ ہوسکی۔

خود لکھوی حضرات نے بھی اپنے بزرگوں کے حالات قلم بند کرنے کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ ان کی سرگرمیوں کا محور درس و تدریس رہا۔ بے شک یہ نہایت ضروری عمل ہے، لیکن اپنے اربابِ علم بزرگوں کے کوائف حیات ضبط تحریر میں لانا اور ان کی تحقیقی تگ و تاز

[1] تحفۂ واعظ ص 2 تصنیف مولانا بخش واعظ۔ مطبوعہ 1313ھ (1895ء)

اور مبنی بر صالحیت کارناموں کو اجاگر کرنا بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے تاکہ آئندہ نسلیں ان کے کارناموں سے بہرہ مند ہو سکیں۔ اگر اس طرف دھیان نہ کیا جائے تو آہستہ آہستہ علمائے دین کے کارنامے لوگوں کے دلوں سے نکل جاتے ہیں اور خیر و صلاح کی تاریخ کا یہ ضروری حصہ ختم ہو جاتا ہے۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ لکھوی حضرات کی موجودہ نسل کے اسلوبِ فکر نے خوش گوار انگڑائی لی اور وہ اپنے بزرگوں کے واقعاتِ حیات کو منضبط کرنے اور معرضِ اشاعت میں لانے کے لیے کمربستہ ہوئے۔

ہم لوگ چوں کہ خاندانی اعتبار سے لکھوی علماء سے بیعت وارادت کا علاقہ رکھتے ہیں، اس لیے اس فقیر نے اپنی متعدد کتابوں میں اس خاندان کے بہت سے قدیم اور جدید ادوار کے اہل علم کے جو حالات میسر آئے، لکھ دیے ہیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں: (1) فقہائے ہند (2) بزم ارجمنداں (3) قافلہ حدیث (4) برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن (5) دبستانِ حدیث اور (6) گلستان حدیث (7) برصغیر میں اہل حدیث کی اوّلیات (8) برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت (9) خطباتِ صدارت و استقبالیہ۔ یہ معلوم نہیں کہ کسی لکھوی اہل علم کو ان کتابوں میں سے کسی کتاب میں اپنے خاندان کے کسی بزرگ کا تذکرہ پڑھنے کا موقع ملا ہے یا نہیں۔ اس خاک نشین نے بہرحال ایک فریضہ سمجھ کر اس کاروانِ رشد و ہدایت کے دست یاب واقعاتِ حیات بیان کر دیے ہیں۔ اگر ان حضرات کے حالات یک جا کر دیے جائیں تو ''تذکرہ خاندان لکھویہ'' کے نام سے کتاب بن سکتی ہیں۔ لکھوی بزرگوں کے متعلق اس فقیر کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس نے پنجاب یونیورسٹی کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں حضرت حافظ محمد لکھوی پر مقالہ لکھا۔ قابلِ احترام قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ زیرِ مطالعہ کتاب ''تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی'' بھی متعدد لکھوی

بزرگوں کے حالات اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔

میں حضرت مولانا محی الدین لکھوی کے فرزندِ ارجمند جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر اس کتاب کے لیے تفصیلی مقدمہ لکھا۔ اس مقدمے سے مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ کے بارے میں بہت سی باتیں پہلی دفعہ لوگوں کے علم میں آئیں۔ بے شک وہ مجسمۂ عمل اور پیکرِ صدق وصفا تھے۔ ان پر اللہ کا یہ خاص کرم تھا کہ ان کا ہر قدم سنتِ مطہرہ کی روشنی میں اٹھتا اور ہر قول کتاب وسنت کے احکام سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ اور مجھ پر اللہ کا یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے مجھے اس متبع کتاب وسنت عالم کے واقعاتِ زیست قلم بند کرنے اور ان کے آباو اجداد کے احوالِ زندگی رقم کرنے کی توفیق بخشی۔

کتاب کے "مقدمہ" میں ڈاکٹر محمد حماد لکھوی نے جن الفاظ میں میرا ذکر کیا ہے، وہ الفاظ میرے پیر خانہ کی طرف سے میرے لیے گراں مایہ سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس پر ان کا بے حد شکرگزار ہوں۔

میں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے کہ مولانا محی الدین لکھوی کی حیاتِ طیبہ کے ان تمام ضروری پہلوؤں کو حوالۂ قرطاس کر دیا جائے جو قارئین کے لیے مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں، لیکن عین ممکن ہے بعض باتوں تک میرے ذہن کی رسائی نہ ہوئی ہو اور وہ ضبطِ تحریر میں نہ آسکی ہوں۔ تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا اور کسی بھی معاملے میں معلومات کی جمع وترتیب پر کبھی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ امید رکھنی چاہیے کہ جو حضرات اس باب میں مجھ سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں، وہ اپنی گراں قدر معلومات سے لوگوں کو مطلع فرمائیں گے۔ ان کا یہ عمل خیر ہم سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اس خانوادۂ ذی مکرمت کے فوت شدگان کو

جنت الفردوس عطا فرمائے اور زندوں کو علم و عمل کی توفیق سے نوازے۔ ان حضرات کا تذکرہ کرنے والے اس فقیر کو بھی دنیوی واخروی حسنات سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین یارب العالمین

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی۔ سانده۔ لاہور

ٹیلی فون: 042_37143677

26۔اگست 2014ء

29۔شوال 1435ھ



پہلا باب

لکھوی خاندان کا پس منظر

تقسیمِ ملک سے قبل کا پنجاب انتیس اضلاع پر مشتمل تھا، جن میں ایک ضلع فیروز پور تھا جو اگست 1947ء میں تقسیم پنجاب کے نتیجے میں ہندوستان کے حصے میں آیا۔ اس ضلع کی پانچ تحصیلیں تھیں، ایک خود فیروز پور، دوسری فاضلکا بنگلہ، تیسری مکتسر، چوتھی زیرہ اور پانچویں موگا۔ مجموعی طور پر ضلع فیروز پور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ علمائے کرام بھی پورے ضلع میں خاصی تعداد میں تھے اور متعدد مقامات میں ان کے دینی مدارس جاری تھے۔

تحصیل فیروز پور کے ایک گاؤں کا نام ''لکھوکے'' تھا جو کسی زمانے میں ''لکھا'' نامی ایک شخص نے آباد کیا تھا۔ (اسے لکھوکے بہرام بھی کہا جاتا تھا) یہ گاؤں فیروز پور سے جنوب مغرب میں تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر جلال آباد روڈ پر واقع تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ ''لکھوکے'' گاؤں کو علماء کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ 1720ء کے لگ بھگ یہاں حافظ احمد نے ایک مدرسہ جاری کیا۔ یوں تو اس مدرسے اور اس کے بانیوں کی شہرت ہندوستان کے بہت سے مقامات میں پہنچی۔ لیکن متحدہ پنجاب میں اس مدرسے اور اس کے جاری کرنے والوں نے بالخصوص بڑی شہرت پائی اور بے شمار علما وطلبا نے اس مدرسے میں علوم دینیہ کی تحصیل کی۔

ڈھنگ شاہ

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ قدیم دور کے لکھوی علمائے کرام کا اصل وطن لکھوکے نہیں تھا۔ کم وبیش پانچ سو سال قبل موجودہ جغرافیائی اعتبار سے ان کا اصل وطن ضلع قصور کا

ایک گاؤں ڈھنگ شاہ (Dhing Shah) تھا۔ ڈھنگ شاہ ایک بزرگ تھے، جن کا نام تو ابو داؤد شاہ تھا، لیکن لوگوں میں وہ ڈھنگ شاہ کے عرف سے معروف تھے۔ جس گاؤں میں وہ سکونت پذیر تھے، وہ ان کی ملکیت تھا اور انھی کے نام سے اس گاؤں کا نام ڈھنگ شاہ پڑا۔ وہ نہایت صالح بزرگ تھے اور لوگ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ اکیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ علوی تھے۔ انھوں نے اسی گاؤں میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کا مزار بنایا اور اس پر بدعات اور شرکیہ امور کا ارتکاب ہونے لگا۔ اب بھی وہاں عرس ہوتا اور سالانہ میلہ لگتا ہے اور ان کی قبر کو ''دربار'' کہا جاتا ہے۔ یہ مقام ضلع قصور کے علاقہ کھڈیاں خاص کے قریب ہے۔ وہاں درختوں کے جھنڈ میں ایک کنواں ہے اور چھ ایکڑ زمین ہے جو وہاں کی مسجد کے خطیب کے تصرف میں ہے۔

ملک عالم شاہ

ابوداؤد (ڈھنگ شاہ) کے بیٹے کا نام ملک عالم شاہ تھا۔ ان کے ایک عقیدت مند نے جو لاہور کے رؤسا میں سے تھے، اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا تھا۔ وہ نہایت پارسا اور صالحہ خاتون تھیں اور علوم دینی سے بہرہ ور! دراصل لکھوی علمائے کرام کا خاندانی سلسلہ یہیں سے چلا اور یہی نکاح ان کی شہرت وعروج کا باعث بنا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ڈھنگ شاہ صاحب کا مزار تیار کیا گیا اور اس پر شرک وبدعات کا ارتکاب ہونے لگا تو اس بی بی نے اس پر نفرت کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس سے روکا۔ اپنی اولاد کو بھی اس سے بچنے کی تاکید کی۔ وہ اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کرتی ہوئی وفات پا گئیں۔

حافظ محمد امین

اس بی بی کی اولاد ایک ہی بیٹا تھا، جن کا نام محمد امین تھا۔ محمد امین نے بھی وعظ وتبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنے عزیزوں اور عام لوگوں کو شرک وبدعات کے ارتکاب سے روکنے

کی کوشش کی۔ لیکن کسی نے ان کی بات نہ مانی اور مزار پر نذرو نیاز اور بدعات وشرک کا سلسلہ بہ دستور جاری رکھا۔ بلکہ وہ لوگ محمد امین کی شدید مخالفت اور دشمنی پر اتر آئے۔ اب محمد امین نے اپنے اس آبائی گاؤں اور زمین جائداد کو چھوڑا اور لاہور اپنے ننھیال کے ہاں چلے گئے۔ اس وقت ان کے دو بیٹے ان کے ساتھ تھے، احمد اور نور محمد۔

محمد امین کچھ عرصہ اپنے ننھیال کے ہاں رہے۔ پھر ان سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے دو بیٹوں کے ساتھ ایک مدرسے میں رہنے لگے۔ مدرسے کے بانی کا نام اسماعیل تھا جو اس دور کے مشہور عالم تھے اور ان کے قائم کردہ مدرسے کو ''وڈے میاں دا درس'' (بڑے میاں کا مدرسہ) کہا جاتا تھا۔ اس درس میں ان کے بیٹوں نے قرآن مجید بھی حفظ کیا اور دیگر علوم دینیہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس اثنا میں محمد امین بڑے میاں صاحب کی بکریاں بھی چراتے رہے اور ان کی خدمت کو انھوں نے اپنے لیے سعادت قرار دیے رکھا۔

شاہان مغلیہ کے نزدیک قدرو منزلت

حضرت مولانا محمد علی لکھوی اپنے خاندان کے قدیم دور کے بزرگوں کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

> ''خاندان قدیم الایام سے مقبولِ خاص وعام اور مرجعِ عوام ہونے کے علاوہ شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں تلطفِ خسروانہ سے بھی محروم نہ رہا اور۔۔۔ شیخ المشائخ ابوداؤد ڈھنگ شاہ صاحب قدس سرہ کو خاندانِ مغلیہ سے احیائے دین کے لیے جاگیر عنایت ہوئی جو کہ فی الحال اسی نام سے علاقہ کھڈیاں خاص ضلع قصور میں مشہور ومعروف گاؤں ہے اور وہاں آپ کے مزار پر سالانہ میلہ لگتا ہے۔ [1]

مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری (ساکن حجرہ شاہ مقیم) رقم ط

[1] اخبار ''اہل حدیث'' امرتسر 18۔ مارچ 1920ء۔

"ان کا مزار موضع ڈھنگ شاہ میں گاؤں کے مغرب کی طرف واقع ہے۔
مزار کے اردگرد اراک ❶ کے پرانے درخت جھکے ہوئے ہیں اور قریب
ہی ایک چھوٹا سا کنواں ہے۔ان کے نام پر آج تک کوئی چھے ایکٹر رقبہ
چلا آرہا ہے جو وہاں کے خطیب کے زیر تصرف ہے۔آپ قریباً نویں
صدی ہجری میں ہوئے۔ابوداؤد کے ایک صاحب زادے ملک عالم شاہ
صاحب تھے، جن کے ہاں اکلوتے بیٹے حافظ محمد امین تولّد ہوئے۔ ❷"

ملک عالم شاہ نے اپنے اس بیٹے محمد امین کی تعلیم و تربیت کا اس قدر اہتمام کیا کہ ان کا شمار اس دور کے اولیاء اللہ اور جلیل القدر علما میں ہوا۔ وہ اپنے عہد کے ایک بزرگ سید محمود کمال کے حلقہ بیعت میں شامل ہوئے۔

بادشاہ جہاں گیر سے ملاقات

حافظ محمد امین کی صالحیت کی بنا پر مغل حکمران نور الدین جہاں گیر ان کا بے حد احترام کرتا اور ان سے عقیدت رکھتا تھا۔ مولانا محمد ابراہیم خلیل رقم فرماتے ہیں:

حافظ محمد امین اپنے معاصرین میں نہایت مشہور تھے اور عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شیخ محمد اسماعیل المعروف بڑے میاں سے گہرے قریبی تعلقات تھے۔ شہرت کا یہ عالم تھا کہ حاکم وقت تک آپ کی ملاقات کو باعثِ فخر خیال کرتے تھے۔ جہاں گیر نے ان سے اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"یکم ماہ شوال 1016ھ کو شیخ محمود کمال کے مرید مولانا محمد امین کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ میرے والد بزرگ وار (جلال الدین اکبر بادشاہ) کو ان

---

❶ "اراک" عربی زبان کا لفظ ہے۔ پنجابی میں اسے "ون" کہا جاتا ہے۔ پیلو کا درخت بھی یہی ہے۔ پیلو موسم گرما کا ایک میوہ ہے۔ ان کی لکڑی کی مسواک بنائی جاتی ہے۔

❷ الفیوض المحمدیہ صفحہ 19۔

سے بہت عقیدت تھی۔ ان کی ملاقات سے مجھے از حد خوشی ہوئی۔ ❶"

حافظ محمد امین اپنے دور کے ایک صاحب دل ولی اللہ اور عالم دین تھے۔ موضع ڈھنگ شاہ میں کچھ جدی جاگیر ذریعہ معاش تھی۔ لیکن 1016ھ کو لاہور میں جہاں گیر سے ملاقات ہوئی تو اس نے آپ کے عمدہ ترین خیالات سے متاثر ہو کر ایک ہزار بیگھہ زمین بطور نذرانہ پیش کی اور ساتھ ہی ایک ہزار روپیہ نذرانہ میں دیا جس کا تذکرہ خود جہاں گیر کے الفاظ میں اس طرح ہے۔

"ان کی ملاقات سے مجھے از حد مسرت ہوئی۔ ان کی مفید نصیحتیں اور دلچسپ مشورے میرے لیے باعثِ اطمینان ہوئے۔ میں نے ایک ہزار بیگھہ زمین اور ایک ہزار روپے نذر کیے۔" ❷

تزک جہاں گیری سے معلوم ہوا کہ حافظ محمد امین سے بادشاہ نورالدین جہاں گیر بھی عقیدت رکھتا تھا اور اس نے ان سے ملاقات کر کے ایک ہزار بیگھہ زمین دی اور ایک ہزار روپے بہ طور نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کیے۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس کا والد جلال الدین اکبر بھی ان کا عقیدت مند تھا۔ جلال الدین اکبر تیسرا مغل حکمران تھا جو اپنے والد نصیرالدین ہمایوں کی وفات کے بعد 963ھ میں تیرہ سال کی عمر میں تختِ ہند پر متمکن ہوا، اور جمادی الاخریٰ 1014ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ قمری حساب سے 51 سال حکومت کی۔

نورالدین جہاں گیر ہندوستان کا چوتھا مغل حکمران تھا جس کی ولادت 17۔ ربیع الاوّل 977ھ کو ہوئی اور والد کی وفات کے بعد 14۔ جمادی الاخریٰ 1014ھ کو تخت نشینِ ہند ہوا۔ دونوں باپ بیٹا حافظ محمد امین کے دائرۂ عقیدت میں شامل تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ تختِ حکومت پر متمکن ہونے کے کئی سال بعد تک جلال الدین اکبر علماء اور بزرگانِ دین کا بے حد ارادت مند رہا۔ اس کے بعد جب ملاّ مبارک اور ان کے

❶ الفیوض المحمدیہ صفحہ 20، بحوالہ توزک جہاں گیری ص 112۔

❷ توزک جہاں گیری صفحہ 113۔

بیٹوں ابوالفضل اور فیضی وغیرہ کا اس سے قرب پیدا ہوا تو انھوں نے اس کو غلط راستے پر لگا دیا اور اس کے خیالات بدل گئے۔

حافظ محمد امین کی تاریخ ولادت ووفات کا اگرچہ صحیح طور سے پتا نہیں چلتا تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا تعلق گیارھویں صدی ہجری سے تھا اور وہ ہندوستان کے دو مغل حکمرانوں کے معاصر اور مرکزِ عقیدت رہے تھے، جلال الدین اکبر کے اور اس کے بیٹے نور الدین جہاں گیر کے۔

شیخ اسماعیل لاہوری

یہی زمانہ بڑے میاں درس والے شیخ اسماعیل لاہوری کا تھا۔ ''درس'' کا اطلاق دینی مدرسے پر کیا جاتا تھا۔ وہ لاہور میں اس وقت دینی تعلیم کا بڑا مرکز تھا اور اس میں بہت سے طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ نزہۃ الخواطر میں مفتی غلام سرور لاہوری کی فارسی کتاب خزینۃ الاولیاء کے حوالے سے ان کا ذکر جن عربی الفاظ میں کیا گیا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے:

> ''شیخ اسماعیل بن فتح اللہ بن عبداللہ ابن فیروز لاہوری، جلال الدین اکبر کے عہد میں پیدا ہوئے۔ کھوکھر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو مرض طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے والد فتح اللہ نے اسی حالت میں ان کو شیخ عبدالکریم لاہوری کے سپرد کر دیا۔ بڑے ہوئے تو تحصیلِ علم کرنے لگے اور تمام درسی کتابیں مکمل کر لیں۔ یہاں تک کہ عالم کبیر اور محدثِ وقت مانے گئے۔ تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد لاہور سے دس میل کے فاصلے پر دریا (راوی) کے کنارے ایک گاؤں کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور وہاں درس وافادۂ طلبا میں مشغول ہو گئے۔ طویل مدت تک وہاں قیام رہا، پھر لاہور منتقل ہو گئے۔
>
> ''لاہور کے اس عالم دین کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ عبدالحمید لاہوری، شیخ تیمور لاہوری، شیخ جان محمد لاہوری اور خلق کثیر

شامل ہے۔ 5۔شوال 1085ھ کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔"❶

لاہور سے فیروز پور کا قصد

گزشتہ سطور میں حافظ محمد امین کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ جب حافظ صاحب ممدوح کے دونوں بیٹے (حافظ احمد اور حافظ نور محمد) اس دور کی مروّجہ تعلیم سے فارغ ہو گئے تو انھوں نے لاہور کی سکونت ترک کر کے فیروز پور کا قصد کیا اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ فیروز پور اور اس کے اطراف و جوانب میں ان باپ بیٹوں نے اسلام کی خوب تبلیغ کی۔ اس علاقے کے ہر مقام پر پہنچے اور لوگوں کو اتباع سنت کی تلقین فرمائی۔ انھیں توحید کا درس دیا اور مسائلِ دین سے آگاہ اور احکامِ شرع سے باخبر کرنے کی مہم شروع کی۔ چنانچہ اس نواح میں ان کی تبلیغی سرگرمیاں بہت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور کثیر تعداد میں لوگ ان کے اخلاص اور زہد و اتقا کی وجہ سے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ حافظ محمد امین نے فیروز پور میں وفات پائی اور اندرونِ دہلی دروازہ بڑے بازار میں "نوگزے" کی قبر کے قریب دفن کیے گئے۔

میں نے نوگزے کی قبر دیکھی ہے۔ اب معلوم نہیں کیا صورت حال ہے۔ اس وقت اس قبر کے قریب چند قبریں اور بھی تھیں۔ انہی قبروں میں حافظ محمد امین کی قبر ہو گی۔ نوگزے کی قبر سبز رنگ کی چادر سے ڈھکی رہتی تھی۔ وہ قبر زیادہ سے زیادہ پانچ گز کی ہو گی، لیکن مشہور "نوگزے کی قبر" ہی تھی۔ لوگ وہاں جاتے اور دعا کرتے تھے۔

فیروز پور سے نقل مکانی

حافظ محمد امین کی وفات کے بعد ان کے دونوں بیٹے (حافظ احمد اور حافظ نور محمد) فیروز پور سے چلے گئے۔ حافظ نور محمد نے تو فیروز پور کے قریب ایک گاؤں "بارے کے" میں اقامت اختیار کر لی اور حافظ احمد نے فیروز پور سے جنوب مغرب میں بیس کلومیٹر کے فاصلے پر

❶ نزہۃ الخواطر، ج 5 ص 82 (از سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبوعہ ملتان۔ 1412ھ۔ 1992ء)

جلال آباد روڈ پر موضع ''لکھو کے'' کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔ دونوں بھائی علم و فضل اور تقویٰ وصالحیت کے زیور سے آراستہ تھے۔ اپنے اپنے علاقوں میں دونوں دعوت وارشاد اور اصلاح وتبلیغ میں سرگرم ہوئے اور بہت جلد لوگوں کا مرکزِ عقیدت قرار پا گئے۔ حافظ احمد اس خاندان کے اوّلین بزرگ تھے جو لکھو کے آئے اور جنھوں نے وہاں سکونت اختیار کی اور اس علاقے اور حالات کے مطابق وہ لوگوں کو دینی تعلیم دینے لگے۔ اس خاندان کی تاریخ کا درحقیقت یہی وہ موڑ ہے جہاں تقویٰ وطہارت اور معرفتِ دینی میں ''لکھو کے'' گاؤں میں علما وطلبا کا مرجع قرار پانے کی علامتیں نمایاں ہوئیں۔ حافظ احمد، ابوداؤد ڈھنگ شاہ کے پڑپوتے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ تھا: حافظ احمد بن حافظ محمد امین بن ملک عالم شاہ بن ابوداؤد ڈھنگ شاہ۔ یہ چاروں اپنے دور کے معروف اصحابِ علم اور مشہور اہل تقویٰ بزرگ تھے اور اسی بنا پر لوگوں میں نہایت تکریم کا مقام رکھتے تھے۔ حافظ احمد کی بہت سی کرامتیں بھی مشہور تھیں۔ انھوں نے اپنے والد مکرم حافظ محمد امین کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ صالحیت میں ان کا مقام بڑا اونچا تھا۔ لوگ لکھو کے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان سے علم دین بھی حاصل کرتے اور وظائف بھی پوچھتے۔ وہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی فرماتے۔ لکھو کے گاؤں اس زمانے میں ریاست ممدوٹ میں شامل تھا۔ اس دور کے نواب ممدوٹ نے ان کو کچھ رقبہ دے دیا تھا جو ان کے گزر اوقات کے لیے کافی تھا۔ انھوں نے 1720ء کے لگ بھگ لکھو کے میں مدرسہ جاری کیا، جس نے آگے چل کر بڑی شہرت پائی۔ اسی گاؤں میں ان کی وفات ہوئی اور وہیں دفن کیے گئے۔



دوسرا باب

حافظ بارک اللہ لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

لکھوکے سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں ''طور'' تھا۔ وہاں کے ایک رئیس نے جو بڑے صالح بزرگ تھے، اپنی بیٹی کا نکاح فقط اس بنا پر حافظ احمد سے کر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دین داری اور پارسائی کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا تھا۔

یہ نہایت نیک بخت خاتون تھیں۔ اس خاتون کے بطن سے 1156ھ (1743ء) میں اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا فرمایا، جس کا نام بارک اللہ رکھا گیا۔ لکھوی خاندان کے یہ اوّلین بزرگ ہیں، جن کے نام کے ساتھ ''لکھوی'' کی نسبت کا سلسلہ شروع ہوا۔ [1]

یہ خاتون اپنے اس بیٹے کو ہمیشہ باوضو ہو کر دودھ پلایا کرتی تھیں۔ حافظ بارک اللہ لکھوی خوش نصیب تھے کہ ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے صاحبِ فضل ومجد ہوئے۔ یعنی نجیب الطرفین۔ ان کے والد حافظ احمد بھی نہایت متقی تھے اور نانا بھی بے حد ذی مرتبت تھے، جنھوں نے اس علاقے کے صاحبِ ثروت ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کا عقد ایک اجنبی شخص سے محض اس لیے کر دیا کہ وہ علم اور تقوے کے اوصاف سے متصف تھے۔

---

[1] تحفۂ واعظ پنجابی منظوم، ص 2 (از مولوی خدا بخش واعظ)

مولوی خدا بخش واعظ نے لکھا ہے کہ حافظ بارک اللہ نے 1266ھ میں ایک سو دس سال کی عمر کو پہنچ کر وفات پائی۔ اس حساب سے ان کی ولادت 1156ھ میں ہوئی جو عیسوی حساب سے 1743ء بنتی ہے۔

تحصیلِ علم

حافظ بارک اللہ خیر وصالحیت کی رفاقت میں عالمِ شعور میں داخل ہوئے اور تقویٰ کی فضا میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ گھر میں علم کا دریا رواں تھا اور عالی بخت باپ کا سلسلۂ درس واصلاح جاری تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو والد گرامی کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا، عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں اور علومِ مروّجہ اور فنونِ متعارفہ میں مہارت حاصل کی۔

شاہ غلام علی کی خدمت میں

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی شوکتِ حکمرانی دم توڑ رہی تھی اور اس ملک پر انگریزوں کی حکمرانی کے سائے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ سیاسی اعتبار سے یہ ایک بہت بڑا شر تھا، برصغیر کے مسلمان تیزی کے ساتھ جس کی گرفت میں آرہے تھے، لیکن اس شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس عہد میں یہاں علم وفضل کی بے پناہ اشاعت ہوئی اور للّٰہیت وصالحیت کے وہ مظاہر عالمِ وجود میں آئے کہ جن سے ایک دنیا فیض یاب ہوئی۔ جلیل القدر علما اس ملک میں پیدا ہوئے اور صوفیا واتقیا کی کثیر تعداد معرضِ ظہور میں آئی۔ ان میں ایک رفیع الشان بزرگ شیخ غلام علی دہلوی تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ حافظ بارک اللہ لکھوی کا سالِ ولادت بھی 1156ھ (1743ء) ہے اور شیخ غلام علی بھی اسی سال مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کے قصبہ بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ دونوں بزرگوں کا تعلق پنجاب سے تھا۔ حافظ بارک اللہ کا ضلع فیروز پور سے اور شیخ غلام علی کا ضلع گورداس پور سے۔!

شیخ غلام علی نے دہلی کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ اس لیے وہ دہلوی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ انھیں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی ارادت وخلافت کا شرف حاصل تھا۔ علم وفضل میں بھی وہ یگانۂ روزگار تھے اور زہد وعبادت میں بھی یکتائے عصر۔۔۔ دہلی میں ان کی خانقاہ اصحابِ تصوف کا مرجع اور اربابِ علم کا مرکز تھی۔ ہندوستان اور افغانستان کے لوگ تو کثیر تعداد میں ان سے حصولِ فیض اور اکتسابِ علم کرتے ہی تھے، ترکی، شام، مصر، بغداد، چین اور

ملک جش کے تشنگانِ خیر بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علم ومعرفت کی تحصیل کرتے۔

حافظ بارک اللہ لکھوی خاندانی اعتبار سے کئی پشتوں سے تصوف وسلوک سے بھی وابستگی رکھتے تھے اور علم وادراک کی وادیوں کے بھی شناور تھے، اس لیے انھوں نے دہلی کے لیے شدّ رحال کیا، شیخ غلام علی کی خدمت میں پہنچے اوران سے حصولِ فیض کیا۔اہلِ تصوف کی اصطلاح میں کہنا چاہیے کہ طریقت وسلوک کی منزلیں طے کیں۔

شاہ غلام علی کو شیخ عبداللہ شاہ بھی کہا جاتا تھا۔ انھوں نے حافظ بارک اللہ لکھوی کو اپنی خلافت واجازت سے نوازا۔ چنانچہ مولانا عبدالحق مالیرکوٹلوی تحریر فرماتے ہیں۔

> ”حضرت میاں صاحب حافظ بارک اللہ کو خلافت واجازت حضرت مولوی عبداللہ شاہ صاحب المعروف شاہ غلام علی دہلوی سے تھی اور وہ خلیفہ اول، مسند نشین، قیم طریقہ احمدیہ، محی سنتِ نبویہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے تھے، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔“ ❶

مولانا خدا بخش واعظ نے پنجابی نظم میں ”تحفۂ واعظ“ کے نام سے حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کی سوانح عمری لکھی ہے، اس میں بھی اسی طرح رقم فرمایا گیا ہے کہ حافظ بارک اللہ لکھوی کو شاہ غلام علی کی طرف سے خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

> تے شاہ غلام علی دی آہی صحبت اتے خلافت
> حضرت بارک اللہ دے تائیں پائی ایڈ شرافت ❷

ایک شعر میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ شاہ غلام علی دہلوی کو میرزا مظہر جانِ جاناں سے فیض حاصل تھا۔

---

❶ ایقاظ غفلاء الزمان (از مولانا عبدالخالق مالیرکوٹلوی) ص 5۔

❷ تحفۂ واعظ، ص 5۔

تے مرزا مظہر جانِ جاناں تھیں فیض غلام علی نوں
ایہ بھی نسبت ملدی آہی محی الدین ولی نوں ❶

بے شبہ حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عہد کے عالی مرتبت عالم اور نامور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔

حافظ بارک اللہ لکھوی اگرچہ دہلی بہ ظاہر حضرت شاہ غلام علی سے کسبِ فیض کی غرض سے گئے تھے، لیکن اس دور کے دہلی میں بے شمار علمائے کرام موجود تھے، جن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحب زادگان گرامی کے تلامذہ کرام اور ان سے اکتسابِ علم کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد شامل تھی۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حافظ صاحب نے ان میں سے بعض حضرات سے لازماً استفادہ کیا ہوگا اور وہ ان کے حلقۂ فیض میں شریک رہے ہوں گے۔

زہد وتقویٰ

حافظ بارک اللہ صاحب نہایت عابد وزاہد تھے، بے حد قناعت پسند۔ مالِ مشتبہ سے دامن بچا کر رکھتے تھے۔ اس ضمن میں مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری نے روزنامہ ''جنگ'' (کراچی) مورخہ 6۔ مارچ 1975ء کے حوالے سے مولانا امداد صابری کی ایک تحریر نقل کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ تقویٰ وپرہیز گاری میں مشہور تھے۔ اپنے موضع (لکھوکے) میں انھوں نے ایک کنواں کھدوایا تھا۔ سفر میں بھی اسی کنویں کا پانی پیتے تھے۔ کنویں کا پانی ساتھ لے جاتے تھے۔'' ❷

یعنی اکل وشرب میں حلال چیزوں کا اس قدر التزام کرتے کہ کہیں سفر پر جاتے تو پانی بھی اپنے کنویں کا ساتھ لے جاتے، دوسرے کا پانی استعمال کرنے سے اس بنا پر گریز فرماتے کہ مبادا اس میں مال مشتبہ کی آمیزش ہو۔ گندم بھی وہی کھاتے جس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہوتا۔

مختلف حضرات نے حافظ بارک اللہ لکھوی سے متعلق بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی رقم طراز ہیں:

---

❶ تحفۂ واعظ ص 5
❷ تحفۂ واعظ ص 35

”میاں صاحب بارک اللہ متقی کامل، ولی خدا، حافظ قرآن تھے۔ میاں صاحب بارک اللہ ایک روز حسب عادت ذکرِ الٰہی کرتے ہوئے جنگل میں تشریف لے گئے۔ اتنے میں نماز کا وقت آ گیا۔ آپ کو جماعت کا خیال آیا تو کسی طرف سے کہا گیا کہ فقیری میں ایسے امور کے التزام کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔ حافظ صاحب نے بارگاہِ الٰہی میں بہ صد التجا عرض کی کہ یا الٰہی مجھ کو نانک شاہی فقیری منظور نہیں، مجھ کو تو محمدی فقیری درکار ہے۔“ [1]

حافظ بارک اللہ لکھوی کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔ وہ درس و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے اور دیہات میں جا کر لوگوں کو وعظ و تبلیغ بھی کرتے تھے۔

حق گوئی اور غیرت دینی

حافظ صاحب حق گوئی اور غیرت دینی کے سلسلے میں بڑے سخت تھے اور اس باب میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

ایک دن اپنے گاؤں لکھوکے کی مسجد میں طلباء کو درس دے رہے تھے کہ ان کے زمانے کا نواب ممدوٹ (جس کا نام بعض کے نزدیک جمال الدین اور بعض کے نزدیک قطب الدین تھا) اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ حافظ صاحب سے ملاقات کے لیے لکھوکے آیا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو حافظ صاحب کے خادم علی محمد نے بتایا کہ نواب صاحب نے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنے ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ سنتے ہی حافظ صاحب نے نواب کے ہاتھ جھٹک دیے اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہم درویش لوگ امورِ دنیا سے منقطع ہو کر مسجدوں میں بیٹھے ہیں۔ بے دین لوگ یہاں بھی ہمیں آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ ایسی چیزیں پہن کر آ جاتے ہیں جن کا پہننا مردوں کے لیے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ یہ الفاظ کہے اور نواب کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے مسجد کے اندر چلے گئے۔

---

[1] الفیوض المحمدیہ ص 38 بحوالہ رحلت محی الدین الی الرحمٰن العالمین

نواب نے ان کے اس طرزِ عمل اور اسلوبِ کلام کو گستاخی پر محمول کیا اور اس کا پندارِ حکمرانی مسجد کے ایک درویش کے کلمۂ حق کو برداشت نہ کر سکا۔ حکم ہوا: ''اس کو فوراً حدودِ ریاست سے باہر نکال دیا جائے۔''

لوگوں نے نواب کو سمجھانے کی کوشش کی اور ریاست بدر کر دینے کا سخت حکم واپس لینے کی التجا کی، لیکن وہ نہ مانا۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور حافظ بارک اللہ اہل وعیال اور طلبا و مریدین کو ساتھ لے کر دریائے ستلج کے کنارے آئے جو قصبہ ممدوٹ کے قریب سے گزرتا تھا، کشتی پر سوار ہو کر ریاست بہاول پور کو روانہ ہو گئے۔ ان کا ارادہ حجازِ مقدس جانے کا تھا۔

وہ ہیڈ سلیمان کی کے قریب ''حاصل ساڈو'' کے مقام پر آئے اور عارضی طور پر وہاں جنگل میں ٹھہرے۔ لیکن حافظ صاحب کی روانگی کے بعد قصبہ ممدوٹ میں یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ بلاظاہری اسباب و آثار اور موسم کے دریائے ستلج میں اتنی شدید طغیانی آئی کہ نواب کے باغات و محلات اور شاہی قلعے کو سخت نقصان پہنچا۔

نواب اس صورتِ حال سے انتہائی پریشان ہوا، اور مصاحبوں سے اس ناگہانی آفت کے بارے میں بات کی۔

جواب ملا: یہ حافظ بارک اللہ کو ریاست سے نکال دینے کا نتیجہ ہے۔ وہ متقی بزرگ ہیں۔ انھوں نے ایک صحیح بات کہی تھی، جس سے ناراض ہو کر انھیں ریاست بہ در کر دیا گیا۔ اگر انھیں واپس نہ لایا گیا تو مزید طغیانی اور تباہی کا خطرہ ہے۔

یہ سن کر نواب پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس نے اسی وقت اپنے ماموں کی قیادت میں چند گھڑ سواروں کو حافظ صاحب کے پیچھے دوڑایا اور نواب بہاول پور کے پاس بھی چند معززین کو بھیجا کہ وہ حافظ بارک اللہ کو جو ان کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں، مہربانی کر کے واپس ممدوٹ روانہ کر دیں۔ حافظ صاحب واپس تشریف لائے تو طغیانی رکی اور دریا کا پانی پہلی سطح پر آ گیا۔

اسے حافظ بارک اللہ کی کرامت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ وہ بے حد صالح اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔

یہ واقعہ سب سے پہلے اس فقیر نے حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم ومغفور سے سنا تھا۔ بعدازاں اور بھی متعدد پرانے لوگوں سے سنا۔ [1]

حافظ صاحب واپس آئے تو نواب ممدوٹ نے ان سے معافی مانگی اور ''لکھوکے'' گاؤں بہ طور جاگیر دینے کی پیش کش کی، لیکن حافظ صاحب نے یہ کہہ کر گاؤں لینے سے انکار کردیا کہ ایک تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں، دوسرے ہم ایسی زمین نہیں لینا چاہتے، جس کا لگان اور معاملہ وآبیانہ وغیرہ ہم حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہوں۔

یہاں یہ عرض کردیں کہ اس واقعہ سے قبل ریاست کا صدر مقام ممدوٹ تھا، بعد میں جلال آباد کو صدر مقام بنالیا گیا تھا، جو تقسیم ملک سے پہلے فیروز پور سے بہاول نگر اور سمہ سٹہ جانے والی ریلوے لائن پر چوتھا اسٹیشن تھا۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ آزادیٔ برصغیر تک یہ محلات اسی طرح خستہ حالت میں تھے۔

ایک عجیب وغریب واقعہ

حافظ بارک اللہ لکھوی کے حاصل ساڈو میں قیام کے زمانے کا ایک واقعہ بڑا عجیب وغریب ہے۔ اس نواح کے لوگوں نے ان سے کہا کہ اس جنگل میں کسی ایسی بدروح کا اثر ہے جو ان مال مویشی کو ہلاک کردیتی ہے جو اس کی حد میں چلے جاتے ہیں، لہٰذا آپ اپنے اونٹ وغیرہ وہاں نہ جانے دیں۔

حافظ صاحب نے جواب دیا اللہ نگہبان ہے اور وہی ہر شے کا مالک ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ۔!

اس سے چند روز بعد معلوم ہوا کہ حافظ صاحب کا اونٹ اس جگہ چلا گیا، جس کے بارے میں لوگوں نے بتایا تھا کہ وہاں کسی بدروح کا اثر اور ٹھکانا ہے۔ وہ اونٹ وہاں جاتے ہی بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ اب حافظ صاحب وہاں پہنچے اور قرآن مجید کی چند آیات پڑھ کر اونٹ پر

[1] اس سلسلے میں مولانا معین الدین لکھوی مرحوم کا مضمون احوال الآخرت کے ص 143 پر دیکھیے، جس کا عنوان ہے ''غیر منقسم پنجاب کا عظیم مصلح'' مطبوعہ محرم 1377ھ۔

پھونک ماری اور اونٹ کھڑا ہو گیا۔ پھر چاروں طرف منھ کر کے کچھ پڑھا اور پھونکیں ماریں۔ فرمایا: اب بے شک کوئی جانور اس جنگل میں کہیں پھرتا رہے، اللہ کی مہربانی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ چنانچہ اس کے بعد انھیں اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

حافظ صاحب وہاں کتنا عرصہ رہے۔؟ اس کا پتا نہیں چل سکا۔

سید جعفر علی نقوی سے ملاقات

اسی مقام پر حافظ بارک اللہ لکھوی مرحوم سے حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت مجاہدین کے ایک مشہور رکن سید جعفر علی نقوی کی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے رفقا کے ساتھ جہاد کے لیے سرحد پار جاتے ہوئے یہاں ٹھہرے تھے۔ اس ملاقات کا ذکر انھوں نے اپنی فارسی زبان کی قلمی کتاب ''منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء'' میں کیا ہے۔ ان کے فارسی الفاظ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

> ''ان دنوں ایک بزرگ میاں بارک اللہ سے ملاقات ہوئی جو (نواب قطب الدین خاں) سے ناخوش تھے اور ریاست بدر کر دیے گئے تھے۔ وہ نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔ ان کے مرید بھی بہت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔'' [1]

چند قابل ذکر باتیں

حافظ بارک اللہ کے بارے میں یہاں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

1۔ حافظ صاحب خلافِ شرع کوئی بات برداشت نہ کرتے تھے، اگرچہ اس کا نتیجہ جلاوطنی کی صورت میں نکلتا۔

2۔ وہ بے حد بلند اخلاق، مشفق اور متقی بزرگ تھے۔ ان کی نیکی کی وجہ سے لوگ ان سے متاثر ہوتے تھے۔ سید جعفر علی نقوی جیسے عالم و فاضل اور مجاہد فی سبیل اللہ بھی ان سے اس درجہ اثر پذیر ہوئے کہ انھیں یاد رکھا اور اپنی کتاب میں ان کا ذکر کیا، ورنہ اثنائے

[1] منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء ورق 634ب، قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

راہ میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں، کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔ وہی شخص یاد رہتا ہے جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو اور جس کے عمل و کردار نے دل پر کوئی خاص نقش قائم کیا ہو۔ قمری حساب سے سید جعفر علی نقوی کی 1245ھ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ کتاب انھوں نے 1272ھ میں لکھی یعنی ملاقات سے ستائیس برس بعد۔ اتنے طویل عرصے تک وہی شخص اس طرح یاد رہتا ہے کہ اس کا با قاعدہ کتاب میں ذکر کیا جائے، جو بہت بڑی شخصیت کا مالک اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہو۔

3۔ وہ اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز عالم تھے، جن کا بہت بڑا حلقۂ اثر اور دائرۂ ارادت تھا۔

4۔ ان کے عقیدت مند اور مرید صرف ان کے گاؤں لکھو کے تک محدود نہ تھے بلکہ دور دراز علاقوں میں بھی موجود تھے۔ مریدوں کی ذہنی اور روحانی تربیت وہ احسن طریقے سے کرتے تھے، جن کی وجہ سے وہ ملنے والوں سے شفقت و تلطف سے پیش آتے تھے۔

تصنیف

حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عصر میں پنجاب کے سر برآوردہ فقہا اور مشاہیر علما و مشائخ میں سے تھے اور صاحبِ تصنیف تھے۔ پنجابی کے ممتاز شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی تصنیف پنجابی نظم کی مشہور کتاب ''انواع بارک اللہ'' ہے۔ اس کا ایک نام ''نصاب الفقہ'' بھی ہے۔ اس میں روزانہ پیش آنے والے فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے دور کے بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔ وسعتِ مطالعہ کا یہ عالم کہ جہاں وہ مختلف مسائل میں قرآن و حدیث کے حوالے دیتے ہیں وہاں فتاویٰ قاضی خاں، ردالمختار، درالمختار، طحاوی، فتاویٰ شامی، فتاویٰ عالم گیری، فتاویٰ مظہری، ہدایہ، کنزالدقائق وغیرہ کتبِ فقہ کے حوالے بھی دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انواع بارک اللہ کی تصنیف کے وقت بہت بڑا ذخیرۂ فقہی ان کے سامنے تھا۔ اور یہ وہ دور تھا جب کہ ان میں سے بہت سی کتابیں چھپی بھی نہیں تھیں، قلمی صورت میں بعض اصحابِ علم کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔

''انواع بارک اللہ'' حافظ بارک اللہ لکھوی کی وفات سے چودہ پندرہ سال بعد ان کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی نے طبع کرائی۔ شیخ الٰہی بخش تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے اسے شائع کیا۔ اس کتاب کی اہمیت اور مصنف کی علمی حیثیت اور شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ الٰہی بخش نے اس کے حقوقِ طباعت حافظ محمد لکھوی سے دو سو روپے میں حاصل کیے۔ یہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل 1291ھ کی بات ہے۔ اس وقت دو سو روپے موجودہ دور کے دو لاکھ روپے سے بھی زیادہ قیمت کے ہوں گے۔ اس کی کتابت ضلع گوجراں والا کے موضع کیلیاں والا کے خوش نویس شاہ محمد سوار نے کی اور پروف خوانی لاہور کی بادشاہی مسجد کے امام مولوی یار محمد سے کرائی گئی۔

وفات

حافظ بارک اللہ آخر عمر میں بینائی سے محروم ہوگئے تھے۔ زیادہ تر وقت مسجد میں گزارتے اور ذکرو اذکار میں مشغول رہتے۔ ایک سو دس سال کی عمر پاکر 1266ھ (1850ء) میں اپنے مسکن لکھوکے میں وفات پائی۔ [1]

[1] ملاحظہ ہو تحفہ واعظ، ص 2۔

تیسرا باب

حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں:

1۔ حافظ محمد لکھوی: ان کے حالات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایے۔

2۔ حکیم محمد شریف: یہ حافظ محمد لکھوی سے چھوٹے تھے اور حافظ صاحب کی بہت خدمت کرتے تھے، خدمت کی وجہ سے لوگ انھیں غلامِ محمد کہا کرتے تھے اور اسی نام سے مشہور ہوگئے۔ محمد شریف جو اصلی نام تھا، لوگوں کے ذہن سے نکل گیا۔

3۔ مولوی محمد سلیم: انھوں نے تفسیر وحدیث اور فقہ وغیرہ تمام علوم اپنے بڑے بھائی حافظ محمد لکھوی سے پڑھے۔

4۔ مولوی محمد صالح: انھوں نے بھی حافظ محمد صاحب سے تحصیل علم کی۔

ولادت اور تعلیم

حافظ محمد لکھوی 1221ھ (1807ء) کو بمقام لکھوکے پیدا ہوئے۔ تفسیر و حدیث، فقہ واصول، منطق وفلسفہ، صرف ونحو، بیان ومعانی، عربی ادبیات وغیرہ تمام علوم مروّجہ کی تحصیل اپنے والد مکرم حافظ بارک اللہ لکھوی سے کی۔ انہی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ فن قرأت وتجوید بھی انہی سے سیکھا۔ بے حد ذہین تھے۔ والد سے حصولِ علم کے بعد لدھیانہ گئے۔ وہاں کے علماء سے بعض کتابیں پڑھیں۔

لدھیانہ سے واپس آئے تو عازمِ دہلی ہوئے۔ وہاں شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا احمد علی سہارن پوری اور میر محبوب علی کے حلقہ ہائے درس میں رہے اور ان بزرگانِ ذی شان سے علومِ حدیث اور بعض دیگر علوم میں استفادہ کیا۔

دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین کے حضور بھی زانوئے شاگردی تہہ کیے اور ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ مولانا محمد علی لکھوی کے بقول حافظ صاحب 1857ء کی جنگ آزادی سے قبل لگ بھگ پچاس برس کی عمر میں دہلی جا کر حضرت میاں صاحب کے دائرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ان سے سندِ حدیث لی۔ ❶

ذہانت اور قوتِ حفظ

ذہانت اور قوتِ حفظ میں حافظ محمد لکھوی کا مقام بہت بلند تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ ان کی نظر سے گزر جاتی، اس کے تمام مشمولات ان کے لوحِ ذہن پر مرتسم ہو جاتے۔ جب ضرورت پڑتی پوری تفصیل سے کتاب کے صفحے اور سطر تک بتا دیتے۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی ان کی یادداشت اور قوتِ حفظ سے بہت متاثر تھے۔ فرمایا کرتے کہ میرے حلقۂ درس میں ایک پنجابی طالب علم حافظ محمد آیا ہے جو میرے منہ سے بات نکلنے سے پہلے ہی سمجھ لیتا ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

انھیں مختلف فنون کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے زبانی یاد تھے اور ضرورت کے وقت انھیں مسلسل پڑھتے جاتے۔ حضرت میاں صاحب ازراہِ تفنن طبع انھیں مہتمم کتب خانہ کہا کرتے تھے۔ ❷

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ حضرت میاں صاحب کا مطالعہ ان سے بھی وسیع تھا اور ان

---

❶ ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (امرتسر) 18۔ مارچ 1921ء۔

❷ غیر منقسم پنجاب کا عظیم مصلح مضمون (از مولانا معین الدین لکھوی) براحوال الآخرت ص 143۔ (طبع محرم 1377ھ)۔

کی یادداشت کا دائرہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس کی شہادت اس واقعہ سے ملتی ہے کہ ایک مرتبہ دورانِ درس حافظ صاحب نے کسی فقہی مسئلے سے متعلق چودہ کتابوں کا حوالہ دیا، لیکن میاں صاحب نے اسی بحث پر چالیس کتابوں کے نام گنوا دیے۔

مولانا معین الدین لکھوی، حضرت حافظ محمد لکھوی کی صاحب زادیوں کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ آخرِ عمر میں جب حافظ صاحب تفسیر محمدی لکھا کرتے تھے تو کتنی ہی کتابیں ان کے سامنے کھلی ہوتی تھیں۔ وہ بعض اوقات لکھتے لکھتے ان میں سے کسی کتاب پر نظر ڈالتے، پھر لکھتے چلے جاتے۔ انھیں مسودے پر نظر ثانی کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

مولانا محمد علی لکھوی ان کی کثرتِ معلومات اور متعلقہ مضمون پر احتضار کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''قصور کے سجادہ نشینوں کا حافظ بارک اللہ صاحب سے ''یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ'' کے مسئلے پر مباحثہ ہوا تو حافظ محمد صاحب مرحوم نے اس کی حرمت پر کتبِ فقہ کے حوالہ جات از بر سنائے۔ ان کے صفحات کے صفحات انھیں زبانی یاد تھے۔''❶

والدین کی اطاعت

قرآن وحدیث میں والدین کی خدمت اور فرماں برداری کا خاص طور سے حکم دیا گیا ہے۔ حافظ محمد لکھوی اس کا بہ درجہ غایت التزام کرتے تھے۔ وہ اپنے والد کو صاحبِ کرامات قرار دیتے تھے اور وہ جو کچھ ارشاد فرماتے اس پر عمل کرتے۔ ان کی کوئی بات بہ ظاہر ان کے نزدیک قابلِ عمل نہ بھی ہوتی تو اس پر بھی عمل پیرا ہوتے اور خیال فرماتے کہ میرے والد چوں کہ صاحبِ کرامات ہیں، اس لیے ان کی بات میں ضرور کوئی حکمت پنہاں ہوگی۔ اس قسم کا ایک واقعہ مولانا عبدالرحمن بن حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے حوالے سے مولانا محمد ابراہیم خلیل مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

❶ اخبار اہل حدیث (امرتسر) 18۔ مارچ 1921ء

''ایک مرتبہ حافظ صاحب نے حصولِ غلہ کے لیے کچھ جوار کی فصل کاشت کی۔ جب وہ پکنے کے قریب ہوئی تو حافظ بارک اللہ نے اپنے بیٹے حافظ محمد کو بلا کر حکم دیا کہ جوار کی فصل کاٹ دو۔ اس وقت اس کی پختگی میں چند روز باقی تھے۔ لیکن حافظ محمد صاحب نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے کاٹ دیا۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں، میں فصل کاٹ بھی رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ والدِ محترم نے اسے کاٹنے کا حکم کیوں دیا جب کہ یہ ابھی تک پختہ نہیں ہوئی۔ پھر خیال کیا کہ اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی، جس کا مجھے علم نہیں۔ فرماتے ہیں اس سے صرف تین دن بعد ایسا سخت طوفان آیا کہ سب کی فصلیں تباہ ہوگئیں اور وہ فصل سے محروم ہوگئے۔ صرف ہماری جوار محفوظ رہی۔ تب مجھے ان کے اس ارشاد کی حکمت کا پتا چلا۔''[1]

حضرت حافظ محمد لکھوی اپنے والد مکرم کا اسم گرامی ہر مقام پر بے حد احترام کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ کہیں تحریر فرماتے ہیں: ''محمد بن مخدومی وافتخاری، عمدۃ الاتقیاء، زبدۃ الاصفیاء، صفوۃ الفقہاء مولوی محمد بارک اللہ۔''

کہیں رقم کرتے ہیں: ''جناب مولانا مخدومی ووالدی واستاذی ۔۔۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں: ''حافظ محمد خلف زبدۃ فقہاء محققین وعمدۃ اتقیاءِ متشرعین حضرت مولانا مولوی محمد بارک اللہ صاحب۔''

ایک جگہ یہ الفاظ مرقوم ہیں: ''محمد بن مقبول بارگاہِ الٰہ مخدومی ومولائی بارک اللہ عفا اللہ عنہما۔''[2]

---

[1] الفیوض المحمدیہ ص 76۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو وہ سند جو حضرت حافظ محمد لکھوی نے 1309ھ میں مولانا عبدالحق مالیرکوٹلوی کو دی۔ مطبوعہ الفیوض المحمدیہ ص 71۔ نیز دیکھیے اسی کتاب کا ص 75 اور اس کے آگے کے صفحات زیرِعنوان "اطاعت والدین"

اونٹنی سے متعلق ایک واقعہ

مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری اپنے تایا مولوی صوفی محمد فیروز پوری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حافظ محمد لکھوی اونٹنی پر سوار کہیں جارہے تھے کہ راستے میں نماز کا وقت ہوگیا۔قریب ہی قبرستان تھا، وہاں حافظ صاحب نے وضو کیا اور اونٹنی قبرستان میں چھوڑ دی جو درختوں کے پتے وغیرہ کھانے لگی۔خود حافظ صاحب نماز میں مشغول ہوگئے۔

قبرستان کے مجاوروں نے حافظ صاحب سے کہا کہ قبرستان میں اونٹنی کو اس طرح کھلی نہ چھوڑیں، یہاں قبروالا بابا اسے مار دے گا۔حافظ صاحب نے ان کی بات کی طرف توجہ نہیں کی اور نماز کی نیت باندھ لی۔نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ اونٹنی واقعی زمین پر بے ہوش گری پڑی ہے اور مجاور ہنس رہے ہیں۔انھوں نے حافظ صاحب سے کہا ہم نے آپ سے کہا تھا کہ اونٹنی قبرستان میں نہ چھوڑیں، اسے قبر والا بابا مار ڈالے گا۔آپ نے ہماری بات نہیں مانی اور اونٹنی مرگئی۔

حافظ صاحب اونٹنی کے پاس آئے تو دیکھا کہ اس پر شیطانی اثر ہے۔انھوں نے پاؤں سے جوتی اتاری اور اونٹنی کو مارنا شروع کر دیا۔وہ اسے جوتے بھی مار رہے ہیں اور ساتھ ہی **لا حول و لا قوة الا باللہ العلی العظیم** بھی پڑھ رہے ہیں۔چار پانچ جوتے مارے ہوں گے کہ شیطان بھاگ گیا اور اونٹنی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اب مجاور حیران کہ یہ کیا ہوگیا۔بولے: لکھوی حافظ صاحب بہت بڑے بزرگ ہیں جنھوں نے مری ہوئی اونٹنی زندہ کردی ہے۔

اساتذہ کے نزدیک قدر و منزلت

حضرت حافظ محمد لکھوی کے اساتذہ کرام بھی ان کی بے حد قدر کرتے تھے۔اس کی وجہ ان کی وسعت مطالعہ، قرآن و حدیث میں مہارت، بے پناہ ذہانت اور تقویٰ و صالحیت تھی۔

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا دہلی میں بہت مشہور مدرسہ تھا جس میں لاکھوں

علما و طلبا نے تحصیلِ علم کی۔ حضرت حافظ محمد لکھوی بھی ایک سال وہاں حضرت میاں صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں رہے اور ان سے سندِ حدیث لی۔ حافظ صاحب کے فرزند گرامی حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے بھی ان سے اکتسابِ علم کیا، لیکن اس کے باوجود میاں صاحب نے دہلی سے اپنے ایک شاگرد کو ان دونوں باپ بیٹا سے حصول علم کے لیے لکھو کے بھیجا اور انھیں احترام کے الفاظ میں سفارشی خط لکھا۔ ❶

شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا احمد علی سہارن پوری اور میر محبوب علی جلیل القدر علماء اور حافظ صاحب کے لائق احترام اساتذہ تھے۔ لیکن مولانا عبدالحق مالیرکوٹلوی لکھتے ہیں کہ یہ حضرات فتویٰ پوچھنے والوں کو حافظ صاحب کے پاس بھیجتے اور فرمایا کرتے کہ ''یہ شخص صاحبِ الہام ربانی ہے۔'' ❷

قرآن کا ترجمہ وتفسیر

حافظ محمد لکھوی بے شمار اوصاف کا رفیع الشان مجموعہ تھے۔ ان کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر ہے۔ برصغیر میں پورے قرآن مجید کا سب سے پہلے فارسی زبان میں ترجمہ حضرت مخدوم نوح بن نعمت اللہ سندھی نے کیا جو صوبہ سندھ کے ایک گاؤں ''ہالہ کنڈی'' کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے 26۔ ذیقعدہ 998ھ (15۔ ستمبر 1590ء) کو اپنے مسکن ہالہ کنڈی میں وفات پائی۔ یہ ترجمہ پندرھویں صدی ہجری کی تقریب کے موقعے پر سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد نے 1401ھ میں شائع کیا۔

دوسرا فارسی ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے کیا۔ ان کے ترجمہ وتفسیر کا نام فتح الرحمٰن ہے۔

فارسی زبان میں تیسرا ترجمہ حضرت حافظ محمد لکھوی نے کیا۔ لیکن ان کا یہ فرمان ہے کہ میرا ترجمہ دراصل شاہ ولی اللہ کا ترجمہ ہے۔ میں نے اس میں تغیر الفاظ کیا ہے۔ گزارش

---

❶ ملاحظہ ہو مضمون غیر منقسم پنجاب کے عظیم مصلح از مولانا معین الدین لکھوی، (براحوال الآخرت ص 143)

❷ الفیوض المحمدیہ ص 77۔

یہ ہے کہ تغیر الفاظ کا نام ہی ترجمہ ہے۔ بے شمار اہلِ علم نے بے شمار زبانوں میں ترجمے کیے۔ یہ سب ترجمے ایک دوسرے سے تغیر الفاظ کا نتیجہ ہیں۔ میں نے متعدد مقامات پر شاہ صاحب اور حافظ صاحب کے فارسی ترجموں کا تقابل کیا ہے۔ حافظ صاحب کا ترجمہ شاہ صاحب کے ترجمے سے زیادہ واضح ہے۔ یہ ترجمہ ان کی تفسیر محمدی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تفسیر بڑے سائز کی سات جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی میں قرآن کا پنجابی ترجمہ ہے جو پنجابی زبان میں قرآن کا اولیں ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے پنجابی زبان میں قرآن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ پنجابی نظم میں حافظ صاحب نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ کسی زمانے میں یہ تفسیر بہت چھپی اور بہت پڑھی گئی۔ پنجاب میں اس کی بہت مانگ تھی۔ خطیب اور واعظ بالخصوص اس کی روشنی میں خطبہ دیتے اور وعظ فرمایا کرتے تھے۔ لوگ اس سے بے حد مستفید ہوتے تھے۔

ابوداؤد کے حواشی

حضرت حافظ محمد لکھوی نے 1271ھ میں صحاحِ ستہ کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد پر عربی میں حواشی لکھے۔ حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی فرماتے ہیں کہ جب انھوں نے ابوداؤد کی شرح عون المعبود لکھنا شروع کی تو حافظ محمد لکھوی کے حواشی ان کے سامنے تھے اور انھوں نے ان حواشی سے استفادہ کیا۔[1] یہ حواشی 1272ھ میں چھپ بھی گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برصغیر کے علمی حلقوں میں حضرت حافظ صاحب کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ان کی قلمی کاوشوں کو انتہائی لائق اعتماد قرار دیا جاتا تھا۔ وہ فارسی میں لکھتے یا عربی اور پنجابی میں ان کی سب تحریروں کو یکساں قابلِ پذیرائی گردانا جاتا تھا۔

حواشی مشکوٰۃ المصابیح

حافظ صاحب نے 1272ھ میں مشکوٰۃ شریف پر عربی میں حواشی تحریر فرمائے۔

[1] عون المعبود (شرح ابوداؤد) جلد اول ص 2

تحقیقی حلقوں میں ان حواشی کو بھی بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور جس سال مکمل ہوئے، اسی سال ان کی طباعت کا مرحلہ طے ہو گیا۔

حافظ محمد لکھوی پنجاب کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے مشکوٰۃ کے عربی میں حواشی لکھے۔ مشکوٰۃ شریف حدیث کی ایک اہم ترین کتاب ہے جو صدیوں سے برصغیر کے نصاب درس میں شامل ہے۔ سنن ابوداؤد کے عربی حواشی لکھنے والے بھی حافظ صاحب پہلے پنجابی عالم ہیں۔

بہر حال حافظ محمد لکھوی کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی دولت سے بھی نوازا اور تحریر و نگارش کے اوصاف بھی ان کی ذات میں ودیعت فرمائے۔ ان کا قلم ہر موضوع کے اظہار کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا اور وہ اپنے عہد کی تینوں زبانوں (عربی، فارسی، پنجابی) میں لکھنے پر قادر تھے۔ پھر ان کا حلقۂ قارئین بھی بہت پھیلا ہوا تھا اور ان سے استفادہ کرنے والے کثیر تعداد میں موجود تھے۔

بعض دیگر تصانیف

مذکورہ کتب و حواشی کے علاوہ حافظ صاحب نے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں انواعِ محمدی، احوال الآخرت، زینت الاسلام، دین محمدی (جس کا ایک نام محامد الاسلام ہے)، ردّ نیچری، محاسن الاسلام (یا عقائد محمدی) وغیرہ شامل ہیں۔ پھر بعض پنجابی نظم کی کتابوں پر انھوں نے حواشی بھی لکھے، جن میں انواع عبداللہ لاہوری اور مولانا نور محمد سوتری کی شہبازِ شریعت شامل ہیں۔ حافظ صاحب بہ درجہ غایت صاحبِ نظر اور وسیع الجہات مصنف تھے۔ انھوں نے مختلف زبانوں میں اسلام کی جو خدمت کی اور جس نہج سے حالات کے مطابق دینی مسائل کی وضاحت فرمائی، اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

وہ پنجاب کے رہنے والے تھے اور پنجاب کے لوگوں کی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے، انھوں نے عربی اور فارسی کے جلیل المنزلت عالم ہونے کے باوجود پنجابی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ان کے زمانے میں پنجابی اشعار سے لوگ خاص طور سے دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مخاطبین کو اشعار کی صورت میں سمجھانے کی کوشش کی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔

صرف ونحو پر عبور

حافظ صاحب کو صرف ونحو کے علوم پر بھی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کام کیا اور متعدد رسائل لکھے۔ ان رسائل میں ایک رسالہ (بلکہ کتاب) ابواب الصرف ہے۔

اسی سلسلے کا ایک چھوٹا سا رسالہ قوانین الصرف ہے، جس میں فارسی اشعار میں علم صرف کے قوانین وقواعد بیان کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں (ابواب الصرف اور قوانین الصرف) طلبا کو زبانی یاد کرائی جاتی ہیں۔ یہ یاد ہو جائیں تو عربی زبان کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ رسالہ قوانین الصرف سے پتا چلتا ہے کہ فارسی شاعری میں بھی حافظ صاحب کا مقام بڑا بلند ہے۔

حافظ محمد لکھوی کے بعد لکھوی علما ومدرسین کو صرف ونحو کے بارے میں مستند سمجھا جاتا ہے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کو تو اس موضوع پر امامت کا درجہ حاصل تھا اور بڑے بڑے اصحابِ علم اس ضمن میں ان سے رجوع کرتے اور مشکل ترین مسائل سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

حافظ محمد صاحب نے جس طرح تفسیر محمدی کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی، اسی طرح وہ صحیح بخاری کا ترجمہ وشرح لکھنا چاہتے تھے، لیکن افسوس ہے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ وفات پا گئے۔

سادہ زندگی

حافظ صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وعظ وتقریر کے لیے آسان زبان استعمال کرتے اور ایسا انداز اختیار فرماتے جسے سب لوگ سمجھ سکیں۔ مولانا محمد علی لکھوی کے بقول ان کا رہن سہن بھی سادہ تھا اور عام گفتگو میں بھی سادگی سے کام لیتے تھے۔ کسی قسم کا کوئی تکلف کسی معاملے میں نہ تھا۔ رشتے داروں اور غیر رشتے داروں سب سے ہم دردانہ سلوک روا رکھتے اور ہر ایک سے نرم زبان میں مخاطب ہوتے۔

مدرسے کا اجرا

واقعات سے پتا چلتا ہے کہ لکھو کے میں مدرسہ تو حافظ احمد صاحب کے زمانے سے

جاری تھا، لیکن اس کا نام ''مدرسہ محمدیہ'' حافظ بارک اللہ اور حافظ محمد نے 1840ء یا شاید اس سے بھی پہلے رکھا، جس میں وہ خود اور بعض دیگر لکھوی علمائے کرام طلبا کو تعلیم دیتے تھے۔ اس مدرسے اور اس کے بانیوں کے بارے میں ایک بزرگ سید نثار علی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''یہ بہت نیک اور مشہور لوگ ہیں۔ ذی علم ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں۔ اکثر لوگ انھیں وہابی کہتے ہیں۔ دیہہ ھذا میں ان کے خاندان میں عالم ہوتے رہے ہیں اور مولوی صاحب حافظ محمد کے باعث چرچا علم بھی [بہت] اچھا رہتا ہے، بلکہ بعض طلبا سوائے فارسی کے علمِ عربی بھی تحصیل کرتے ہیں اور ان کو سرکار ممدوٹ کی طرف سے دو چاہ معافی ملے ہوئے ہیں، گاؤں کچا ہے مگر وہاں کی مسجد پختہ ہے جو حافظ محمد صاحب کے اہتمام میں فیض بخش قوم کمبوہ ارائیں ساکن فیروز پور تھانیدار ضلع نے تعمیر کرائی ہے۔'' [1]

اس مدرسے کے اجراء پر کم وبیش تین سو سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے۔ اس عرصے میں اس میں لاتعداد اصحابِ علم نے اخذِ فیض کیا، جن میں قدیم دور کے حضرات میں سے مولانا عبدالرحیم غزنوی، مولانا عبداللہ بن عبداللہ غزنوی، مولانا احمد علی غزنوی، مولانا محمد یحییٰ غزنوی، مولانا عبدالوہاب دہلوی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، مولانا عبداللہ اوڈو وغیرہ بزرگوں کے نام آتے ہیں۔ پھر سید مولا بخش کوموی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ محمد اسحاق (حسین خاں والا) حافظ محمد بھٹوی، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی اور دیگر بے شمار حضراتِ گرامی ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد یہ مدرسہ پاکستان کے شہر اوکاڑہ میں منتقل ہوا جو جامعہ محمدیہ کے نام سے جاری ہے۔

تلامذہ گرامی

لکھو کے میں خود حافظ محمد لکھوی سے جن لوگوں نے تحصیل علم کی، انھیں گنتی شمار میں

[1] تاریخ پرگنہ مکتسر وممدوٹ ص 8۔ از سید نثار علی۔ مطبوعہ وکٹوریہ پریس، لاہور۔ 1873ء۔

لا نا ممکن نہیں۔ ان میں ان کے فرزندانِ گرامی قدر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، مولانا محمد حسن لکھوی اور مولانا محمد حسین لکھوی کے علاوہ مولانا عبدالقادر لکھوی، مولانا غلام نبی ربانی سوہدروی، مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی، مولانا عبدالغنی دہلوی، مولانا رحیم بخش لاہوری (مصنف اسلام کی کتاب جلد اول تا جلد چودہ) مولانا خدا بخش واعظ اور دوسرے بہت سے اصحابِ فضل شامل ہیں۔

وفات

آخر عمر میں حافظ صاحب کی بصارت جواب دے گئی تھی اور مثانے میں پتھری پیدا ہوگئی تھی۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔ پھر فیروز پور کے سرکاری ہسپتال میں آپریشن کرایا گیا، لیکن آپریشن کامیاب نہ ہوا۔ بالآخر اسی مرض سے 27۔اگست 1893ء (13۔صفر 1311ھ) کو وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے ایک ارادت مند بزرگ مولانا الٰہی بخش تھے جو موضع کلیر کلاں متصل منڈی ہیرا سنگھ ضلع اوکاڑہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے پنجابی نظم میں ایک کتاب ''کرامت نامہ'' لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے جو حضرت حافظ محمد لکھوی کے وفات کے بعد پیش آیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ حافظ صاحب کی قبر کچھ نشیب میں تھی۔ تدفین سے ڈیڑھ برس بعد اس میں پانی بھر گیا۔ لوگوں کو اس کا پتا چلا تو ایک عالم دین کے کہنے سے قبر کھولی گئی۔ دیکھا تو حضرت کا جسم مبارک صحیح سلامت تھا۔ کسی قسم کا داغ دھبا نہ تھا۔ جسم کو قبر سے نکالا گیا اور نیا کفن پہنا کر انھیں دفن کیا گیا۔ [1]

---

[1] الفیوض المحمدیہ ص 80 بحوالہ کرامت نامہ ص 97

اولاد

حضرت حافظ صاحب کی نرینہ اولاد چھ بیٹے تھے۔ فتح دین، محمد حسن، محمد حسین، محی الدین عبدالرحمٰن، زین العابدین اورنورالدین۔سب بیٹے علمائے دین تھے۔

تین بیٹیاں تھیں علی الترتیب ان کے نام یہ تھے کلثوم، رقیہ، سائرہ۔

بڑی بیٹی کا نکاح ایک بزرگ صوفی ولی محمد سے ہوا۔

دوسری بیٹی استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے عقد میں آئیں۔

تیسری بیٹی مولوی نورمحمد ساکن موضع موکل ضلع قصور سے بیاہی گئیں۔



چوتھا باب

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حافظ محمد لکھوی کے فرزندِ گرامی مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حالات پنجابی نظم میں ''تحفہ واعظ'' کے عنوان سے ان کے ایک شاگرد اور مرید مولانا خدابخش واعظ نے لکھے۔ یہ بڑے سائز کا اٹھارہ صفحات کا ایک رسالہ ہے جو آج سے تقریباً سوا سو سال قبل 1313ھ میں مطبع وزیر ہند میں چھپا۔ اس رسالے کی فوٹو کاپی ازراہ کرم مجھے مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروزپوری (ساکن حجرہ شاہ مقیم) نے عنایت فرمائی۔ اس پر میں ان کا شکرگزار ہوں۔ کاغذ بہت پرانا اور بوسیدہ ہونے کی وجہ سے فوٹو کاپی مدھم آئی ہے اور اسے پڑھنا مشکل ہے تاہم میں نے دو تین مرتبہ اسے پڑھا تو مطالب واضح ہوگئے۔ اس میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کے علاوہ بھی متعدد لکھوی علماء اور دیگر حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تحفۂ واعظ کے علاوہ بھی اس عہد کی چند پنجابی نظم کی کتابوں میں نہایت عقیدت و محبت سے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اردو کتابوں میں بھی ان کے مریدوں اور شاگردوں نے ان کے واقعاتِ زندگی تحریر کیے۔ لیکن ان کتابوں کا ملنا اب بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ان کے عقیدت مند زبانی بھی ان کی بہت سی باتیں سنایا کرتے تھے، خود مجھے بھی چھوٹی عمر میں ان کے چند مبایعین کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی زبان سے اس عظیم القدر عالم سے متعلق ارشادات سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ولادت اور تعلیم

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن 1253ھ (1837ء) میں بمقام لکھوکے پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ یعنی قرآن مجید سمیت علمِ نحو کی انتہائی کتاب کافیہ تک کتابیں اپنے والدِ محترم سے پڑھیں۔ پھر مزید تعلیم کے لیے دہلی کا عزم کیا۔ ان کے والدِ گرامی حافظ محمد لکھوی بھی بیٹے کے ساتھ دہلی گئے۔ وہاں قاضی بشیر الدین قنوجی سے قطبی، میر قطبی، صدرا، میبذی، حمداللہ، نورالانوار وغیرہ کتابوں کی تکمیل کی۔ مفتی صدرالدین آزردہ سے بھی مختلف فنون کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا نوازش علی سے بھی کسبِ فیض کیا۔ حضرت میاں سید نذیر حسین کے بابِ ادب پر بھی دستک دی، ان سے درسِ حدیث لیا اور حصولِ سند کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔

مردِ کامل کی تلاش

دہلی اور دیگر مقامات کے جلیل المرتبت اساتذہ سے استفادے کے بعد وطن تشریف لائے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کا آغاز 10۔مئی کو ہوا تھا، حضرت ممدوح اس سے پہلے ہی صرف سترہ (17) سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ اپنے اسلاف کی طرح بے حد ذہین بھی تھے اور بہ درجہ غایت زاہد و عابد بھی۔ کچھ عرصہ لکھوکے میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ذہن میں زہد و عبادت کے آثار تیزی سے کروٹ لینے لگے تھے۔ ایک دن خواب میں قرآن کی یہ آیت سامنے آئی۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

(اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائیں اور یہ کہ میں نیک کام

کرتا رہوں جس سے تو خوش ہو، اور آخرت میں مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائیو۔) (النمل:19)

اس سے کچھ دن بعد خواب میں یہ آیت دکھائی دی

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل: 8)

(اور تو اپنے رب کا نام لے اور سب طرف سے منقطع ہو کر صرف اسی کا ہو جا)

اب کسی ولی اللہ سے ملنے اور مردِ کامل سے حصولِ فیض کا شدید جذبہ دل میں ابھرا۔ اسی اثنا میں مولانا غلام رسول قلعوی اور ان جیسے بعض صلحاء سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ غزنی کے رہنے والے حضرت سید عبداللہ غزنوی کا شمار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے اور ان کا چشمۂ فیض جاری ہے۔ اس سے سیراب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب حضرت سید عبداللہ صاحب سے ملاقات کے لیے دل میں آرزو بھڑکی اور استخارہ کر کے حضرت ممدوح کے قصرِ صالحیت پر حاضری کا عزم کیا۔

ان کے ایک شاگرد اور مرید مولانا الٰہی بخش تھے جو موضع کلیر متصل منڈی ہیرا سنگھ (ضلع اوکاڑہ) کے رہنے والے تھے۔ وہ مولانا ممدوح کے عقیدت مند تھے۔ سفر و حضر میں بالعموم ان کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ ان کے والد مکرم حافظ محمد لکھوی کے بھی شاگرد تھے۔ مولانا نے ان سے اپنے ساتھ غزنی جانے کے لیے بات کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔

غزنی کو روانگی

یہ آج سے کم و بیش ایک سو ساٹھ (160) برس قبل (1275ھ۔ 1857ء) کا واقعہ ہے۔ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اس وقت بائیس برس کے جوانِ رعنا تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد مولوی الٰہی بخش کلیروی کو رفیقِ سفر بنایا اور حضرت سید عبداللہ غزنوی کے آستانہ فیض پر حاضری دینے اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے کی غرض سے غزنی کو روانہ ہوئے۔

اس وقت موجودہ دور کی طرح نہ سڑکیں تھیں، نہ موٹریں تھیں، نہ ریلیں چلتی تھیں۔ کچے

راستے، لوگ پیدل یا گھوڑوں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ یہ دونوں مسافرانِ راہِ حق لکھوکے سے چلے اور ملتان پہنچے۔ ملتان سے ڈیرہ اسماعیل خاں کا عزم کیا اور وہاں سے غزنی کو روانہ ہوئے جو افغانستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ راستے میں بلند و بالا پہاڑ بھی آئے، ندیاں نالے اور دریا بھی آئے۔ دور تک پھیلے ہوئے صحرا بھی عبور کیے۔ یہ طویل سفر انھوں نے تقریباً دو مہینوں میں طے کیا۔

استقبال

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی خاندانِ لکھویہ کے بزرگوں اور ہم عصر علمائے کرام کا بے حد احترام کرتے اور ان کے چھوٹوں سے شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی ان کے دادا تھے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں اس فقیر کو کئی دفعہ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے غزنی جانے اور حضرت عبداللہ صاحب سے ملنے کا واقعہ سنایا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ دادا صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوگیا تھا کہ پنجاب سے ایک تقویٰ شعار عالم دین آرہے ہیں۔ وہ غزنی کے قریب پہنچے تو حضرت عبداللہ صاحب ان کے استقبال کے لیے گئے اور جاتے وقت گھر میں فرمایا کہ ایک بزرگ آرہے ہیں، ان کے لیے اچھا سا کھانا تیار کرو۔ ''اچھا سا کھانا تیار کرو'' کے الفاظ کہہ کر مولانا داؤد غزنوی مسکراتے ہوئے فرمایا کرتے کہ اس سے مراد حلوہ یا بٹیر کا گوشت ہوگا۔

مولانا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حافظ محمد لکھوی نے زادِ راہ کے طور پر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کو سو روپے دیے تھے۔ سو روپے پر وہ خاص طور سے زور دیتے اور دو دفعہ فرماتے۔ ''سو روپے دیے، سو روپے''۔۔۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے مولانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں سو روپے بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی بڑی رقم کے مالک کو امیر آدمی سمجھا جاتا تھا۔۔۔ جہاں مرشد (سید عبداللہ غزنوی) پیکر حسنات تھے، وہاں ان کی بیعت کے لیے حاضر ہونے والے (مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی) بھی مجسمۂ خیر تھے۔

علمائے سو اور حضرت عبداللہ غزنوی

اس وقت غزنی اور افغانستان کے مختلف مقامات میں جہاں بے شمار لوگ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے دائرۂ عقیدت میں شامل تھے، وہاں ان کی تبلیغ توحید کی وجہ سے کچھ لوگ ان کے شدید مخالف بھی تھے۔ بالخصوص افغانستان کے علمائے سو ہر وقت ان کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے اور جو لوگ کسی علاقے سے ان کی خدمت میں حاضری کا قصد کرتے ان سے بھی ان کے خلاف باتیں کرتے اور انھیں حاضری اور حصولِ فیض سے روکنے کی کوشش کرتے۔

اس کا ذکر حضرت عبداللہ صاحب کے صاحب زادے حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی نے اپنی کتاب سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی میں کیا ہے۔

مخالفوں کی باتیں سن کر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن بہت متحیر ہوتے۔ اثنائے راہ میں انھیں ایک رات میں تین مرتبہ اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور قرآن مجید کی آیات ان کے پردۂ سماع سے ٹکرائیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ اپنا سفر جاری رکھو اور عبداللہ سے ملو۔ وہ بہت نیک شخص ہیں۔ اس کا ذکر حضرت سید عبداللہ صاحب کے فرزند گرامی حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی نے فرمایا ہے۔ ان کے فارسی الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے:

> ”مولوی عبدالرحمٰن بن شیخ محمد بن بارک اللہ جو اپنے دور کے علماء میں بہت مشہور عالم ہیں اور زہد و تقویٰ اور رشد و صلاح میں اپنے زمانے کے امام ہیں، وہ حضرت عبداللہ صاحب کی صحبتِ بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملک پنجاب سے سفر کر کے ملک غزنی تک گئے۔ یہ دو ماہ کی مسافت ہے جو انھوں نے طے کی۔ راستے میں انھوں نے حضرت مولانا کے متعلق مخالفوں سے جو باتیں سنیں، ان سے حیران ہوئے، چنانچہ اسی رات انھیں یہ الہام ہوا:
>
> فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ

(الذاریات:23)

(سو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی، وہ برحق ہے، اسی طرح جیسے کہ تم بات چیت کر رہے ہو)

دوسری مرتبہ یہ الہام ہوا:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (ص: 47)

(اور بے شک یہی لوگ ہمارے ہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں ہیں)

تیسری بار یہ الہام ہوا:

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (الزخرف: 59)

(وہ تو ہمارے ایک بندے ہیں، جن پر ہم نے فضل کیا) ❶

حضرت امام عبدالجبار صاحب غزنوی کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ اس طویل سفر کے مختلف مقامات میں بعض لوگوں نے حضرت سید عبداللہ غزنوی کے بارے میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے جو باتیں کیں، ان سے وہ پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے اور ان کے عقاید وافکار کے متعلق کئی قسم کے خیالات ان کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔ ان کی پریشانی اس وقت رفع ہوئی، جب اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی فرمائی اور قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات یکے بعد دیگرے بہ صورتِ الہام والقاء ان کے ذہن میں پیوست ہوئیں۔ ❷

محی الدین سے عبدالرحمٰن

حضرت سید عبداللہ صاحب نے بڑے احترام سے ان کا استقبال کیا اور انھیں گھر لے گئے۔ کھانا کھلایا اور ان سے گفتگو شروع ہوئی۔

❶ سوانح عمری حضرت عبداللہ غزنوی ص 2۔ ❷ میں نے اپنی ایک کتاب فقہائے پاک وہند تیرھویں صدی ہجری کی جلد دوم میں حضرت سید عبداللہ غزنوی پر طویل مضمون لکھا ہے جو کتاب کے صفحہ 147 سے 219 تک چلتا ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ 1984ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے چھپی تھی۔ بعد ازاں ۲۰۱۳ء میں کتاب سرائے لاہور نے شائع کی۔ اس میں اس قسم کے متعدد واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کے نصاب تعلیم میں بھی شامل رہی۔ لکھوی اور غزنوی خاندانوں کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بڑی مدد دیتی ہے۔

مولانا کے ساتھی مولانا الٰہی بخش کلیروی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے حضرت عبداللہ صاحب سے کہا کہ ان کے والد (حافظ محمد) پنجاب میں چراغ ہیں۔

حضرت نے فرمایا:

ایں آفتاب خواہد شد

(اگر وہ چراغ ہیں تو یہ آفتاب ثابت ہوں گے۔)

مولانا کا نام ان کے والد حافظ محمد لکھوی نے محی الدین رکھا تھا اور وہ اپنے حلقہ تعارف میں اسی نام سے مشہور تھے۔ حضرت عبداللہ صاحب نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے یہی نام بتایا۔ حضرت سید صاحب نے فرمایا والدین نے میرا نام محمد اعظم رکھا تھا، اگرچہ اعظم کا اطلاق نبی ﷺ کی ذات اقدس پر ہوتا ہے، لیکن میں نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ اس سے اللہ کی الوہیت اور بندے کی عبودیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کا نام محی الدین اچھا نام ہے۔ لیکن آپ اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیجیے۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن اللہ کے نزدیک پسندیدہ نام ہیں، چنانچہ اس دن سے انھوں نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا اور انھیں محی الدین عبدالرحمٰن کہا جانے لگا۔

مولانا نے حضرت سید صاحب کی بیعت کی، ان سے شب و روز میں پڑھنے کے لیے بہت سے وظائف سیکھے اور تین مہینے حضرت کی خدمت میں غزنی ان کا قیام رہا۔

حضرت عبداللہ صاحب کی بیعت کے بعد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کو اللہ کی طرف سے بشارت ہوئی۔

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ (التوبہ: 111)

(پس اس بیعت پر جو تم نے کی خوش ہو جاؤ)

پھر اللہ کی طرف سے الہام ہوا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا (الشوریٰ: 13)

(اللہ نے تمھارے لیے وہ دین مقرر کیا جس دین پر اس نے نوح علیہ السلام کو چلنے کا حکم دیا)

واپسی کی اجازت

اس وقت افغانستان کے علمائے سوء حضرت عبداللہ صاحب کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ اب مولانا لکھوی نے واپس وطن آنے کے لیے ان سے اجازت چاہی تو استخارہ کیا اور یہ آیت القا ہوئی۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا (البقرہ: 125)

(اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے ثواب اور امن کی جگہ بنا دیا)

اس آیت سے یہ اشارہ ملا کہ اب اپنے گھر جاؤ، وہی تمھارے لیے ثواب اور امن کا مقام ہے۔ وہاں تحمل اور بردباری کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کرو۔

اس کے بعد حضرت مولانا مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ لکھو کے سے غزنی تک آمدورفت اور وہاں قیام کی مدت چھ مہینے بنتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق مولانا ممدوح دو مرتبہ غزنی گئے اور حضرت سید صاحب سے بے حد فیض پایا۔

سلسلۂ بیعت

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے سب سے پہلے اپنے والد گرامی حضرت حافظ محمد لکھوی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ پھر غزنی جا کر حضرت سید عبداللہ صاحب غزنوی کی بیعت سے سعادت اندوز ہوئے۔ انھوں نے اپنے مرشد ملا حبیب اللہ قندھاری سے جو فیض پایا تھا، اس سے انھیں مطلع فرمایا۔

خود مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا سلسلۂ بیعت بھی جاری تھا۔ بیعت کرنے والے کو وہ درمیانی آواز سے کلمہ طیبہ پڑھاتے، استغفر اللہ کا ورد کراتے۔ یاحیّ یا قیوم برحمتك استغیث پڑھنے کی تاکید فرماتے۔ اکتالیس دفعہ روزانہ سورہ فاتحہ پڑھنے کی تلقین کرتے۔ [1]

حلیہ اور لباس

مولانا خدا بخش واعظ جوان کے شاگرد اور مرید تھے، پنجابی اشعار میں ان کا حلیہ اس

[1] تحفۂ واعظ از مولانا خدا بخش واعظ ص 2۔

طرح بیان کرتے ہیں: رنگ نہ بالکل سفید نہ سرخ (اسے گندمی رنگ کہنا چاہیے) میانہ قد، تھوڑا سا مائل بہ فربہی گوشت سے بھرا ہوا جسم۔ پنڈلیاں ابھری ہوئیں۔ پیشانی پر سجدے کا نشان، مہندی سے رنگین ڈاڑھی۔

لباس یہ تھا: تہبند یا لنگی، کرتہ۔ جمعے کے روز چوغہ پہنتے۔ سر پر ٹوپی اور ٹوپی پر تین چار گز کا عمامہ۔ سردیوں میں گرم واسکٹ۔ جوتی کبھی پوٹھوہاری، کبھی دوسری۔

مہمان نوازی

جو لوگ بہ طور مہمان آتے، ان کا کھانا اپنے گھر سے خود لاتے۔ اپنا کام خود کرتے، کسی کو اپنے کام کے لیے نہ کہتے۔ اپنے کپڑے خود ہی دھو لیتے۔ مجلس میں نمایاں ہو کر نہ بیٹھتے۔ کوئی مہمان جانا چاہتا تو اسے رخصت کرنے کے لیے چند قدم اس کے ساتھ جاتے اور رخصت کرتے وقت یہ دعا پڑھتے: **استودع الله دينك وامانتك واخر عملك۔** [1]

زبان ہر وقت ذکر الٰہی سے تر رہتی۔ سب سے نرم الفاظ میں بات کرتے۔ آنے والوں کو پیار کے لہجے میں برائی سے رکنے اور نیک کام کرنے کی تاکید فرماتے۔

نماز میں خشوع وخضوع

نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ نمازی کو ان دعاؤں کے معنوں سے بھی آگاہ ہونا چاہیے جو وہ نماز میں پڑھتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نواب وحید الزماں خاں حیدر آبادی تحریر فرماتے ہیں:

> ”ہمارے شیخ اتقی زماں مولوی عبدالرحمٰن صاحب ساکن لکھو کے رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص نماز کے معنی نہیں جانتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جو شخص اس مسئلے میں ان کے خلاف اصرار کرتا تو اس سے مباہلے پر تیار ہو جاتے۔“ [2]

---

[1] تحفۂ واعظ از مولانا خدا بخش واعظ ص 2۔

[2] تسہیل القاری (اردو ترجمہ صحیح بخاری) (پارہ پنجم ص 140، 141۔ طبع اول لاہور۔)

مرزا قادیانی کے متعلق الہامات

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا وہ زمانہ تھا جب کہ انگریز کے ذہنِ فتنہ پرور نے قادیانیت کا فتنہ پیدا کر دیا تھا اور مرزا غلام احمد قادیانی نے مجدد، مسیح اور مثلِ مسیح وغیرہ دعاوی سے گزرتے ہوئے، نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس وقت مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم ومغفور نے مرزا قادیانی کے افکار کو ترتیب دے کر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں پیش کیا اور ان سے فتویٰ پوچھا کہ ان افکار کا حامل شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے یا نہیں؟ حضرت میاں صاحب نے اسے کافر قرار دیا اور پھر مولانا محمد حسین بٹالوی نے اس فتوے پر ملک کے کم وبیش دو سو علما کی مہریں لگوائیں اور دستخط کرائے۔ اسے ''اوّلین فتوائے تکفیر'' کہا جاتا ہے۔ اس پر مرزا قادیانی نے اپنی چھوٹی بڑی مختلف کتابوں میں بڑا شور مچایا اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے بارے میں کہا کہ وہ ''اول المکفرین'' ہیں یعنی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔

اسی زمانے میں حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے یہ بتا کہ مرزا قادیانی کا کیا معاملہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے خواب میں بہ صورت الہام فرمایا:

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ (قصص: 8)

(بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر غلط کار تھے)

اس سے یہ مطلب اخذ کیا گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا تعلق فرعون اور ہامان اور ان کے گروہ سے ہے اور جس طرح وہ کافر اور اللہ کے نافرمان تھے، اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین کافر اور احکامِ الٰہی کے منکر ہیں۔

مرزا کے بارے میں پھر الہام ہوا۔

وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (النساء: 120)

(اور شیطان ان سے جو وعدہ کرتا ہے وہ سراسر دغا ہے)

پھر الہام ہوا

وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا (الکھف: 106)

(اور انھوں نے میری آیتوں اور میرے رسولوں کی ہنسی اڑائی)

مرزا قادیانی کے بارے میں ایک اور الہام ہوا۔

وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا (النبا: 28)

(اور وہ ہماری آیتوں کو قطعی طور سے جھٹلاتے ہیں)

ایک اور الہام:

هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (النساء: 151)

(یہی لوگ ہیں جو پکے کافر ہیں)

ایک اور الہام ملاحظہ ہو:

وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا (الکھف: 57)

(اے پیغمبر! تو اگر انھیں ہدایت اختیار کرنے کی دعوت دے تو وہ کبھی ہدایت یاب نہیں ہوں گے)

ایک دفعہ فرمایا: دعا کردم یا اللہ حکم تو در بارہ مرزا چیست؟

الہام شد: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (النساء: 151)

(میں نے دعا کی یا اللہ! مرزا کے بارے میں تیرا کیا ارشاد ہے؟

الہام ہوا: یہ لوگ پکے کافر ہیں۔)

اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے بہت سے الہام ہیں۔ [1]

[1] (تفصیل کے لیے دیکھیے عصاء موسیٰ علیہ السلام مظہر حقیقۃ البیعت والالہام فی جواب رسالہ ضرورت الامام۔ مطبوعہ جمادی الاولیٰ 1318ھ مطابق ستمبر 1900 مطبع انصاری دہلی۔)

مرزا قادیانی کے بارے میں چند اور باتیں

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے ایک عقیدت مند اور شاگرد مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی نے اپنی دو کتابوں (ایقاظ غفلاء الزمان اور اربعین مظہری) میں حضرت مولانا لکھوی کے واقعاتِ زندگی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اربعین مظہری 1313ھ (1896ء) میں چھپی۔ اس کتاب میں مرزا غلام قادیانی کے بارے میں چند اور باتیں پڑھیے۔

- ایک دفعہ حضرت ممدوح کی مجلس میں اس بات کا ذکر ہوا کہ مرزا ملائکہ کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا "اسے کہو کہ میرے پاس آئے۔ ہم اسے اس کی آنکھوں سے فرشتہ اترتا ہوا دکھا دیں گے۔" پھر بذریعہ رجسٹری خود حضرت مولانا نے اور آپ کے بعض خدام نے مرزا کو لکھا کہ "تو ایک امر مقرر کر لے جس کا وقوع زمانے کے عقلاء کے نزدیک خارج از طاقت ہو اور وہ نشان مانا آسمانی جاوے، پھر اگر تو سچا ہے تو اس کو دس ہفتے میں دکھلا دے، ورنہ ہم اسی امر مقرر شدہ کو پانچ ہفتے میں دکھلا دیں گے۔"
- یہ بھی مرزا غلام احمد کو لکھا کہ "تو اور میں ایک کوٹھڑی میں بند ہو جاتے ہیں۔ دو گھڑی بعد اگر باہر نکلتے ہی تو نے اپنے عقائد جدیدہ سے توبہ نہ کی اور انہی پر مصر رہا تو سمجھو تو سچا ہے اور ہم تیری بیعت کر لیں گے۔"

حضرت کی بیان فرمودہ یہ بات "ایقاظ غفلاء الزمان" میں چھپی اور مرزا نے پڑھی، لیکن وہ ایسا مبہوت ہوا کہ اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

- حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے کہ "مرزا اگر ہمارے مقابلے میں آوے تو قسم ہے خدا کی جب تک خدا ہمارے درمیان فیصلہ نہ کرے تو ہم مصلے پر سے قدم نہ اٹھا دیں۔" [1]
- بعض مرزائیوں نے کہا کہ مرزا دین کی مدد اور نصاریٰ کا رد کرتا ہے۔ فی الفور الہام ہوا:

---

[1] اربعین مظہری صفحہ 58۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا

(الفرقان:23)

(اور انھوں نے جو کام کیے، ان پر ہم متوجہ ہوں گے اور ان کو اڑتی خاک کی طرح کر دیں گے) ❶

- اس سلسلے میں مرزائیوں کی طرف سے شورش کی اطلاع ملی تو اللہ کی طرف سے القا ہوا:

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (ص:11)

(لشکروں میں سے یہ بھی ایک چھوٹا سا لشکر ہے جو یہیں شکست کھائے گا۔) ❷

- مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص کے متعلق بتایا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا کہ اس نے لاہور کی مسجد لسوڑیاں والی میں، مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی موجودگی میں مرزا کی کفریات سے بیزار ہو کر میرے ہاتھ پر بیعت کی۔ ❸

مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی نے اپنی کتابوں (ایقاظ غفلاء الزمان اور اربعین مظہری) میں مولانا لکھوی سے متعلق بہت سی باتیں بیان کی ہیں جو لائق مطالعہ ہیں۔

مولانا کے بارے میں حضرت عبداللہ غزنوی کے ارشادات

مولانا عبدالحق مالیر کوٹلوی نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے ”تقریباً عمر 22 سال میں غزنی پہنچ کر حضرت عبداللہ صاحب سے بیعت طریقت کی۔“ ❹

- وہ لکھتے ہیں: ”آپ غزنی میں جب اوّل اوّل بخدمت مولانا عبداللہ صاحب حاضر ہوئے تو انھوں نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا:

---

❶ اربعین مظہری (ص 59)

❷ ایضاً

❸ ایضاً (ص 54)

❹ ایضاً ص 59۔

درمیان ماوشما مناسبت درروزازل بود ❶

(ہمارے اور آپ کے درمیان روز ازل میں مناسبت قائم ہوگئی تھی)

✿ حضرت کے رفیق سفر (مولانا الٰہی بخش کلیروی) نے حضرت عبداللہ صاحب سے ان کے متعلق عرض کیا کہ ''ان کے والد پنجاب میں چراغ ہیں تو حضرت عبداللہ صاحب نے آپ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: این آفتاب خواہد شد'' ❷

یعنی والد چراغ ہیں تو ان کے یہ بیٹے آفتاب ثابت ہوں گے۔

حضرت کا یہ فرمان بالکل صحیح ثابت ہوا۔ وہ واقعی آفتابِ ہدایت تھے۔

✿ اجازتِ طریقت دینے کے لیے حضرت عبداللہ صاحب نے استخارہ فرمایا تو الہام ہوا:

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا (البقرہ: 125)

(اور جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے ثواب اور امن کی جگہ ٹھہرایا۔)

مطلب یہ کہ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا گھر ان کی بیعت کے لیے آنے والوں کے لیے روحانی سکون اور حصول اجر کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

مولانا فرماتے ہیں: ''حضرت عبداللہ صاحب کے اس الہام کی برکت وصداقت کی وجہ سے میرا کوئی یار اور عقیدت مند دامِ کیدِ قادیانی میں نہیں پھنسا اور مرزا کے بہت سے مرید اس کے کفر وارتداد سے بیزار ہو کر ہمارے زمرے میں داخل ہوئے۔'' ❸

✿ حضرت مولانا لکھوی، حضرت عبداللہ صاحب کے حلقہ بیعت میں شمولیت کے بعد غزنی سے رخصت ہونے لگے تو حضرت نے فرمایا:

---

❶ اربعین مظہری ص 54

❷ ایضاً

❸ ایضاً

''یک بار ضرور بیا۔'' ❶

(ایک مرتبہ ضرور دوبارہ آنا)

❁ پھر جب وہ غزنی سے ہجرت کر کے کچھ دن پشاور ٹھہرے تو مولانا لکھوی ان کی زیارت کے لیے لکھوکے سے پشاور گئے۔ حضرت ممدوح دور سے ان کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور گلے لگا کر فرمایا

نور علیٰ نور شد (نور پر نور ہوا)

❁ ایک دفعہ مولانا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

ایں برادر ما است وحبیب اللہ استادِ ما بود۔ مارا گفت مربی شما خدائے تعالیٰ است۔

(یہ ہمارے بھائی ہیں اور (ملا) حبیب اللہ (قندھاری) ہمارے استاد تھے۔ انھوں نے ہمیں کہا تھا کہ آپ کا مربی اللہ تعالیٰ ہے۔)

❁ ایک مرتبہ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے حضرت سید عبداللہ غزنوی نے فرمایا:

امشب مولوی اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نزدِ ما نشستہ بود شما باشید، شمارا خدائے تعالیٰ شجاعت نصیب خواہد کرد ❷

(آج رات خواب میں مولانا اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ میرے پاس تشریف فرما تھے۔ آپ بھی وہیں ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ جرأت نصیب فرمائے گا)

مولانا اسماعیل شہید دہلوی مراد ہیں۔ ان کا وجود استعارہ ہے اس جرأت سے جو کلمۂ حق بلند کرنے کے سلسلے میں حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی میں پائی جاتی تھی۔

❁ ایک شخص نے مولانا لکھوی سے کوئی وظیفہ پوچھا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ صاحب سے بھی وہی وظیفہ پوچھا اور انھیں بتا بھی دیا کہ یہ وظیفہ اس نے مولانا محی الدین

❶ اربعین مظہری ص 54

❷ ایضاً ص 55

عبدالرحمٰن سے بھی پوچھا تھا۔

فرمایا: ماوعبدالرحمٰن یکے است۔ ❶

(ہم اور عبدالرحمٰن ایک ہی ہیں)

اپنے متعلق بشارتیں

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کی بعض بشارتوں کا تعلق خود ان کی اپنی ذات گرامی سے بھی ہے۔ مثلاً

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

(اے اطمینان سے رہنے والی جان تو اپنے رب کی طرف لوٹ جا، تو اس سے خوش، وہ تجھ سے خوش۔ میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا، اور میری جنت میں داخل ہو جا) (الفجر: 27تا 29)

یہ کیسی عمدہ ترین بشارت ہے جو اس طرح پوری ہوئی کہ وہ بیت اللہ شریف میں گئے اور اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے حکم کے مطابق اس کا طواف کیا۔ پھر مدینہ منورہ میں حاضری دی اور مسجد نبوی میں حالت سجدہ میں وفات پا گئے۔ جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔

* الہام ہوا یا اللہ کی طرف سے خوش خبری سنائی گئی۔

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (البقرہ: 124)

(میں تجھے لوگوں کا امام (سربراہ) بناؤں گا)

❶ یہ الہامات یا بشارتیں اربعین مظہری میں مرقوم ہیں، دیکھیے ص 55

اور وہ واقعتاً صالحین کے سربراہ اور امام تھے۔ اس خاندان میں سربراہی اور امامت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

* الہام ہوا: عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل: 79)

(قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود تک پہنچا دے)

اللہ نے انھیں بیت اللہ اور مسجد نبوی تک پہنچایا اور لوگوں نے ان کے محامد و محاسن بیان کیے۔

* بشارت ہوئی: عد نفسك من اصحاب رسول اللّٰه ﷺ۔

(اپنے آپ کو نبی ﷺ کے صحابہ میں شمار کرو)

وفات کے بعد انھیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا، جہاں بے شمار صحابہ کرام مدفون ہیں، اس طرح ان کا ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی پاک باز جماعت میں ہوا۔

* دعا یا جامع الناس لیوم لا ریب فیه فاجمع بینی وبین محمد فی الدنیا والاخرہ۔

(اے لوگوں کو اس دن میں جمع کرنے والے، جس میں کوئی شک نہیں، مجھے دنیا اور آخرت میں محمد ﷺ کے ساتھ جمع فرما دے)

ان شاء اللہ یہ دعا قبول ہوگی اور انھیں نبی ﷺ کی رفاقت نصیب ہوگی۔

* الہام ہوا: ورضوان اللّٰه اکبر

(اللہ کی رضامندی سب سے بڑھ کر ہے)[1]

فرید کوٹ میں مناظرہ

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے لاتعداد واقعات مختلف کتابوں میں مرقوم ہیں، جن میں ایک واقعہ فرید کوٹ میں مناظرے کا ہے، جو احناف اور اہل حدیث کے درمیان

---

[1] اس قسم کی بشارتوں اور الہامات والقا کے لیے دیکھیے اربعین مظہری صفحہ 56، 57، 58۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ایقاظ عقلاء الزمان ص 18 تا 21۔ اس میں اربعین مظہری سے زیادہ بشارتوں کا ذکر ہے۔

ہوا تھا۔ یہ مناظرہ 3۔جنوری 1883ء کو شروع ہوا تھا اور کئی مہینے جاری رہا تھا۔ مناظرے کا اہتمام اس دور کی ریاست فرید کوٹ کے حکمران راجا بکرم سنگھ نے کیا تھا، اسی کی صدارت میں مناظرہ ہوا تھا اور اس کے تمام اخراجات اسی نے برداشت کیے تھے۔ وہ اس قسم کے خالص دینی مباحث سے دلچسپی رکھتا تھا۔

مناظرے کا موضوع حسب ذیل پانچ مسائل تھے۔

1۔ بے نماز کی نمازِ جنازہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

2۔ تقلید شخصی

3۔ رفع الیدین

4۔ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا

5۔ آمین بالجہر

مناظرے میں اہل حدیث اور احناف دونوں فریقوں کے سولہ سولہ علماء شامل تھے۔ یعنی شریک مناظرہ علماء کی کل تعداد بتیس (32) تھی۔ احناف کی طرف سے مناظر مولانا احمد حسن جالندھری تھے اور اہل حدیث کی طرف سے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی۔ ان کی غیر موجودگی میں مناظرہ مولانا عبدالقادر لکھوی یا مولانا نور احمد لکھوی کرتے تھے۔ راجا فرید کوٹ باقاعدگی سے مناظرے میں شامل ہوتا اور بڑے غور سے پوری کارروائی سنتا۔ علمائے کرام کی گفتگو اور ان کی حرکات وسکنات پر بھی نگاہ رکھتا۔

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے دو عمل خاص طور پر راجا فرید کوٹ کے مرکز توجہ رہے۔

ایک یہ کہ تمام علمائے کرام کو کھانا راجا صاحب کی طرف سے دیا جاتا تھا اور وہ اسی کے دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے، لیکن مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اور ان کے بڈھیمال کے رہنے والے ایک مرید حاجی نور الدین وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس وقت فرید کوٹ میں موضع بڈھیمال کا ایک حجام رہتا تھا۔ ان دونوں نے کھانے کے پیسے اسے دے دیے تھے۔ وہی ان

کا کھانا تیار کرتا تھا اور یہ اس کے گھر میں اپنی گرہ سے کھانا کھاتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ جب مجلس مناظرہ میں راجا صاحب آتے تو علمائے کرام سمیت تمام حاضرین اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے لیکن مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ راجا صاحب نے مولانا سے کھڑے نہ ہونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا ہمارے مذہب میں غیر مسلم کی تکریم کرنا اور ادب سے اس کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں۔

مولانا کے یہ الفاظ سن کر راجا خاموش ہو گیا اور اس کے بعد وہ لوگوں کو اکثر یہ واقعہ سنایا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک عالم دین مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کو دیکھا ہے جو صحیح معنوں میں اپنے مذہب پر عامل تھے۔ [1]

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے مولانا ممدوح کا پاکیزہ ترین عکسِ حیات واضح طور سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

تصانیف

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے بہت سی مصروفیات کے باوجود بعض تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ حل مشکلات ایساغوجی: اثیر الدین ابہری (متوفی 663ھ) کی تصنیف ''ایساغوجی'' جو علم منطق کی ابتدائی کتاب ہے، کسی زمانے میں دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہی۔ مولانا ممدوح نے عربی میں اس کے مشکل مقامات کی وضاحت فرمائی۔

2۔ حاشیہ کشف المبہم مافی المسلّم: مولانا لکھوی کے استاذِ محترم قاضی بشیر الدین محدث قنوجی نے قاضی محبّ اللہ بہاری کی کتاب مسلم الثبوت کی شرح کشف المبہم

---

[1] الفیوض المحمدیہ ص 184 تا 187

اس زمانے میں ہندوستان کے شہر مدراس سے ''شمس الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا۔ اس کی جلد پنجم کے شمارہ نمبر 26 (بابت جون 1883/ شعبان 1300ھ) میں اس مناظرے کی تفصیل چھپی تھی۔

کے نام سے لکھی تھی۔ مولانا موصوف نے اس پر حاشیہ تحریر فرمایا۔

3۔ شرح شرح الوقایہ: مولانا نے عربی زبان میں علم فقہ کی مشہور درسی کتاب شرح الوقایہ کی شرح لکھنا شروع کی تھی، لیکن مکمل نہ ہو سکی۔

4۔ حاشیہ مختصر المعانی

5۔ ردِ وظیفہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیأً للہ

6۔ ترجمہ اربعین نووی (بزبان پنجابی)

7۔ نماز کا پنجابی ترجمہ

8۔ محامد الاسلام

جیسا کہ اختصار کے ساتھ گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے محاسن سے نوازا تھا۔ وہ مبلغ اسلام، مستجاب الدعوات، صاحبِ کرامات اور ولی اللہ تھے۔ ان اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ وہ مصنف بھی تھے، لیکن افسوس ہے ان کی تصانیف دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

حج بیت اللہ کے لیے روانگی

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی حج بیت اللہ کی شدید خواہش رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پہنچیں اور ان مقدس مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل کریں جہاں اللہ کے رسول ﷺ سکونت فرماتے تھے، جہاں آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شب وروز گزرتے تھے۔ چنانچہ اللہ نے کرم فرمایا اور 9۔شعبان 1312ھ کو اپنے تیرہ رفقاء کی معیت میں گھر سے روانگی کا فیصلہ ہوا، لیکن اس دن کسی وجہ سے روانگی نہ ہو سکی تو دوسرے دن یعنی 10۔شعبان کو عصر کے وقت فیروز پور کو روانہ ہوئے۔ پہلی رات ایک گاؤں میں بسر کی۔ دوسرے دن 11۔ شعبان کو فیروز پور پہنچے۔ فیروز پور سے ریل کے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لیے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیتے، اس کا کرایہ کم ہے، فرمایا بے شک اس کا کرایہ کم ہے، لیکن اس میں بھیڑ کی وجہ سے نماز پڑھنا

مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے درجے میں بھیڑ نہیں ہوتی اور نماز آرام سے پڑھی جا سکتی ہے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی بھی ریل کا سفر سیکنڈ کلاس میں کرتے تھے۔ اگر کوئی اس کی وجہ پوچھتا تو یہی جواب دیتے جو مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے دیا تھا کہ تھرڈ کلاس میں آرام سے نماز نہیں پڑھی جاتی، سیکنڈ کلاس میں نماز پڑھنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

بہر حال مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی فیروز پور سے دہلی گئے۔ وہاں چند روز قیام کیا۔ پھر 25۔ شعبان 1312ء کو بمبئی پہنچے۔ اس زمانے میں سمندری جہاز پر سفر کیا جاتا تھا۔ جدہ کے لیے ''حسینی جہاز'' تیار تھا۔ مولانا کے ایک ساتھی نے اس جہاز کے ٹکٹ بھی لے لیے۔ لیکن کسی وجہ سے اس پر سوار نہیں ہوئے۔ بعدازاں 18۔ رمضان 1312ھ کو ناصری جہاز پر سوار ہوئے اور ایک مقام پر اپنے قافلے کے ساتھ عیدالفطر کی نماز پڑھی۔

اس دور کی تاریخ کو تازہ کرنے کے لیے ان کے اس مبارک سفر کے رفقائے کرام کے نام بھی پڑھ لیجیے۔

1۔ مولانا الٰہی بخش ساکن کلیر۔ ضلع قصور: یہ غزنی کے سفر میں بھی ان کے ساتھ تھے۔
2۔ نورالدین موضع بڈھی مال: اس وقت یہ گاؤں ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں تھا۔
3۔ مولوی غلام حسین امام مسجد موضع موکل ضلع قصور
4۔ لقمان ساکن موکل ضلع قصور
5۔ محمود ساکن موکل ضلع قصور
6۔ قادر بخش ساکن تاڑا
7۔ مولوی امام الدین ساکن راجووال ضلع اوکاڑہ۔
8۔ غلام ساکن مصری (اس سے زیادہ ان کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا)
9۔ حافظ عبدالرحمان (یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کہاں کے رہنے والے تھے)
10۔ عبداللہ بن خان محمد (ان کے مقام سکونت کا بھی علم نہیں ہوسکا)
11۔ رمضان (ان کے بارے میں بھی اس سے زیادہ پتا نہیں چلا)

12۔ اللہ دین۔ ساکن کوٹ کپورہ۔ ریاست فرید کوٹ

13۔ حلیم ساکن کھپیاں والی ضلع فیروز پور

مولانا سمیت یہ کل چودہ آدمی ہوئے جو مولوی خدا بخش واعظ نے ''تحفہ واعظ'' میں لکھے ہیں۔ بعض نام پورے نہیں ہیں آدھے ہیں مثلاً رمضان، حلیم، محمود، بعض کی سکونت کا پتا نہیں ملتا۔ بعض ناموں کے ساتھ تحصیل اور ضلع میں نے خود لکھے ہیں جو کہ مجھے معلوم تھے۔ کتاب پنجابی اشعار میں ہے اور بسا اوقات شعر میں پورا نام ذکر کرنا مشکل ہوتا ہے۔

چودہ افراد کا یہ قافلہ ناصری جہاز سے جدہ کی بندرگاہ پر اترا اور وہاں سے 16۔ شوال جمعرات کو شب دو بجے کے قریب مکہ مکرمہ پہنچا۔ عمرہ کر کے احرام کھولا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کو اپنے گھر میں حاضری اور اس کے طواف وزیارت کا شرف بخشا ہے۔

مدینہ منورہ کو روانگی اور وفات

عمرے سے فارغ ہو کر مولانا ممدوح نے پانچ ساتھیوں کو مکہ مکرمہ چھوڑا اور باقیوں کی رفاقت میں مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ اس وقت بالکل تندرست تھے۔ راستے میں بیمار ہو گئے۔ بیماری کی حالت میں مدینہ منورہ پہنچے۔ مسجد نبوی میں نمازیں پڑھنے اور نبی ﷺ کے روضۂ مبارک کو دیکھنے کا شدید جذبہ دل میں موجزن تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اسہال آنے لگے۔ پوری کوشش کی کہ کسی کو بیماری کا پتا نہ چلے۔ اپنا کام خود کرتے رہے۔ پیاس لگتی تو خود ہی اٹھ کر پانی پیتے۔ کسی ساتھی کو کسی قسم کی تکلیف نہ دیتے۔ جمعرات کے دن 14۔ ذیقعدہ کو مدینہ منورہ پہنچے۔ جب پیاس سے نڈھال ہو گئے تو اپنے ساتھی عبداللہ سے فرمایا مجھے ٹھنڈا پانی پلاؤ یا کہیں سے کوئی شربت لاؤ۔ عبداللہ فوراً بازار گئے اور انار لائے اس کا شربت بنا کر انھیں پلایا۔ جمعۃ المبارک کے دن 15۔ ذیقعدہ 1312ھ (10۔ مئی 1895ء) کو مسجد نبوی میں حالتِ سجدہ میں ساٹھ (60) سال کی عمر پا کر انتقال فرما گئے اور قبرستان جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

اللھم وسع مدخلہ۔ نور قبرہ۔ وارفع درجتہ



پانچواں باب

مولانا محمد علی لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد علی لکھوی 1307ھ (1890ء) میں بمقام لکھو کے پیدا ہوئے۔ وہ حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے فرزند گرامی تھے۔ ان کی ولادت سے پہلے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے دو یا تین بیٹے چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ ان کی ولادت پر رشتے داروں میں بے حد مسرت کا اظہار کیا گیا اور بچے کی درازیٔ عمر اور بہتر مستقبل کے لیے دعائیں کی گئیں۔

وہ انتہائی سستا زمانہ تھا، ہر چیز سستی تھی، لیکن پیسا بہت مہنگا تھا، جس کا حصول بڑا مشکل تھا، تاہم اس دور کے حالات کے مطابق قرابت داروں اور اس خاندان سے تعلق رکھنے والوں نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بچے کو پیسے بھی دیے اور کپڑے بھی دیے۔۔۔ مولانا کے صاحب زادۂ گرامی مولانا معین الدین لکھوی نے ایک مرتبہ اس زمانے کے چند پرانے کاغذات مجھے دکھائے تھے، جن میں لکھا تھا کہ فلاں شخص نے دو آنے دیے اور فلاں نے چار آنے۔ اس طرح جو کچھ کسی نے دیا وہ سب مرقوم تھا۔ ان کے ننھیال والوں نے سب سے بڑھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے بیس "پنیاں" بنا کر بھیجیں۔ شاید یہ چاولوں کی پنیاں ہوں گی، جن میں گھی، بادام اور گری وغیرہ چیزیں ڈالی گئی ہوں گی۔ اس زمانے میں اس قسم کی چیزوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

مرزا غلام احمد کی کذب بیانی کا ثبوت

پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی اپنے عمِّ محترم مولانا معین الدین لکھوی مرحوم ومغفور کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے جدِ امجد حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا غلام احمد قادیانی کو خط لکھا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ یا اللہ! مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں میری رہنمائی فرما۔ اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی بذریعہ الہام قرآن کی اس آیت کی صورت میں فرمائی:

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕیْنَ ۝ (القصص:8)

(بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطا کار تھے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ فرعون اور ہامان اور ان کے ساتھی اور مرزا غلام احمد قادیانی سب ایک ہی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں اور گناہ گار ہیں۔

اس کے جواب میں مرزا غلام احمد نے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کو لکھا کہ مجھے آپ کے بارے میں الہام ہوا ہے: ان شانئك هو الابتر ۔۔۔آپ کے ہاں اولاد نرینہ نہ ہوگی اور آپ کی نسل آگے نہیں چلے گی۔۔۔لیکن مرزا قادیانی کی زندگی ہی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا ممدوح کو بیٹا عطا فرمایا، جس کا نام انھوں نے محمد علی رکھا۔ اب مرزا کے پیروکاروں نے اسے مولانا کے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی تو اس نے اپنی شرمندگی چھپاتے ہوئے کہا کہ اس بیٹے سے ان کی نسل آگے نہیں بڑھے گی۔ پھر عام لوگوں سمیت مرزائیوں نے بھی دیکھا کہ مولانا محمد علی لکھوی کو اللہ نے چار بیٹے عطا فرمائے، دو ہندوستان میں محی الدین اور معین الدین اور دو مدینہ منورہ میں حسن اور حسین۔ بعدازاں ان کا سلسلۂ نسل اللہ کی مہربانی سے اس کثرت سے پھیلا کہ اسے شمار میں لانا مشکل ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی کے بقول مولانا معین الدین لکھوی فرمایا کرتے تھے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے ساتھ اپنا یہ "الہامی" مکالمہ اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں درج کیا تھا، لیکن مرزا چوں کہ اس میں جھوٹا ثابت ہوا، لہٰذا اسے بعد

کے ایڈیشنوں میں درج نہیں کیا گیا۔

اب اس سلسلے میں خود حضرت مولانا محمد علی لکھوی کا فرمان پڑھیے:

1937ء کے مئی (یا جون) کا مہینا تھا کہ مولانا محمد علی صاحب کے بڑے صاحب زادے مولانا محی الدین کے گھر بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام مولانا محمد علی نے اپنے جدِ امجد کے نام پر حافظ محمد رکھا۔ جمعۃ المبارک کے روز مرکز الاسلام میں بچے کا عقیقہ کیا گیا، جس میں رشتے داروں سمیت اردگرد کے دیہات کے بے شمار لوگ شامل تھے۔ مولانا نے خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام میں طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھا اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں فریضۂ تدریس انجام دیتے تھے۔ مولانا محمد علی صاحب نے خطبۂ جمعہ میں اپنی پیدائش کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا: میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بددعا کا نتیجہ اور اس کے جھوٹا ہونے کی واضح نشانی ہوں۔۔۔ یہ الفاظ انھوں نے کچھ اس انداز سے کہے اور پورا واقعہ اس اسلوب میں ان کی زبان سے ادا ہوا کہ سامعین کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہوگئے اور ساتھ ہی چہروں پر کچھ مسکراہٹ بھی بکھر گئی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد علی لکھوی کو علم وعرفان کی بے پناہ دولت سے نوازا اور انھوں نے حسنات وصالحیت کی روح پرور فضاؤں میں عمر مبارک کی 83 منزلیں طے کیں۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ

والد گرامی کی وفات

مولانا کے والد گرامی حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں خوانندگانِ محترم کے علم میں آیا۔ جب وہ حج بیت اللہ کے لیے گئے، اس وقت مولانا محمد علی چار پانچ سال کے بچے تھے۔ روانگی کے وقت انھوں نے فرمایا تھا کہ اس بچے کو اللہ تعالیٰ علمی اعتبار سے درجۂ امامت پر فائز کرے گا۔ اہل خانہ کو تاکید فرمائی کہ بچے کا خاص طور سے خیال رکھیں۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ والد مکرم مدینہ منورہ پہنچے تو مسجد نبوی میں وفات پا گئے۔ اس طرح بچہ کم سنی میں سایۂ پدری سے محروم ہو کر یتیمی کی آغوش میں چلا گیا۔

ان کی بڑی بہنوں کا بیان ہے کہ وہ بچپن میں پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اکٹھے کر کے ایک دوسرے سے جوڑنا شروع کر دیتے اور کہا کرتے کہ یہ کتابیں ہیں، انھیں ترتیب سے رکھ رہا ہوں۔

تحصیل علم

والد کی وفات کے بعد انھیں سرکاری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سکول میں صرف تین جماعتیں پڑھیں، پھر دینیات کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان کا گاؤں لکھو کے اس وقت پنجاب میں تدریس کا مشہور مرکز تھا۔ تدریس کا فریضہ ان کے بزرگ حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی انجام دیتے تھے جو اس عہد کے ممتاز معلم تھے اور تمام درسی علوم پر عبور رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی نے ان سے صرف ونحو اور دیگر علومِ مروّجہ کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد امرتسر کا عزم کیا اور مدرسہ غزنویہ کے اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ ان دنوں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی مدرسہ غزنویہ کی مسندِ درس پر متمکن تھے۔ انھوں نے [illegible] سے اکتسابِ علم کیا۔ وہ اپنے اس شاگرد پر بے حد شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) میں حضرت حافظ عبدالمنان صاحب کا سلسلۂ درس جاری تھا اور کثیر تعداد میں علماء وطلباء ان سے مشغول استفادہ تھے، مولانا محمد علی لکھوی بھی عازمِ وزیر آباد ہوئے اور حضرت حافظ صاحب کے درس حدیث میں شمولیت کی اور ان سے سندِ فراغ لی۔

کچھ عرصہ مولانا محمد علی لکھوی، لاہور کے مدرسہ نعمانیہ میں بھی تعلیم [illegible] کرتے رہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ طلباء کے ساتھ لاہور کی بادشاہی مسجد [illegible] میں استاذ کے حضور بیٹھے پڑھ رہے تھے کہ اتنا شدید زلزلہ آیا کہ مسجد کے مینار ایک [illegible] گئے۔ ایسے معلوم ہوا کہ زمین پر گرنے لگے ہیں۔ پھر اسی وقت اوپر کو اٹھ گئے۔ اس وقت [illegible] کے قریبی رشتے دار مولانا عطاء اللہ لکھوی اور مولوی احمد الدین لکھوی بھی وہیں تعلیم [illegible] کرتے تھے اور ان کے ہم درس تھے۔

کچھ عرصہ وہ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کے حلقۂ درس میں بھی شامل رہے۔ مختلف اساتذہ سے استفادے کے بعد وہ دیوبند اور سہارن پور بھی گئے۔ سہارن پور میں مولانا خلیل احمد سہارن پوری کے اور دیوبند میں مولانا محمود حسن کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ لیکن ان دونوں مقامات میں تھوڑا عرصہ ہی ان کا قیام رہا۔ علوم متداولہ کی تکمیل انھوں نے کس سال کی اور کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں؟ اس سوال کا مفصل جواب نہیں ملتا۔

لکھوی اور غزنوی مدارس کی شہرت

دورِ گزشتہ میں لکھوی اور غزنوی مدارس کی عوام میں بڑی شہرت تھی اور ان کے علمائے کرام نے بڑا نام پایا۔ لاتعداد ممتاز علماء ان مدارس میں تحصیل علم کے لیے آئے۔ مثلاً لکھو کے اور امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے والد میاں روشن دین نے بھی تعلیم حاصل کی اور خود حافظ صاحب بھی ابتدائی عمر میں کچھ عرصہ وہاں پڑھتے رہے۔ جماعت غربائے اہل حدیث کے امام مولانا عبدالوہاب دہلوی بھی لکھوی علماء سے مستفید ہوئے۔ متعدد غزنوی اصحاب علم، لکھوکے کے مدرسے میں حصولِ علم کے لیے تشریف لائے۔ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے اخذِ فیض کے لیے ایک مرتبہ مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی لکھو کے تشریف لے گئے تھے۔ مدرسہ غزنویہ میں بعض لکھوی علماء کے علاوہ حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور دیگر بے شمار علماء نے تحصیل علم کی۔ کسی نے کم کسی نے زیادہ۔

ان مدارس کے سند یافتہ علماء کا احترام

بالخصوص صوبہ پنجاب کے لوگوں میں کسی زمانے میں لکھوکی کے مدرسے اور امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ جس شخص نے ان مدارس میں یا ان میں سے کسی ایک مدرسے میں تعلیم نہ حاصل کی ہو، اسے پورا عالم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ بعض لوگ کسی عالم سے کوئی مسئلہ دریافت کرنے یا اس کا وعظ سننے کے لیے جاتے تو اس سے پوچھتے کہ آپ نے کہاں تعلیم حاصل کی؟ اگر وہ ان دونوں مدرسوں یا ان

میں سے کسی ایک مدرسے کا نام لیتا تو انھیں تسلی ہو جاتی کہ یہ عالم ہے اور صحیح مسئلہ بیان کرے گا۔ لیکن اگر وہ ان میں سے کسی مدرسے کا فارغ التحصیل نہ ہوتا تو اسے پورا عالم نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس سے مسئلہ پوچھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی تھی۔ حضرت مولانا محمد علی لکھوی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ایک تو وہ خود لکھوی خانوادے کے رکن تھے، مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کے بیٹے، حافظ محمد لکھوی کے پوتے اور حافظ بارک اللہ لکھوی کے پڑپوتے۔ دوسرے یہ کہ لکھوی اور غزنوی دونوں مدارس کے فارغ التحصیل تھے۔ فراغت کے بعد انھوں نے لکھو کے آکر اپنے آبائی مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ ان کے اس زمانے کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں مولانا عبدالقادر حصاری، مولانا عبداللہ اوڈ (بنگلہ فاضلکا) مولانا عبدالرحیم کوٹلوی، مولانا محمد سلیمان (ساکن کوٹ کپورہ) حافظ محمد سلیمان بھوجیانی شامل ہیں۔

دارالاسلام کا قیام

مولانا محمد علی لکھوی مجاہدانہ طبیعت کے مالک تھے۔ وہ ابتدا ہی سے انگریزی حکومت کے خلاف اور سرحد پار کی جماعت مجاہدین کے حامی تھے۔ چنانچہ اس مردِ جلیل نے لکھو کے میں نہر سے چند قدم کے فاصلے پر اپنی ذاتی زمین میں دارالاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس میں وہ طلباء کو تعلیم بھی دیتے اور ورزش وغیرہ کے ذریعے ان کی جسمانی تربیت بھی کرتے تھے۔ اس ادارے کا اصل مقصد مجاہدین تیار کرنا تھا جو چمرکنڈ کے مرکزِ مجاہدین میں جا کر انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کریں۔ وہ خود بھی خفیہ طور سے وہاں گئے تھے اور کچھ عرصہ وہاں رہ کر اس نواح کے حالات معلوم کیے تھے۔

میں 1937ء میں مرکز الاسلام گیا تو لکھوکے جا کر وہ جگہ دیکھی تھی، جس کا نام مولانا نے ''دارالاسلام'' رکھا تھا۔ اس وقت وہ ادارہ تو ختم ہو چکا تھا، لیکن اس کی پکی دیواریں اور دو تین کچے کمرے موجود تھے، جن پر موٹے حروف میں ''دارالاسلام'' مرقوم تھا۔ اس عمارت کے صحن میں مولانا کے مزارعوں نے ڈھور ڈنگر باندھ رکھے تھے۔

مرکز الاسلام کا قیام

پھر 1928ء کے لگ بھگ مولانا محمد علی نے لکھوکے گاؤں سے دوڈھائی میل کے فاصلے پر رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہ جگہ پینتالیس ایکڑ زمین میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نام انھوں نے ''مرکز الاسلام'' رکھا تھا۔ وہ بڑے باہمت اور جفاکش عالم دین تھے۔ خود ہی مٹی کی بڑی بڑی اینٹیں تیار کیں اور اپنے ہاتھوں سے پینتالیس ایکڑ میں سے دوڈھائی ایکڑ زمین کے اردگرد چار دیواری بنائی۔ درخت کاٹ کر چھتوں کا سامان تیار کیا اور دس بارہ کمرے یا کوٹھے تعمیر کیے۔ یہاں بھی اصل مقصد طلباء کو تعلیم دینا اور جنگل کی کھلی فضا میں مجاہدین تیار کر کے چمرکنڈ کے مرکز مجاہدین میں بھیجنا تھا، چنانچہ انھوں نے مختلف اوقات میں کئی مجاہدین وہاں بھیجے اور پھر وہ واپس بھی آئے۔ میں نے ان میں سے بعض کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہ مرکز مجاہدین کے واقعات سناتے اور ان کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ان دنوں مولانا کے پاس کچھ اجنبی سے لوگ آیا کرتے تھے جو ان سے علیحدگی میں باتیں کرتے، کئی کئی دن وہاں رہتے اور پھر چلے جاتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔

وہاں آنے والوں میں ایک صاحب کا نام مجھے یاد پڑتا ہے، احمد تھا۔ انھیں شاہ صاحب کہا جاتا تھا۔ وہ قدرے چھوٹے قد کے گورے چٹے آدمی تھے۔ خوش مزاج اور خوش طبع۔ خود بھی ہنستے، دوسروں کو بھی ہنساتے۔ مختلف فقہی مسالک کے لوگ جس انداز سے نماز پڑھتے ہیں، اس کی وہ خوب نقل اتارتے تھے۔ 1937ء سے قبل وہ مرکز الاسلام میں بطور طالب علم رہے تھے اور چمرکنڈ کے مرکز مجاہدین میں بھی گئے اور شریک جہاد ہوئے تھے۔ مولانا محی الدین اور معین الدین کے بے تکلف دوست تھے۔ کئی کئی دن مرکز الاسلام میں رہتے تھے۔

ایک گورے رنگ کے کشیدہ قامت نوجوان محمد دین تھے، وہ مرکز الاسلام کے کسی قریب کے گاؤں کے رہنے والے تھے، وہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ بہت ہی کم گو تھے۔ ان کے بارے میں سنا تھا کہ انھوں نے مولانا سے اصرار کیا تھا کہ انھیں مرکزِ مجاہدین میں بھیجا جائے، چنانچہ وہ گئے اور واپس بھی آئے۔ ہم کبھی ان سے وہاں کی بات پوچھتے تو مسکرا کر ٹال

دیتے، کوئی بات بتانے سے گریز کرتے۔ وہ بالعموم سفید کھدر کی چادر اوڑھے رکھتے تھے۔ مرکز الاسلام آتے تو زیادہ تر تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے۔ وہ کبھی مرکز الاسلام رات کو نہیں رہے، صبح آتے اور شام کو اپنے گاؤں چلے جاتے۔

تعمیراتی کام اور شجر کاری

مولانا نے کوئی کمرہ بنانا ہوتا تو اکیلے ہی کام شروع کر دیتے اور پھر دوسرے لوگ انھیں کام میں مشغول دیکھ کر خود بہ خود ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ وہ عمارت میں اکھاڑ پچھاڑ کرتے رہتے تھے۔ آج کوئی دروازہ یہاں بنایا ہے تو چند روز بعد اکھاڑ کر دوسری جگہ بنالیا۔

مہمانوں کی آمد و رفت

مرکز الاسلام کے ریلوے اسٹیشن کا نام جھوک ٹہل سنگھ تھا جو فیروز پور سے دوسرا اسٹیشن تھا۔ مرکز الاسلام وہاں سے مغرب کی طرف دوسرے سگنل کے قریب آدھے میل کے فاصلے پر تھا۔ فیروز پور سے دن میں دو ٹرینیں وہاں آتی تھیں جو بنگلہ فاضلکا اور بہاول نگر سے ہوتی ہوئی سمہ سٹہ جاتی تھیں۔ ایک ٹرین دن کو بارہ بجے اور دوسری شام کے چھے بجے۔ دو ٹرینیں ہی سمہ سٹہ سے چل کر بہاول نگر اور فاضلکا سے گزرتی ہوئی، وہاں سے فیروز پور جاتی تھیں۔ ایک صبح نو بجے اور دوسری دوپہر کے بعد تین بجے۔ ان چاروں ٹرینوں سے تقریباً ہر ٹرین سے مرکز الاسلام آنے والے مہمان اترتے تھے۔ بعض دفعہ مہمانوں کی گنتی تیس بتیس تک پہنچ جاتی تھی۔ ان سب کے لیے کھانا مولانا کے گھر سے آتا تھا۔ اس گھر کی قابل احترام خواتین مہمانوں کے لیے خود کھانا پکاتی تھیں۔ طلباء کا کھانا بھی وہی تیار کرتی تھیں۔ ان عالی مرتبت خواتین کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ وہ گرمی اور سردی میں تیس تیس پینتیس پینتیس آدمیوں کا دو وقت کا کھانا کتنی محنت سے تیار کرتی تھیں۔ مولانا محی الدین اور معین الدین گھر سے طالب علموں اور مہمانوں کے لیے کھانا لاتے تھے۔ بعض مہمان تو کئی کئی دن وہاں قیام کرتے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ آتے ہی قیام کے لیے تھے۔

بعد میں موضع برج کے ایک شخص یعقوب عرف بیلا کو باورچی مقرر کرلیا گیا تھا، لیکن پھر

بھی بعض افراد کا کھانا گھر سے آتا تھا۔ ان مہمانوں میں سے کوئی دینی مسئلے پوچھنے کے لیے آتا، کوئی محض ملاقات کے لیے، کوئی وعظ ونصیحت سننے کے لیے۔ کوئی دم درود کرانے اور کوئی تعویذ وغیرہ لینے کے لیے۔ وہ نیک لوگ تھے اور نیکی کے متلاشی رہتے تھے۔ ان کے نزدیک مولانا محمد علی کا قائم کردہ یہ مرکز نیکی کے حصول کا مرکز تھا اور وہاں قیام کرنا کارِثواب۔! تقسیم ملک سے کچھ عرصہ قبل ایک خاتون بھی مرکز الاسلام آگئی جو مولانا کے گھر میں کام کرتی تھی۔ اس کا نام مریم تھا۔ غالباً ان کے ساتھ ہی وہ پاکستان آئی تھی۔ ایک مرتبہ وہ لاہور بھی آئی۔ پوچھتے پچھاتے شیش محل روڈ پر اخبار ''الاعتصام'' کے دفتر پہنچی، جس کا میں اس وقت ایڈیٹر تھا۔ میں اسے اپنے گھر لے گیا اور چار پانچ دن میری بیوی کے پاس رہی۔ پھر اوکاڑے چلی گئی تھی۔ نہایت نیک خاتون تھی۔

ایک بے تکلف دوست مہمان

شام کی ٹرین جو فیروز پور سے روانہ ہو کر چھے بجے جھوک ٹہل سنگھ ریلوے سٹیشن پر پہنچتی تھی، اس کی آمد پر سردیوں میں کافی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ ٹرین سے اتر کر مرکز الاسلام جانے والوں کے لیے مزید تاریکی پھیل جاتی تھی۔

فیروز پور کے قریب ایک گاؤں کے ایک شخص منشی احمد الدین پٹواری مولانا محمد علی کے بے تکلف دوست تھے۔ وہ ایک دن سردیوں کے موسم میں شام کی ٹرین سے مرکز الاسلام پہنچے۔ جس راستے سے انھیں مرکز کی چار دیواری کے اندر داخل ہونا تھا، وہ راستہ مولانا کی تعمیراتی اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے بند ہو چکا تھا اور نیا راستہ بنا لیا گیا تھا، جس کا منشی احمد الدین کو علم نہ تھا۔ وہ پرانے دروازے پر آئے تو وہاں اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے پریشان ہوئے۔ یہ 1937ء کی بات ہے۔ ہم اندر بیٹھے تھے، مولانا بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ منشی صاحب لمبے قد اور سانولے سے رنگ کے بھاری بھرکم آدمی تھے اور بلند آواز سے بات کرتے تھے۔ اندھیرے میں ادھر ادھر راستہ تلاش کیا۔ جب ناکام ہو گئے تو وہیں کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارا۔

''اوئے محمد علی توں کی مصیبت پا رکھی اے۔ روز بوہے باریاں بدلدا رہناں ایں۔ دس میں کدھر دی آواں۔''

(او محمد علی تم نے کیا مصیبت ڈال رکھی ہے، روزانہ دروازے بدلتے رہتے ہو۔ میں باہر کھڑا ہوں، بتاؤ کدھر سے آؤں)

جو لوگ وہاں بیٹھے تھے، یہ الفاظ سن کر ہنس پڑے۔ خود مولانا بھی مسکرانے لگے۔ محی الدین اور معین الدین انھیں تایا جی کہا کرتے تھے۔ مولانا نے محی الدین سے کہا جاؤ اپنے تایا کو لے کر آؤ۔ انھوں نے باہر نکل کر آواز دی۔۔۔ ''تایا جی میں آرہا ہوں، آپ یہیں کھڑے رہیں''۔۔۔ وہ مولانا محی الدین کے ساتھ اندر آئے تو ہنستے ہوئے مولانا سے ان کی عمارتی اکھاڑ پچھاڑ کے سلسلے میں بہت سی باتیں کہیں۔ مولانا سنتے اور مسکراتے رہے۔ ان کا بات سننے کا بھی عجیب انداز تھا اور بات کرنے اور مسکرانے کا بھی۔

جن بھوت کی آواز؟

مولانا کو درخت لگانے کا بہت شوق تھا۔ آمد و رفت کے راستوں پر خاص ترتیب سے سیدھی قطاروں میں شیشم وغیرہ کے سایہ دار درخت لگائے جو بڑے خوب صورت دکھائی دیتے تھے۔ کچھ درخت ''دھریک'' کے بھی تھے۔ ہم موسم سرما میں وہاں گئے تھے۔ رات کو ہوا چلنے لگی تو تمام رات ٹن ٹن کی آواز کانوں میں پڑتی رہی، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ آواز کس چیز کی ہے اور کدھر سے آرہی ہے۔ آواز کبھی تیز ہو جاتی تھی، کبھی کم۔ ہم ڈر گئے کہ جنگل میں شاید کوئی جن بھوت ہے جو یہ آواز نکال رہا ہے۔ تیسرے چوتھے دن پتا چلا کہ ''دھریک'' کے درخت کی خشک ''پھلیاں'' ہوا چلنے کی وجہ سے باہم ٹکراتی ہیں تو ان سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ دھریک سایہ دار درخت تھا، جو کافی پھیلا ہوا تھا۔

سیاست میں مولانا کا نقطۂ نظر

مولانا محمد علی لکھوی چوں کہ ابتدا ہی سے انگریز دشمن خیالات رکھتے تھے، اس لیے

سیاسیات میں ان کا تعلق مجلس احرار سے تھا، اور احرار کے مقرر بڑے جی دار اور تیز تھے۔ آزادئ وطن کے لیے اس جماعت کے ارکان نے بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور پھر اسی قسم کی سیاسی جماعتوں کی کوششوں اور بے حد قربانیوں سے ملک آزاد ہوا، اور برصغیر کے باشندوں کو انگریزی اقتدار سے نجات حاصل ہوئی اور پاکستان معرضِ قیام میں آیا۔

ایک طویل قامت شخص کی آمد

1937ء کی بات ہے کہ ایک دن گیارہ بجے کے قریب ایک صاحب آئے۔ طویل قامت اور کسرتی جسم۔ موٹی موٹی چمک دار آنکھوں پر نظر کی عینک، موٹے کپڑے کا لمبا کرتا، کھلے پائنچے کی شلوار، لمبی سیاہ داڑھی، تیکھی ناک، سر پر اونچی دیوار کی ٹوپی اور پاؤں میں موٹے سے چمڑے کی چپل۔ چہرے پر سفر کے آثار نمایاں۔ خوب صورت جوان، سردیوں کا موسم تھا، ہم لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے کہ آواز گونجی السلام علیکم۔ بڑی بارعب اور گرج دار آواز۔۔۔ ہم نے اس قسم کے لباس والا شخص پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

پوچھا: مولوی محمد علی کہاں ہیں؟

مولانا کو ان کی آمد کی اطلاع دی گئی تو وہ تشریف لائے۔ دونوں دھوپ میں بیٹھ گئے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی بھی موجود تھے اور مولانا محی الدین اور معین الدین بھی وہیں تھے۔ نو وارد مہمان سب کی نظروں کا مرکز تھے۔ انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''میرا نام نذیر احمد ہے، کشمیر کے علاقے سے آیا ہوں۔ لاہور گیا تھا، چینیاں والی مسجد میں جانے کا ارادہ تھا، لیکن نہیں گیا، اس لیے کہ وہاں مولوی داؤد غزنوی بیٹھا تھا اور میں اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے کہ وہ کانگرس کا حامی ہے اور مجلس احرار سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نہ کسی احراری کو اچھا سمجھتا ہوں نہ کانگریسی کو۔۔۔!

حضرت مولانا محمد علی لکھوی غور سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ تھوڑا تھوڑا مسکراتے بھی رہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا خود مجلس احرار کے حامی تھے اور اسی دن تین بجے کی ٹرین سے مجلس احرار کے جلسے میں شرکت کے لیے ملتان تشریف لے جارہے تھے۔ ڈھائی بجے تو

معزز مہمان سے کہا آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ جب تک جی چاہے یہاں قیام فرمایے، لیکن مجھے اجازت دیجیے۔ میں تین بجے کی گاڑی سے ایک ضروری سفر پر جا رہا ہوں۔ میرے دونوں بیٹے محی الدین اور معین الدین، اور یہاں کے مدرس مولانا عطاء اللہ صاحب اور تمام طلباء آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ آپ ان سے کھل کر باتیں کریں۔ انھیں آپ کی باتیں سن کر خوشی ہوگی۔ مہمان ایک دن وہاں رہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور سب لوگ پوری توجہ سے سنتے رہے۔ کسی نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا، اس لیے کہ وہ سب کے نزدیک قابل احترام تھے اور ان کے سامنے بولنا مناسب نہیں تھا۔

یہ معزز مہمان تھے صوفی نذیر احمد کاشمیری 16۔ دسمبر 1963ء کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات کے وقت وہ ہندوستان کے شہر بنارس میں مقیم تھے۔ وہاں سے ''سید السادات طاب ثراہ کے بعد'' کے عنوان پر مولانا کی وفات سے متعلق تعزیتی مضمون لکھ کر مجھے بھیجا جو میں نے 17۔ جنوری 1964ء کے اخبار ''الاعتصام'' میں شائع کیا۔ نہایت درد بھرا مضمون تھا، جس میں مولانا غزنوی کی بڑی تعریف کی گئی تھی اور انھیں ملک اور جماعت کے عظیم رہنما قرار دیا گیا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد صوفی صاحب ہندوستان ہی میں رہے۔ وہ میرے بے حد مہربان تھے۔ پاکستان میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو مجھے ضرور ملتے اور بے حد شفقت کا اظہار فرماتے۔ تقسیم ملک کے بعد انھوں نے مستقل طور سے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں تحریری اور تقریری صورت میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دے لیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ ہندوؤں کے بعض ایسے ایسے مقامات پر گئے اور ان کے ان مجمعوں میں تقریریں کیں جہاں ہر مبلغ نہیں جا سکتا۔ 5۔ دسمبر 1985ء کو ہندوستان کے شہر سہارن پور میں فوت ہوئے۔ ان کے دو بیٹے ہیں، مختار احمد ہاشمی اور گلزار احمد ہاشمی۔ وہ موضع کہوٹہ ضلع باغ (آزاد کشمیر) میں قیام پذیر ہیں۔

فرید کوٹ کی ایک مسجد کے سلسلے میں

صوفی نذیر احمد کاشمیری سے متعلق چند سطور مولانا محمد علی لکھوی کے تذکرہ کے سلسلے میں معرضِ بیان میں آگئیں۔ اب پھر مولانا لکھوی کی طرف آتے ہیں۔ 1935ء میں والی ریاست فرید کوٹ نے فرید کوٹ کی ایک مسجد پر قبضہ کر کے اسے میونسپل کمیٹی کا دفتر بنا دیا تھا۔ ریاست فرید کوٹ میں اس قسم کا یہ پہلا واقعہ تھا، جس سے مسلمانوں کو تو تکلیف پہنچنا ہی تھی، سکھوں اور ہندوؤں کو بھی بہت افسوس ہوا تھا۔

اس سے کچھ عرصے کے بعد مولانا محمد علی لکھوی نے والیٔ ریاست کی اس حرکت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ منصوبہ یہ بنایا گیا کہ مسجد کی واگزاری کے لیے فرید کوٹ مسلمانوں کے جتھے بھیجے جائیں گے اور گرفتاریاں دی جائیں گی۔ چنانچہ مرکز الاسلام میں خطبۂ جمعہ میں اعلان کر دیا گیا اور اشتہارات چھپوا کر دیہات میں بھجوا دیے گئے کہ عنقریب ہم مرکز الاسلام سے مسجد کی واگزاری کے لیے تحریک شروع کرنے والے ہیں، اس کے لیے فرید کوٹ جتھے بھیجے جائیں گے، جو لوگ جتھوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں، وہ یہاں آکر اپنے نام لکھوائیں۔

مرکز الاسلام انگریزی علاقے یعنی ضلع فیروز پور میں تھا اور فرید کوٹ کی حد وہاں سے صرف دو میل کے فاصلے سے شروع ہو جاتی تھی اور شہر فرید کوٹ وہاں سے چودہ میل کی مسافت پر تھا۔ دیہات کے لوگ جتھوں میں شامل ہونے کے لیے مرکز الاسلام آکر اپنے نام لکھوانے لگے۔ اس پر ریاست کے حکومتی حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور حکمران سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ریاست کی سرحد پر پولیس بٹھا دی گئی اور ضلع فیروز پور سے ریاست میں آنے جانے والوں کی نگرانی ہونے لگی۔ کئی مہینے یہ صورت حال رہی۔ لیکن اعلان کے باوجود مسجد کی واگزاری کے لیے باقاعدہ تحریک نہیں شروع ہو سکی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد علی بڑے دبنگ عالم دین تھے او ہمیشہ عمل و حرکت میں مصروف رہتے تھے۔

مولانا آزاد سے تعلق

مولانا ممدوح کے مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی تعلقات تھے۔ ان کا ذکر وہ بڑے احترام کے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ 1937ء کی بات ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ''تذکرہ'' دکھائی۔ فرمایا یہ کتاب میں نے اسی زمانے میں خرید لی تھی، جب شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعض مقامات کو دیمک نے کھالیا تھا، جس کی وجہ سے اس میں سوراخ پڑ گئے تھے اور مولانا اس پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ ان سے اجازت لے کر میں اسے دیکھنے لگا تو فرمایا تم اسے پڑھنا چاہتے ہو تو پڑھ لو۔ میں نے چار پانچ روز میں اسے پڑھ لیا۔ کوئی بات سمجھ میں آئی کوئی نہ آئی۔ میں کتاب واپس کرنے لگا تو فرمایا کچھ سمجھ میں بھی آیا یا نہیں؟

عرض کیا: حضرت! میں نے تو اسے صرف پڑھا ہے، سمجھا تو آپ نے ہے۔

مسکراتے ہوئے فرمایا: پڑھا کرو سمجھ بھی لیا کرو گے۔

مسجد چینیاں والی میں تدریس

مولانا محمد علی لکھوی کے مولانا سید داؤد غزنوی سے گہرے مراسم تھے، سیاسی بھی، روحانی بھی، خاندانی بھی۔ ایک مرتبہ مولانا غزنوی قید ہوئے تو جیل سے مولانا محمد علی لکھوی کو پیغام بھجوایا کہ وہ لاہور تشریف لے جائیں اور چینیاں والی مسجد میں درس قرآن بھی دیا کریں اور خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرمایا کریں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں وہاں اس شرط پر جا سکتا ہوں کہ وہاں کم از کم دس طالب علم صحاح ستہ اور دیگر علوم کی کتابیں پڑھنے والے ہوں، چنانچہ مولانا غزنوی نے امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں حضرت مولانا نیک محمد کو پیغام بھجوایا کہ وہاں دس طالب علم بھیج دیں۔ اس پر عمل ہوا اور مندرجہ ذیل دس طالب علم وہاں بھیجے گئے۔ (1) حافظ محمد سلیمان بھوجیانی، (2) مولوی عبدالودود ساکن بڈاں والی ضلع فیروز پور، (3) مولوی عبدالواحد لائل پور، (4) حافظ محمد یوسف گکھڑوی، (5) سید زین العابدین لائل پور، (6) مولوی عبدالحکیم موضع برٹن کشمیر، (7) مولوی عبدالعزیز کاتب گوجرانوالہ، (8) مولوی عبدالصمد بنگالی، (9) مولوی عبدالعظیم انصاری، ایک اور صاحب تھے۔

یہ حضرات چینیاں والی مسجد میں مولانا محمد علی لکھوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے تحصیل علم کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا لکھوی نے ان کو سندیں دیں۔ یہ 1932۔33ء کی بات ہے۔

مسجد نبوی میں درسِ حدیث

1928ء کے قریب حضرت مولانا محمد علی لکھوی مستقل طور سے مدینہ منورہ چلے گئے اور مسجد نبوی میں درسِ حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہاں حجاز، یمن، نجد، مصر، الجزائر، مراکش، انڈونیشیا، ملائیشیا، سوڈان اور افریقہ وغیرہ کے بے شمار علما وطلباء نے ان کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیے، اور مستفید ہوئے۔ اس طرح دنیا کے متعدد ممالک میں ان کے شاگردوں کے ذریعے ان کی صدائے حق پہنچی اور لاتعداد لوگ قرآن وحدیث کے احکام سے آشنا ہوئے۔ اب ان کے شاگردوں کے شاگرد یہ سلسلہ متواتر آگے بڑھا رہے ہیں جو ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ مولانا نے مدینہ منورہ میں شادی بھی کر لی تھی۔ اس خاتون سے ان کی اولاد بھی ہوئی۔ نرینہ اولاد دو بیٹے تھے حسن اور حسین۔ قیام مدینہ کے زمانے میں مولانا ممدوح مرکز الاسلام بھی آتے تھے اور بعض اوقات کئی کئی سال یہاں رہتے تھے۔

پہلی دفعہ پاکستان میں آمد

قیامِ پاکستان کے زمانے میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدینہ منورہ میں اقامت گزیں تھے اور مسجد نبوی میں طلباء کو قرآن وحدیث کا درس دیتے تھے۔ اس وقت وہاں رابطے کے لیے ٹیلی فون کی سہولت حاصل نہ تھی۔ خیر وعافیت وغیرہ سے مطلع ہونے کے لیے یا تو خط وکتابت کی جاتی تھی یا حج اور عمرہ کے لیے جانے والوں کے ذریعے پیغام رسانی کا سلسلہ چلتا تھا۔ اگست 1947ء میں پورا برصغیر فسادات کی زد میں آ گیا تھا۔ پنجاب میں بالخصوص انتہائی خطرناک حالات پیدا ہو گئے تھے۔ ایک طرف ہندو اور سکھ تھے، دوسری طرف مسلمان تھے۔ ہر جگہ لوٹ کھسوٹ، غصب ونہب اور قتل وغارت کا بازار گرم تھا۔ نہ شہر محفوظ تھے، نہ دیہات۔ مولانا محمد علی لکھوی کو ریڈیو کے ذریعے اور وہاں آنے جانے والوں کی وساطت سے یہ خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ سخت پریشان تھے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان کے اہل وعیال اور

متعلقین کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں۔ وہ وہاں خیر و عافیت کی دعا ہی کر سکتے تھے اور دعا کرتے رہے۔ بالآخر پتا چلا کہ سب لکھوی حضرات اوکاڑے آگئے ہیں اور خیریت سے ہیں۔

اوکاڑہ میں اس زمانے میں ایک عالم دین قاضی محمد رمضان قیام فرماتے تھے جو پہلے سے وہیں کے رہنے والے تھے اور صاحبِ حیثیت بزرگ تھے۔ ان کی ایک مسجد بھی تھی، جسے قاضی محمد رمضان والی مسجد کہا جاتا تھا، اب وہ بڑی بارونق مسجد ہے۔ مولانا محمد علی لکھوی نے ان کی معرفت اپنے فرزند گرامی مولانا معین الدین لکھوی کو خط لکھا کہ وہ فلاں تاریخ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوں گے اور فلاں تاریخ کو کراچی پہنچیں گے۔ یہ اکتوبر 1947ء کی بات ہے۔

میں ان دنوں مولانا معین الدین کے پاس اوکاڑہ میں تھا۔ اس دور میں سمندر پار کے ممالک سے آمدورفت کا ذریعہ سمندری جہاز تھے۔ مولانا معین الدین نے اپنے والد مکرم کے استقبال کے لیے کراچی جانے کا پروگرام بنایا تو مجھے بھی ساتھ جانے کو کہا۔ لیکن میں کسی وجہ سے نہ جاسکا تو وہ اکیلے کراچی گئے اور مولانا کو اوکاڑہ لے کر آئے۔ انھوں نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ کس ٹرین سے کتنے بجے اوکاڑہ پہنچیں گے۔ میں اور مولانا زین العابدین لکھوی مرحوم جامعہ محمدیہ میں بیٹھے تھے کہ اچانک مولانا معین الدین تشریف لائے اور فرمایا میں کچھ سامان لے آیا ہوں۔ بابا جی ریلوے اسٹیشن پر کھڑے ہیں۔ تم فوراً وہاں پہنچو۔ سامان بھی لاؤ اور انھیں بھی ساتھ لے کر آؤ۔ (مولانا کے بچے والد گرامی کو بابا جی کہا کرتے تھے)

ہم گئے تو دیکھا کہ مولانا عربوں والا لباس پہنے پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ زین العابدین کی شادی مولانا کی غیر موجودگی میں ان کی صاحب زادی امۃ الرحمٰن سے ہوئی تھی، میں نے ان کا بھی مولانا سے تعارف کرایا اور اپنے متعلق بھی بتایا۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد حضرت مولانا ممدوح مدینہ منورہ سے پہلی مرتبہ اکتوبر 1947ء میں تشریف لائے تھے اور کچھ عرصہ یہاں رہے۔ پھر واپس تشریف لے گئے۔ اس کے بعد کئی مرتبہ آئے۔

ایک فتویٰ

متحدہ پنجاب میں لوگ مسئلے مسائل کے لیے لکھوی علماء کی طرف رجوع کرتے اور ان

سے فتوے لیتے تھے، زبانی بھی اور تحریری بھی۔ میرا خیال ہے ان علمائے عظام نے تحریری فتووں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا ہوگا۔ فتویٰ لکھا اور معاملہ ختم ہوگیا۔ اگر کوئی ریکارڈ ہوگا بھی تو وہ تقسیم ملک کے زمانے میں ضائع ہوگیا۔ تقسیم ملک کے بعد بھی لوگ ان سے فتوے لیتے رہے۔ اس کا بھی شاید کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ جہاں یہ حضرات تشریف لے جاتے، وہاں کے لوگ ان سے تحریری صورت میں بھی فتوے پوچھتے اور زبانی بھی۔ ان کے تحریری فتوے بھی شاید کسی نے سنبھال کر نہیں رکھے ہوں گے۔ کچھ عرصہ قبل دارالحدیث راجووال کے مدرس مولانا عنایت اللہ امین نے مجھے حضرت مولانا محمد علی لکھوی کا تحریر فرمودہ ایک فتویٰ بھیجا تھا، جس میں سائل کے پانچ سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، لیکن کسی سوال کے الفاظ مرقوم نہیں ہیں نہ سائل کا پتا چلتا ہے کہ کون ہے۔ صرف جواب درج ہیں، جن سے سوال کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔ غالباً، حضرت مولانا سفر میں ہوں گے، کسی نے تحریری صورت میں نمبروار سوال کیے اور مولانا نے کاغذ پر نمبر وار جواب لکھ دیے۔ یہ 18۔ جمادی الاخریٰ 1380 ہجری (8۔دسمبر 1960ء) یعنی آج سے 54 سال پہلے کی تحریر ہے۔

جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کے علماء سے بھی لوگ لازماً فتوے پوچھتے ہوں گے۔ معلوم نہیں جامعہ میں اس کی حفاظت کا انتظام ہے یا نہیں۔ بہرحال ذیل میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے جوابات ملاحظہ فرمایے۔ اچھا ہوا کہ مولانا عنایت اللہ امین نے یہ تحریر ارسال فرمادی اور محفوظ ہوگئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوالات کے جوابات نمبروار ملاحظہ فرمائیں۔

نمبر 1۔ ایسے امام کو مستقل طور پر مقرر کرنا جائز نہیں۔ بفحوائے حدیث اجعلوا ائمتکم خیارکم

اگر اتفاقی طور پر ایسا آدمی نماز پڑھا رہا ہو اور اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی۔

نمبر 2۔ اگر مقتدی مذکورہ اوصاف کے امام کو الگ کر کے، کسی اچھی صفات کے امام کو مقرر کر لیں تو مندرجہ بالا حدیث کے مطابق ایسا کرنا ضروری اور واجب ہے۔ اور مقرر کیا جانے والا امام ہرگز کسی گناہ کا مرتکب نہیں۔

نمبر 3۔ بے نماز کا جنازہ جائز نہیں!

نمبر 4۔ بے نماز کا جنازہ کرنے والا گناہ کا مرتکب ہے! فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین (قرآن مجید) وحدیث من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر و نیز آیت شریفہ ولا تصل علی احد منھم مات ابدا۔ الآیۃ

نمبر 5۔ ایسا کرنا اچھا ہے۔ اگر امام بے نمازوں کو جنازہ سے نکال سکتا ہے تو نکال دے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

محمد علی محی الدین لکھوی

18۔6۔80 ہجری

وفات

حضرت مولانا محمد علی لکھوی کم و بیش پینتالیس سال مسجد نبوی میں قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ انھوں نے 19۔دسمبر 1973ء (23۔ذیقعدہ 1393ھ) کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

(اس فقیر نے اپنی ایک کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مولانا ممدوح پر مفصل مضمون لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو از صفحہ 195 تا 257)

دورِ جوانی میں مولانا محمد علی لکھوی کی پہلی شادی مولانا عبدالقادر لکھوی کی صاحب زادی اور استاذِ پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی، جن سے چار بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔

دو عربی مکتوب بنام حافظ محمد لکھوی مرحوم اور مولانا محی الدین لکھوی مرحوم

(ارسال کردہ حسین علوی بن مولانا محمد علی لکھوی، از مدینہ منورہ)

حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد ایک عرب گھرانے کی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اس خاتون سے ان کی نرینہ اولاد دو بیٹے ہوئے، حسن علوی اور حسین علوی۔ مولانا نے عیسوی حساب سے ۱۹۔ دسمبر ۱۹۷۳ء کو وفات پائی۔ قمری حساب سے یہ ۲۳۔ ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ بنتا ہے۔ مولانا کی وفات پر ان کے پاکستانی فرزند مولانا محی الدین لکھوی مرحوم نے اپنے عرب بھائی حسین علوی کو تعزیتی خط لکھا، مولانا محی الدین لکھوی کے صاحب زادۂ گرامی حافظ محمد لکھوی مرحوم نے بھی اپنے اس چچا (حسین علوی) کو تعزیتی مکتوب ارسال کیا تھا۔ حسین علوی صاحب نے دونوں کے مکتوبات کا علاحدہ علاحدہ جواب دیا۔ لیکن حافظ محمد کے مکتوب کا (جو حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے پوتے تھے) اپنے والد کی بیماری اور وفات سے متعلق تفصیل سے جواب لکھا اور مولانا محی الدین کو اختصار سے۔ ذیل میں دونوں مکتوب درج کیے جاتے ہیں، پہلے حافظ محمد لکھوی کے نام کا اور پھر مولانا محی الدین کے نام کا۔ دونوں مکتوب مجھے ازراہِ کرم مولانا محمد ابراہیم خلیل (ساکن حجرہ شاہ مقیم) نے خود لاہور تشریف لا کر عنایت کیے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Saudi Arabia	المملكة العربية السعودية:
University of Riyad	جامعة الرياض
Faculty of Commerce	كلية التجارة
Department of Business Administnation	قسم ادارة الاعمال

الى ابن أخي العزيز حافظ محمد حفظه اللّٰه و رعاه

السلام عليك و على من حولك و رحمة الله و بركاته و بعد فقد وصلتني رسالتك الغالية و التي كانت لي و لعمك حسن و كل ما فيها فهمته و أنني اشكرك على حسن تقريرك و عزائك لي في الفقيد المرحوم جدك جعل اللّٰه الجنة مثواه و اعاننا جميعا على تحمل ألم الحزن و الفراق و انني لا اشكرك فقط على حسن اخلاقك بل انني اشاطرك و اقتسم معك الحزن و الهوان فهو ابي و مثلي الأعلى في هذه الدنيا و هو كفو من جدك و قدوتك الحسنة و انني واثق انه من اهل الجنة الأبرار الذين حبا هم الله برحمته و مغفرته و أنعم عليه بأن يكون قريبا منه و من حبيبه رسول الله صلى الله عليه وسلم و اصحابه الابرار.

و لقد فهمت منه خطابك انكم تريدون شيئا من التفصيل عن اسباب وفاته رحمه الله فكما تعلمون ان الوالد كان مريضا منذ مدة طويلة و كان يأبى اى علاج حديث فلقد كان يعاني اكثر ما يعاني من الغتاق في الجانب الايسر و كذلك من حصر البول فلقد كان يقاسي من هذين الفاحتين اكثر منه عشرين عاما و قد كنت الح عليه بان يعمل عمليه و لكنه لم يوافق رحمه اللّٰه فكما اخبرني هو قبل وفاته رحمه الله انه في اوائل شهر ذى القعدة صلى في الحرم النبوى الشريف صلاة العشاء و هو في طريقه الى المنزل شعر ببرد شديد و بشريرة قوية و بصرها كذلك الحمى الشديدة و ابصال ر استمر على هذا الحال مدة اسبوعين و كان يأبى تعاطي اى دواء او غذاء و يرفضه

رفضا باتا و كان دائما يقول للوالدة نادوا حسين فذهبت الى المدينة و ذلك عند الاطلاع على احواله فرأيته فى مرض شديد و قررت بناء على رغبته بان اصطحبه معى الى الرياض (حيث عيشتي و عملى) و كذلك اصطحبت والدتى لنكون جمعيا فى خدمته و بعد بقائنا يومين فى المنزل رأيت حالته ليست فى تحسن فهو لم يزل مصرًا على عدم تعاطى اى غذاء او دواء و بعد ذلك قررت أن ادخله فى المستشفى۔ صلنا على غرفة خامسة و بعد انه اجردا عليه الاطباء فحوصات عديدة و جدوا او الكليتان قد توقفتا عن العمل فكانوا يحاولون كل جهدهم على ان يصلحوا و يعالجوا الكليتان و لكن يد الله كانت أقوى من كل المحاولات و بعد مضى اربعة ايام فى المستشفى سلم روحه العزيزة للواحد القهار الدائم الحى الذى لا يموت و كان سبب الوفاة تسمم فى الدم نتيجة فشل الكليتان فى اداء اعمالها (اى تصفيه البول من المواد السامة) و كان ذلك يوم الاربعاء الساعة الثانية و الربع قبل العصر الموافقة ذى القعدة و بعد ذلك قررت أن ندفنه فى المدينة فسرنا انا و الوالدة و جثمانه الطاهر طول الليل ليلة الخميس فوصلنا ظهر الخميس المدينة و صلينا عليه صلاة المغرب ليلة الجمعة و صلى عليه عشرات الالوف من الاهالى و الحجاج المسلمية و بعد ذلك دفن جثمانه في بقيع المدينة بجوار والده محى الدين و بعد ذلك مكثت هناك ثلاثة ايام للاستقبال المعزين و بعدها عدت الى الرياض اما من ناحية ما ذا كان يقول و ما ذا اوصى فلقد كنت انا والوالدة لانفارقه و لا لحظة

و لقد توقف عن الكلام تماما تقريبا من مرة سبعة ايام قبل وفاته رحمه الله و قبل ذلك كان قد وصله خطاب من اخى محى الدين و قد قرأته له و كان يهز راسه اى انه فهم و كان قبل ذلك قد حدثني فى انه يرغب الحج هذا العام و بعد ذلك كان يريد الذهاب الى الباكستان و ذلك بصير من جعل المسجد و ماحوله وقفاً لله تعالىٰ هذا كل ما كان فى نيته و اننى أمل أن تخبر اباك و عمك معين الدين بان يحققوا له هذه الأمنية و كان مجيئه الى الرياض اولًا فى أنه إذ اتاناه اللّٰه فسوف اقوم انا بما عدته فى السفر جوا الى كراتشى و لكن شاء الله ما شاء۔ هذا ما لزم بلغ عزائى علىٰ والدك و عمك معين الدين و على عماتك امة السلام و عائشة و امة الرحمن و رضية و ابنائهم و بناتهم و السلام عليكم و رحمة الله و بركاته.

المخلصى عمك

حسين علوى

۱۷ ذى الحجة عصر ۹۳

عنوانى هو

جامعة الرياض كلية التجارة

قسم ادارة الاعمال

الرياض۔ المملكة العربية السعودية

بسم اللّٰه الرحمن الرحيم

الى اخى الكريم محى الدين سلمه الله

السلام عليكم و رحمة الله و بركاته و بعد:

فقد بلغكم ما بلغكم من اخبار الحزن و الالم في فقيدنا الغالي و رائدنا الكبير و الدنا الحبيب رحمه الله و جعل الجنة مثواه فانني يا اخي العزيز اتقدم اليك معزيا و مواسيا في فقيدنا الراجل و نسأل الله ان لا يرينا مكروها في عزيز آخر و سوف تجدون كثيرا من التفاصيل عن سبب وفاة والدنا في خطاب ابنكم حافظ محمد و لا أرى ضرورة لتكرار ذلك فهي قصة طويلة و مؤطة كما ارجو ان تبلغوا عزائي الى أخي معين الدين و على اخواتنا امة السلام و عائشة و امة الرحمن و رضية و بناتهن و ابنائهن و السلام عليكم و رحمة الله و بركاته.

اخيكم

حسين علوى

١٧ ذى الحجة ٩٣

عنواني هو

جامعة الرياض كلية التجارة۔ قسم ادارة الاعمال

الرياض المملكة العربية السعودية

تصانیف

حضرت مولانا ممدوح درس وتدریس میں مشغول رہنے کی وجہ سے تصنیفی کام نہیں کر سکے۔ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کا پتا چل سکا ہے۔

1۔صلوۃ المسلمین: یہ کتاب نماز سے متعلق ہے اور نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے، تقسیم ملک سے قبل اس کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔اب یہ کتاب نایاب ہے۔

2۔مدنی قاعدہ: یہ قاعدہ بچوں کے لیے لکھا تھا جو کسی زمانے میں بہت مقبول ہوا

تھا، اب یہ بھی نایاب ہے۔

3۔ رسالہ رفع الیدین: اس میں ائمہ احناف کی کتابوں سے نماز میں رفع الیدین کرنے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ یہ اپنے موضوع کا اہم رسالہ ہے اور اردو زبان میں ہے۔ مولانا نے یہ رسالہ 1932ء میں اس وقت لکھا اور شائع کیا تھا جب وہ مولانا محمد داؤد غزنوی کے زمانہ قید میں چینیاں والی مسجد لاہور میں خطابت و تدریس کی خدمات انجام دیتے تھے۔



چھٹا باب

مولانا عبدالقادر لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

دودمانِ لکھویہ کے ایک رَفیع المنزلت عالم حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی تھے جو حکیم محمد شریف کے بیٹے اور حافظ محمد لکھوی کے بھتیجے تھے۔ 1834ء (1249ھ) کو لکھو کے میں پیدا ہوئے۔ علوم آلیہ وعالیہ کی تحصیل اپنے عمِّ محترم حافظ محمد لکھوی سے کی۔ علم حدیث کی مزید تعلیم کے لیے مدرسہ غزنویہ امرتسر میں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کی خدمت میں گئے اور ان سے سندِ حدیث لی۔ وزیر آباد میں حضرت حافظ عبدالمنان کا سلسلۂ درس حدیث جاری تھا، ان کے باب عالی پر بھی دستک دی اور ان کی سندِ حدیث سے سعادت اندوز ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنے آبائی مسکن لکھوکے میں مسندِ درس بچھائی۔

تحصیل علم کے لیے بے شمار لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ ہر علم کی ابتدائی کتابوں سے لے کر انتہائی کتابوں تک پڑھاتے رہے۔ فراوانی علم کے ساتھ ساتھ اللہ نے انھیں ورع وتقویٰ کی نعمتِ بے پایاں سے بھی نوازا تھا۔ ایثار کا یہ عالم کہ انھیں مدرسے کی طرف سے اس وقت تین روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، اسی کو کافی سمجھا اور زندگی بھر اسی پر قانع رہے۔ ویسے بھی وہ انتہائی سستا زمانہ تھا اور گندم ایک روپیہ من تھی۔

حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی بھی وہیں تھے۔ ان سے کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو اسے مولانا عبدالقادر کی طرف بھیج دیتے۔ فرماتے وہ علم اور عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور مسئلے وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

مولانا عبدالقادر لکھوی کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا عبدالاوّل غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا عبدالوہاب دہلوی، مولانا محمد حسن لکھوی اور مشہور صاحبِ کرامات بزرگ مولانا کمال الدین ڈوگر (موضع چھینبیاں والی ضلع فیروز پور) جیسے اعاظم رجال شامل ہیں۔

مولانا عبدالقادر لکھوی تقریباً پچاس برس طلبا کو تفسیر وحدیث اور دیگر علوم کی تعلیم دیتے رہے۔ انھوں نے 1924ء (1342ھ) کو وفات پائی۔ وہ مولانا محی الدین اور معین الدین لکھوی کے نانا تھے۔ ان کا تذکرہ میں نے اپنی ایک کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں کیا ہے۔ پوری کوشش کے باوجود ان کے اتنے ہی حالات ملے ہیں جو قارئینِ کرام کے مطالعہ میں آئے۔

مولانا عبدالقادر لکھوی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے تین بیٹے پیدا ہوئے سعداللہ، عبداللہ اور احمد اللہ۔ دوسری شادی مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ کے لودھی خاندان میں حضرت حافظ محمد لکھوی کی سالی سے ہوئی۔ اس خاتون کے بطن سے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی ولادت ہوئی، جنھوں نے تدریسی حلقوں میں استاذِ پنجاب کے طور پر شہرت پائی اور تمام عمر درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی کے ماموں تھے، ان کا تذکرہ اگلے باب میں آرہا ہے اور مولانا محی الدین لکھوی کے لائق احترام اساتذہ میں بھی آئے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

میری کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں بھی ان کے دست یاب حالات مرقوم ہیں۔



ساتواں باب

مولانا عطاء اللہ لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی اپنے آبائی مسکن لکھو کے (ضلع فیروز پور) میں 1882ء (1299ھ) کو پیدا ہوئے۔ چار پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو قاری عبدالعزیز سے قرآن مجید پڑھا۔ پھر علوم دینیہ کی تعلیم کا آغاز کیا۔ ان کے والد مکرم حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی کا وہاں کے مدرسہ محمدیہ میں سلسلۂ تدریس جاری تھا، ان سے حدیث وفقہ، صرف ونحو اور دیگر مروّجہ علوم کی تحصیل کی۔ اس کے بعد لاہور کے مدرسہ نعمانیہ میں داخلہ لیا اور مولانا غلام احمد سے استفادہ کیا۔ پھر امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں کتب حدیث پڑھیں۔ اور حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی سے سندِ حدیث لی۔

اس کے بعد منطق وفلسفہ وغیرہ فنون کی تکمیل کے لیے رام پور، بریلی اور سہارن پور وغیرہ کے مدارس میں پہنچے اور وہاں کے اساتذہ سے کئی سال حصولِ علم میں مشغول رہے، لیکن کس عالم سے کیا پڑھا اور کس مدرسے میں کتنا عرصہ رہے؟ اس کا پتا نہیں چل سکا۔

بہرکیف فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عطاء اللہ لکھوی کی شادی مفسر قرآن حضرت حافظ محمد لکھوی کی صاحب زادی رقیہ بی بی سے ہوئی اور مدرسہ محمدیہ (لکھوکے) میں پڑھانا شروع کیا۔ یہ مدرسہ کافی مدت سے بلا نام جاری تھا۔ اس کا نام مدرسہ محمدیہ حافظ محمد لکھوی نے 1857ء کے لگ بھگ رکھا تھا۔ مسند درس پر ان کے والد عالی قدر حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی متمکن تھے۔ اب یہ دونوں باپ بیٹا (مولانا عبدالقادر لکھوی اور مولانا عطاء اللہ لکھوی)

مدرسہ محمدیہ میں طلبا کو تعلیم دینے میں مصروف ہوئے۔

حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی بے حد متواضع، نہایت منکسر، حسن اخلاق کا حسین ترین مرقع، عالی کردار، بلند ہمت، طلبا کے انتہائی خیر خواہ اور کشادہ ذہن معلم۔ تکلف اور تصنع سے نفور۔ سادہ زندگی بسر کرتے اور سادہ لباس پہنتے تھے۔

فجر کی نماز پڑھانے کے بعد قرآن کا درس دیتے، جس میں طلباء سے قرآن کے بعض مقامات کی نحوی ترکیبات اور صرفی تعلیلات پوچھتے۔ درس آسان زبان میں دیا جاتا تھا۔

موضع لکھوکی کے بالکل قریب ایک نہر تھی۔ مولانا ممدوح شام کے بعد طلبا کو نہر پر لے جاتے اور ان سے "ابواب الصرف" سے باب سنتے اور انھیں صرفی نحوی مسائل بتاتے۔ ایک موٹی لاٹھی ہاتھ میں رکھتے، جس کا اوپر کا سرا تھوڑا سا مڑا ہوا تھا، پنجابی میں اسے ''کھونڈا'' کہا جاتا ہے۔ چلتے وقت اسے چوڑائی میں کمر کے اوپر کر کے دونوں بازوؤں سے تھام لیتے۔ پھر نہر کے کنارے چل کر یا کہیں بیٹھ کر طلباء سے مختلف علوم کے بارے میں سوال وجواب کا سلسلہ شروع فرما دیتے۔ جس طالب علم کا نام عبدالرشید ہوتا اسے بے تکلفی سے پنجابی میں فرماتے۔ "او چھیدے توں دس ایہ کی صیغہ اے۔" سیدھی اور صاف پنجابی میں بات کرتے۔ الفاظ کے استعمال میں بالکل تکلف نہ فرماتے۔

تفسیر، حدیث، فقہ، عربی ادبیات، منطق، فلسفہ، معانی و بیان اور صرف ونحو وغیرہ تمام علوم کی کتابیں شروع سے آخر تک وہ بے شمار مرتبہ پڑھا چکے تھے اور یہ کتابیں ان کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہوگئی تھیں۔ صرف ونحو میں بالخصوص مرتبۂ امامت پر فائز تھے اور اس موضوع کے چھوٹے بڑے تمام مسائل پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔

ان کی مجلس میں کوئی شخص کسی موضوع پر بات کرتا تو توجہ سے اس کی بات سنتے۔ اس کا انھیں علم بھی ہوتا تو اسے محسوس نہ کراتے اور بات سنتے سنتے فرماتے: "اچھا جوان پھر کیا ہوا؟"

حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی جامعہ محمدیہ میں کم وبیش 48 برس خدمت تدریس میں مشغول رہے اور بے شمار طلبا وعلما نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے اور انھیں

"استاد پنجاب" کا لقب عطا ہوا۔

مولانا ممدوح قناعت پسند اور ایثار پیشہ عالم دین تھے۔ ان کے تلامذہ کرام کی وسیع فہرست میں چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی: موصوف بہت بڑے عالم و محقق اور معلم و مصنف تھے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی: مشہور مدرس اور شارح سنن نسائی۔

مولانا عبداللہ اوڈ: جماعت غربائے اہل حدیث پنجاب کے امیر تھے۔

مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی: ان سے لاتعداد حضرات نے اخذ فیض کیا۔

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی: مشہور عالم تھے۔ اگست 1947ء میں شہادت ہوئی۔

مولانا عبداللہ بھوجیانی: ممتاز عالم و مدرس۔ اگست 1947ء میں شہادت ہوئی۔

مولانا عبدالرحیم بھوجیانی: نامور مدرس، اگست 1947ء کو جام شہادت نوش کیا۔

مولانا عطاء اللہ بڈھیمالوی: بڈھیمال (ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب) کے مشہور عالم۔

سید مولانا بخش کوموی: موضع کوم ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب کے صالح ترین بزرگ، تقسیم ملک کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ آ گئے تھے، وہیں فوت ہوئے۔

مولانا عبدالقادر زیروی: زیرہ (ضلع فیروز پور) کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد میاں چنوں آ گئے تھے۔

مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی: بہت بڑے مدرس و مصنف اور مترجم۔ مشہور شیخ الحدیث۔

مولانا معین الدین لکھوی: مشہور سیاست دان اور معروف عالم دین۔

حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی: بے شمار علما و طلبا کے استاذ گرامی قدر۔

مولانا عبدالقادر حصاری: تصنیف و تالیف، مقالہ نگاری اور تدریس میں بڑی شہرت پائی۔

مولانا محی الدین لکھوی: مولانا مرحوم کے حقیقی بھانجے اور داماد

مولانا محمد یوسف: دارالحدیث راجووال کے بانی اور مہتمم۔

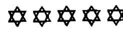
مولانا عبدالرحیم رحمانی: متعدد مدارس میں فریضہ تدریس انجام دیتے رہے۔

حافظ محمد بھٹوی: نامور مدرس وعالم

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی: مولانا عطاء اللہ لکھوی کے فرزند کبیر اور ممتاز مدرس

اس جلیل القدر عالم نے 26۔فروری 1952ء (7۔ربیع الاول 1372ھ) کو بدھ کے روز پانچ بجے جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں وفات پائی اور چک نمبر 18ون ایل (نزد رینالہ خورد) میں دفن کیے گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے فرزندان گرامی اور پوتے ماشاء اللہ سب علمائے دین ہیں جن کا تذکرہ میں نے اپنی مختلف کتابوں میں کیا ہے۔



آٹھواں باب

مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

کتاب کے گزشتہ سات ابواب میں سے پہلے باب میں لکھوی خاندان کا پس منظر بیان کیا گیا ہے اور اس سے آگے چھے ابواب میں اس عظیم القدر خاندان کے بزرگان کرام کے ضروری حالات معرض تحریر مین لائے گئے ہیں۔اب آئندہ سطور سے ''مولانا محی الدین لکھوی کے تذکرہ'' کا آغاز کیا جاتا ہے، جو اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔اس میں ان کے اساتذہ گرامی قدر کا ذکر بھی کیا جائے گا اور ان کے ہم جماعت اور دیگر دوستوں اور تعلق داروں کا تعارف بھی کرایا جائے گا، ان کی علمی اور تدریسی سرگرمیوں کی وضاحت بھی کی جائے گی۔ان کے طریقِ تبلیغ کی نشان دہی بھی کی جائے گی اور دیگر واقعاتِ زندگی سے بھی قارئین کو روشناس کرایا جائے گا۔شروع سے لے کر آخر تک ان کی پوری زندگی حسنات سے مملو اور خیرات سے معمور تھی، ان شاء اللہ کوشش کی جائے گی کہ ان کے چھوٹے بڑے تمام واقعات جو میرے علم میں آئے خوانندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کردیے جائیں تو آیے اب آئندہ کا سفرِ تحریر اس عالم باعمل کی رفاقت میں طے کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

پاکستان میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی کی اولاد دو بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ بیٹے تھے مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی۔لیکن اگلے صفحات میں مولانا محی الدین لکھوی کے احوالِ زندگی بیان کرنا مقصود ہے۔ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

محی الدین بن محمد علی بن محی الدین عبدالرحمٰن بن حافظ محمد بن حافظ بارک اللہ بن حافظ احمد بن حافظ محمد امین بن عالم شاہ بن ابوداؤد ڈھنگ شاہ۔

مولانا محی الدین سے لے کر آگے بتیسویں پشت تک یہ سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ علوی خاندان ہوا۔

ولادت

مولانا محی الدین اپریل 1914ء (جمادی الاولیٰ 1332ھ) کو اپنے آبائی گاؤں لکھوکے میں پیدا ہوئے۔ ددھیال اور ننھیال دونوں گھرانے ایک ہی دادا (حافظ بارک اللہ لکھوی) کی اولاد تھے اور دینی و دنیوی محاسن سے آراستہ۔!

ان بزرگانِ عالی قدر کے ضروری حالات گزشتہ صفحات میں بیان کیے گئے ہیں جو خوانندگانِ ذی احترام کے مطالعہ میں آئے۔

مولانا محی الدین لکھوی اپنے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی سے سات سال بڑے تھے اور چار بہنوں میں سے دو بہنوں سے چھوٹے اور دو سے بڑے۔ چھوٹی بہنیں مولانا معین الدین سے بھی چھوٹی ہیں۔ بڑی بہنوں میں سے ایک کی شادی مولانا قدرت اللہ لکھوی سے ہوئی اور ایک کی مولانا عبدالغفار لکھوی سے۔ یہ دونوں بہنیں وفات پاگئی ہیں اور ان کے شوہر بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے ہیں۔ چھوٹی دونوں بہنیں اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور ان کے شوہر انتقال کر گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کے شوہر کا نام زین العابدین تھا اور ایک کا پروفیسر سعید احمد۔ دونوں میرے دوست تھے جب کہ مولانا قدرت اللہ اور مولانا عبدالغفار لکھوی اس فقیر پر شفقت فرماتے تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ فوت شدگان کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو خیر و عافیت سے نوازے رکھے۔

مولانا محی الدین کی چاروں بہنیں اللہ کی مہربانی سے بیٹے بیٹیوں، پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں والی ہیں۔

تعلیم

مولانا ممدوح کے حصولِ علم کا آغاز گھر سے ہوا۔ اپنے آباواجداد کی طرح ذہین بھی تھے اور پڑھنے کا بے حد شوق بھی تھا۔ چھوٹی عمر میں قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ پھر کچھ آگے بڑھے تو اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھنے لگے۔ ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں پڑھی جانے والی مسنون دعائیں یاد کرنے کا سلسلہ بھی چلا۔

پانچ سال کو پہنچے تو مقامی مڈل سکول میں داخل کرادیے گئے اور مڈل تک سکول کی تعلیم حاصل کی۔ اس اثناء میں اپنے والد مکرم اور لائق تکریم ماموں مولانا عطاء اللہ لکھوی سے دینیات کی نصابی کتابیں بھی بالالتزام پڑھتے رہے۔

مولانا محی الدین کے نانا حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی کا سانحۂ ارتحال 1924ء میں پیش آیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر دس سال کی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ رفیع المرتبت نانا نے بھی اپنے اس ہونہار نواسے کو کچھ تعلیم دی ہوگی۔ بسم اللہ عام طور پر بزرگوں سے کرائی جاتی ہے۔ عین ممکن ہے والدہ مکرمہ اور والد محترم نے انھی جلیل القدر بزرگ سے بسم اللہ کرائی ہو اور انھوں نے نواسے کے لیے علم وعمل اور صحت وعافیت کی دعا فرمائی ہو۔ لیکن شروع سے آخر تک پورا قرآن مجید انھوں نے اپنی والدہ محترمہ سے پڑھا۔

سرکاری سکول میں انہوں نے پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک مندرجہ ذیل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

1۔ ماسٹر آتما رام: یہ ان کے ابتدائی جماعتوں کے ہندو استاد تھے۔

2۔ ماسٹر جان محمد: یہ بھی ابتدائی جماعتوں کے استاد تھے۔

3۔ ماسٹر رحمت اللہ: یہ اپر مڈل کلاس کے استاد تھے۔

4۔ مولوی حیدر علی لکھوی: یہ ان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپر مڈل کلاس کو پڑھاتے تھے۔

5۔ مولوی محمد ادریس: یہ اپر مڈل کلاس کو عربی پڑھاتے تھے۔

6۔ ماسٹر تلسا سنگھ: یہ کلاس انچارج تھے اور ریاضی پڑھاتے تھے۔

میٹرک کا امتحان

مقامی سرکاری سکول میں مڈل پاس کرنے اور اپنے آبائی دینی مدرسے میں دینیات کے نصاب کی کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا محی الدین نے فیروز پور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ لیا اور محنت کر کے میٹرک کے انگریزی مضمون کا امتحان دیا اور 587 نمبر حاصل کیے۔ ان کا انگریزی اور اردو کا خط نہایت عمدہ تھا۔ عربی بھی خوب صورت لکھتے تھے۔

دینیات کی تعلیم

صرف ونحو اور عربی ادبیات کی تمام نصابی کتابیں اپنے آبائی مدرسے میں مولانا عطاء اللہ لکھوی اور مولانا محمد علی لکھوی سے پڑھیں۔ اس زمانے میں فارسی کی کتابیں بھی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں خاص طور سے نصاب کا حصہ ہوتی تھیں، مولانا محی الدین نے یہ کتابیں بھی اپنے مدرسے میں پڑھیں۔ فارسی کے بہت سے اشعار انھیں زبانی یاد تھے جو عام گفتگو میں وہ پڑھا کرتے تھے اور ان اشعار کا مطلب بھی سمجھاتے تھے۔

کتبِ حدیث پڑھنے کا آغاز

حدیث کی کتابیں پڑھنے کا آغاز انھوں نے لکھوکی کے مدرسہ محمدیہ سے کیا، جسے بعد میں جامعہ محمدیہ کہا جانے لگا۔ بلوغ المرام پڑھنے کے بعد مشکوٰۃ شروع کی۔ لیکن کس طرح شروع کی اور کس سے شروع کی۔ یہ واقعہ حافظ محمد اسحاق حسینوی کی زبانی سنیے!

حافظ محمد اسحاق (متوفی 4۔ جولائی 2002ء) معروف عالم اور نامور مدرس تھے۔ وہ حسین خاں والا ضلع قصور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے حالات میں نے اپنی ایک کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں لکھے ہیں۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ بلوغ المرام کا ابتدائی نصف حصہ پڑھ چکے تھے اور باقی نصف حصہ مولانا عطاء اللہ لکھوی سے پڑھ کر ان سے مشکوٰۃ شریف شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہاں پہنچے تو حضرت مولانا لکھوی نے فرمایا کہ پڑھائی شروع ہو چکی ہے اور طلبا کے اسباق کی تقسیم ہوگئی ہے۔ اب داخلہ مشکل ہے۔ یہ الفاظ سن کر وہ سخت پریشان ہوئے۔ انھی دنوں حسنِ اتفاق سے وہاں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی چلے گئے۔ انھوں نے دہلی میں نصابی کتب حدیث پڑھ لی تھیں اور حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے مختلف فنون کی بعض کتابیں پڑھنے کے خواہاں تھے۔ اب طے پایا کہ مولانا لکھوی انھیں فنون کی کتابیں پڑھائیں گے اور وہ طلبا کو حدیث کی بعض کتابیں پڑھائیں گے، چنانچہ اس منصوبے کے مطابق مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا محی الدین لکھوی، مولانا معین الدین لکھوی اور چند دیگر طلبا مشکوٰۃ شریف پڑھنے لگے۔ لیکن اس تعلیمی سال میں مشکوٰۃ پوری نہیں پڑھی جا سکی۔ [1]

اس سے پتا چلا کہ مولانا محی الدین لکھوی نے طالب علمی کے ابتدائی دور میں اپنے مسکن لکھوکے میں مشکوٰۃ شریف کا کچھ حصہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے پڑھا۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا مولانا محی الدین لکھوی اپنے آباؤ اجداد کی طرح ذہانت کی بلند سطح پر فائز تھے اور تحصیلِ علم میں تیز۔ ابتدائی عمر ہی میں انھوں نے مختلف فنون کی بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ قرآن کا ترجمہ بھی مکمل کر لیا تھا۔ مقامی سکول میں مڈل پاس کر کے فیروز پور کے ہائی سکول میں میٹرک تک کی منزل طے کر لی تھی۔ اس کے بعد حدیث کی بعض نصابی کتابوں سے بھی فارغ ہو گئے تھے۔ فارسی زبان سے بھی انھیں دلچسپی تھی اور اس زبان کی جو کتابیں اس دور کے مدارسِ دینیہ میں پڑھائی جاتی تھیں، وہ پوری توجہ سے پڑھ لی تھیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب ''گلستان حدیث'' ص 320

انسان زندگی کی بہت سی منزلوں سے گزرتا ہے اور ہر منزل دوسری منزل سے مختلف ہوتی ہے۔ بچپن کی منزل اور ہے، جوانی کی اور ہے۔ یہ منزلیں مولانا محی الدین لکھوی نے بھی طے کیں اور نہایت خوب صورتی سے طے کیں۔ بعض اوقات دوستوں سے ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی چلتا رہا اور ایک خاص حد میں رہتے ہوئے لطیفے بھی سنتے سناتے رہے۔ وہ خشک مزاج اور تنگ دل عالم نہیں تھے۔ اسی طرح زندگی بسر کرتے تھے، جس طرح حالات کے مطابق بسر کی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ کتاب کے آئندہ ابواب میں بیان ہوگی۔



نواں باب

مرکز الاسلام اور اس کے مکین 1937ء میں

مرکز الاسلام کے متعلق مولانا محمد علی لکھوی کے تذکار میں بہت سی ضروری باتیں قارئین کرام کے ملاحظے میں آچکی ہیں۔ یہاں بھی چند گزارشات سنتے جایے۔ مرکز الاسلام کا قیام کب عمل میں آیا؟ کئی دفعہ پوچھنے کے باوجود اس کی صحیح تاریخ تو کسی نے نہیں بتائی، بس یہی سنتے رہے کہ 1928ء کے لگ بھگ مولانا محمد علی نے اس کی بنیاد رکھی۔ بہرکیف جو ہم نے 1937ء میں وہاں جا کر دیکھا، وہ یہ تھا اور اگست 1947ء تک یہی رہا۔ اس کی دو ڈھائی ایکڑ کی چار دیواری کے اندر ایک چھوٹی سی پختہ اینٹوں کی مسجد تھی اور ایک مولانا کا گھر تھا جو کچی اینٹ کا تھا۔ صرف دروازے پر چند پختہ اینٹیں لگائی گئی تھیں۔ طلباء اور مہمانوں کے لیے تین بڑے بڑے کچے کوٹھے تھے۔ ایک فتح محمد لوہار کا مکان تھا، جسے پھتا کہا جاتا تھا۔ اس میں ایک وہ خود رہتا تھا، ایک اس کی بیوی اور ایک اس کا بیٹا یحییٰ۔ یہ کل تین افراد تھے۔ ایک گھر قمر دین ترکھان کا تھا، جس میں وہ اور اس کا بیٹا موسیٰ رہائش پذیر تھے۔ پانی کے لیے ایک چھوٹا سا کنواں تھا، جسے پنجابی میں "کھوہی" کہا جاتا ہے۔ اس سے ڈول کے ذریعے مولانا کے گھر کے لوگ [illegible] پانی پہنچتے تھے اور باہر کے بھی۔ اسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ پردے کا پورا اہتمام تھا، دونوں طرف سے کوئی کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد فتح محمد کا تو پتا نہیں چلا کہ کہاں گیا۔ البتہ قمر دین اور اس کے بیٹے موسیٰ سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ 1953ء میں مولانا محمد علی لکھوی مدینہ منورہ سے پاکستان

تشریف لائے۔ میں اس وقت اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ پتا چلا کہ وہ موضع کھرل کلاں میں مقیم ہیں، جہاں ان کی زمینیں بھی ہیں۔ میں ان کو سلام عرض کرنے کے لیے ایک دوست کے ساتھ شام کے بعد جیپ پر لاہور سے روانہ ہوا۔ خیال یہ تھا کہ جلد وہاں پہنچ جائیں گے، لیکن راستے میں دیر ہوگئی اور گیارہ بجے وہاں پہنچے۔ اندھیری رات میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کدھر جانا ہے۔ جیپ سڑک پر کھڑی کی اور میرا ساتھی وہیں رہا۔ رات کو راستہ بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ میں اکیلا کھیتوں کھالوں میں سے گزرتا ہوا بڑی مشکل سے گاؤں میں داخل ہوا تو ایک طرف سے آواز آئی۔

کون ہے؟

میں نے کہا مسافر ہوں۔ اتنے میں دو آدمی ایک مکان سے باہر نکلے۔ وہ تھے قمر دین اور اس کا بیٹا موسیٰ۔! میں انھیں دیکھ کر حیران، وہ مجھے دیکھ کر متعجب۔ انھیں بھی مجھ سے مل کر خوشی ہوئی، میں نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ پوچھا: اس وقت کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا مولانا محمد علی صاحب کو سلام کرنے آیا ہوں۔ وہ مجھے ان کے گھر لے گئے۔ مولانا اتفاق سے جاگ رہے تھے۔ میں نے سلام کیا اور چند منٹ ان کی خدمت میں رہا۔ پھر رات ہی کو لاہور واپس آگیا۔ ان کی عرب اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ آئی تھیں۔ مولانا نے مولانا داؤد غزنوی کی خیریت پوچھی اور فرمایا میں چند روز تک لاہور آؤں گا۔ گزارش کا مقصد یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد مرکز الاسلام کے باشندے قمر دین اور اس کے بیٹے موسیٰ سے ایک ہی دفعہ کھرل کلاں میں ملاقات ہوئی۔

میں پہلی دفعہ 1937ء میں مرکز الاسلام گیا تھا۔ کوشش کروں گا کہ اس باب میں صرف اسی سال کے واقعات تک محدود رہوں۔ لیکن وہاں جانے کا پس منظر بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں ضروری ہے۔ میرا آبائی تعلق مشرقی پنجاب کی ریاست فرید کوٹ کے شہر کوٹ کپورہ سے تھا۔ مولانا محمد علی لکھوی کے تذکرے میں بتایا گیا ہے کہ 1935ء میں والیٔ ریاست نے وہاں کی ایک مسجد پر قبضہ کر کے اسے شہر کی میونسپل کمیٹی کا دفتر بنا دیا تھا، جس

پر مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ اس وقت کوٹ کپورہ کی جامع مسجد کے خطیب مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی تھے۔ انھوں نے خطبات جمعہ میں والیٔ فرید کوٹ کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی۔ اس کے نتیجے میں حکومت نے انھیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ اگرچہ دو چار دن کے بعد انھیں رہا کر دیا گیا تھا، لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ آئندہ ان کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔

1936ء کے آخری دنوں کی بات ہے کہ مولانا محمد علی لکھوی کوٹ کپورہ تشریف لے گئے اور انھوں نے وہاں کی انجمن اصلاح المسلمین کے ارکان سے فرمایا کہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا اب یہاں رہنا مناسب نہیں، آپ اجازت دیں کہ میں انھیں اپنے مسکن مرکز الاسلام لے جاؤں، وہاں ان سے میرے دونوں بیٹے محی الدین اور معین الدین بھی تعلیم حاصل کریں گے اور مختلف مقامات کے دیگر طلبا بھی استفادہ کریں گے۔ انجمن کے ارکان نے ان کے فرمان پر عمل کرنے کی ہامی بھر لی، لیکن شرط یہ عائد کی کہ وہ ان کے دو شاگردوں کو بھی وہاں جانے کی اجازت دیں جو ان سے یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ فقیر تھا اور ایک تھا حاجی محمد رفیق۔ مولانا لکھوی نے یہ درخواست منظور فرمائی اور ہم مرکز الاسلام جانے کی تیاری کرنے لگے۔

ہم مرکز الاسلام جانے پر بہت خوش تھے۔ ہمارے نزدیک یہ بھاری بھرکم نام تھا اور ہمارا خیال تھا کہ اپنے نام کی طرح وہ بہت بڑا شہر ہوگا اور اس کے کئی بازار ہوں گے اور آبادی دور تک پھیلی ہوگی اور ہم اس شہر کی سیر کیا کریں گے۔ یکم جنوری 1937ء کو ہم تین افراد وہاں کے ریلوے اسٹیشن جھوک ٹہل سنگھ پر اترے۔ ایک مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، ایک میں اور تیسرے حاجی محمد رفیق۔ مرکز الاسلام وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ریلوے لائن کے قریب تھا۔ وہاں پہنچے تو بالکل جنگل۔ وہی دو تین گھر جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے گھر کے کل افراد اس وقت سات تھے۔ خود مولانا اور ان کی اہلیہ محترمہ امۃ اللطیف۔ ان کے دو صاحب زادے مولانا محی الدین اور مولانا

معین الدین۔ ان سے چھوٹی دو صاحب زادیاں امۃ الرحمٰن اور رضیہ بی بی۔ ایک مولانا محی الدین کی زوجہ مکرمہ۔ ان کا نام بھی امۃ الرحمٰن تھا۔

اب اس چار دیواری میں ایک اور گھر کا اضافہ ہوا، وہ تھا مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا گھر۔ یہ دو افراد تھے ایک خود مولانا اور ایک ان کی اہلیہ محترمہ حنیفہ بی بی۔ اسی سال کے ماہ جون میں ایک اور ننھا منا "فرد" آیا۔ وہ تھا مولانا محی الدین کا بیٹا حافظ محمد۔ اس طرح مرکز الاسلام کی کل آبادی جون 1937ء میں حافظ محمد سمیت پندرہ افراد پر مشتمل تھی جو اس کی چار دیواری کے اندر سکونت پذیر تھی۔ چند طلبا اس کے علاوہ تھے۔ لیکن مرکز الاسلام کا اردگرد کے دیہات پر جن میں سکھوں کے دو گاؤں بھی شامل تھے، بڑا رعب تھا۔

اس دور کے مولانا محی الدین

ہم مرکز الاسلام کی چار دیواری کے اندر گئے تو پہلی دفعہ مولانا محی الدین کو دیکھا۔ اب آیے اس زمانے کے محی الدین لکھوی سے ملتے ہیں۔ پورا قد، سرخی مائل گورا رنگ، تیکھی ناک، موٹی آنکھیں، صاف ستھرے سفید لباس میں ملبوس، اس عہد کے دیہاتی کلچر کے مطابق تہبند باندھے ہوئے۔ بائیس تیئیس سال کے خوب صورت اور صحت مند کسرتی جسم کے نوجوان۔ نہایت محبت سے پیش آئے اور اس اسلوب میں میٹھی زبان سے مخاطب ہوئے جیسے مدت سے شناسائی ہو۔ صاحب زادوں اور بڑے لوگوں کی اولادوں میں جو اکڑفوں عام طور سے پائی جاتی ہے، اس سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ مرضِ غرور سے بالکل محفوظ۔ اسی قسم کے انکسار اور نرمی سے متصف جوان کے اکابر کے طرۂ امتیاز کے طور پر کتابوں میں مرقوم ہے۔ ان کے اکابر لوگوں کو نورِ بصیرت سے آشنا کراتے اور خلقِ خدا کو حسنات کے تحائف عطا فرماتے تھے۔ دعا ہے یہ سلسلہ ان کی آئندہ نسلوں میں بھی جاری رہے۔

اس زمانے میں وہ ان معنوں میں "مولانا" نہیں تھے، جن معنوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے، لیکن چوں کہ دودمانِ علما کے فرد تھے اور کئی پشتوں سے درس وتدریس کے گھرانے اور اصحابِ رشد وہدایت سے تعلق تھا اور پھر اپنے والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد علی لکھوی کی

غیر موجودگی میں مرکز الاسلام میں جمعہ و جماعت کے فرائض کی انجام دہی ان کے ذمے تھی، اس لیے لوگ انھیں "مولوی محی الدین" کہتے تھے۔

بھری جوانی (جسے پنجاب کی بولی میں "جوانی مستانی" کہا جاتا ہے) کے دور میں بھی وہ تہجد گزار اور قائم اللیل تھے۔

نماز خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے۔ حلم، خدا ترسی، رحم دلی، جودت، فراخ حوصلگی، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، احکام شریعت کی پابندی، قوت برداشت ان کے وہ اوصاف تھے جو انھیں اپنے رفیع المرتبت اسلاف سے ورثے میں ملے تھے۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

ابتدائے شعور سے لے کر تادمِ آخریں ان کی لسانِ گل افشاں ہمیشہ صدق مقال کی امین رہی۔

قرآن مجید کی تلاوت (قرآن پر بھی اور زبانی بھی) کثرت سے کرتے۔ اپنے پردادا حافظ محمد لکھوی کی کتابوں تفسیر محمدی، زینت الاسلام اور احوال الآخرت کے بہت سے اشعار انھیں زبانی یاد تھے اور یہ اشعار وہ پڑھتے رہتے تھے۔ مرکز الاسلام سے باہر دور و نزدیک کہیں جانا ہوتا تو کلے پر سفید طرے دار پگڑی باندھتے۔ مولانا معین الدین کا بھی یہی معمول تھا۔ لیکن ان کے والد گرامی مولانا محمد علی لکھوی کھدر کا بغیر کلے کے عمامہ باندھتے یا ترکی ٹوپی سر پر رکھتے۔

مجاہدانہ عادات

والد محترم کی طرح مولانا محی الدین نے طبیعت مجاہدانہ پائی تھی اور انہی عادات واطوار کے حامل تھے جو ان کے والد کی تھیں۔ ورزش کرتے، دوڑ لگاتے، گھر کے کام کاج کرتے، کھیتی باڑی میں مزارعوں کے شریک کار ہوتے اور "مگدر" اٹھاتے جو مرکز الاسلام میں خاص طور سے رکھا گیا تھا۔ بنوٹ کھیلتے، جسے عرف عام میں "گتکا" کہا جاتا ہے۔ اس کھیل میں اس قدر ماہر تھے کہ دوسرے سے کہتے مجھے لاٹھی مارو، وہ انھیں لاٹھی مارنے کی کوشش کرتا تو اپنا دفاع کرتے اور اس کی لاٹھی چھین کر اسے میدان سے بھگا دیتے۔ اس وقت ان کے پاس

بائیسکل تھا، اسے الٹا سیدھا چلانے اور تیز دوڑانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ورزش اور دوڑ میں وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ رکھتے اور اس کے مختلف طریقے بتاتے۔

انھیں اقبال کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے اور ان کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ورزش کرتے وقت وہ اکثر اقبال کا یہ شعر پڑھا کرتے۔

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

دو خوب صورت گھوڑیاں

ان کی دو بڑے قد کی خوب صورت گھوڑیاں تھیں جو فرید کوٹ کے اس سرکاری اصطبل سے خریدی گئی تھیں جو پولو کھیلنے والی گھوڑیوں کے لیے مخصوص تھا۔ ان پر سوار ہو کر بے شک انھیں کتنا ہی تیز دوڑایا جاتا، سوار بالکل محفوظ رہتا، کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ پھر جب جی چاہے انھیں روک لو فوراً رک جاتی تھیں۔ مولانا محی الدین ان اونچے قد کاٹھ کی گھوڑیوں پر رکاب میں پاؤں رکھے بغیر چھلانگ لگا کر سوار ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی ہمت سے نوازا تھا۔ گھوڑی پر سواری کا مولانا کو بہت شوق تھا۔ مولانا معین الدین کی بھی یہ پسندیدہ سواری تھی اور یہی فرید کوٹ سے یہ گھوڑیاں خرید کر لائے تھے۔

نسائی شریف میں اشتراک

1937ء میں مرکز الاسلام جاتے ہی دونوں بھائیوں سے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت یہ دونوں اپنے گاؤں لکھوکے میں مختلف فنون کی بھی اکثر کتابیں پڑھ چکے تھے اور احادیث کی بھی دو تین نصابی کتابوں کے سوا سب کتابیں پڑھ لی تھیں، جب کہ میں ان سے بہت پیچھے تھا۔ البتہ سننِ نسائی ہم تینوں نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے اکٹھے پڑھی۔ اس کے علاوہ ہمارا کسی کتاب میں اشتراک نہیں رہا۔

مجلس احرار کے جلسے کی تشہیر

1937ء میں مولانا محمد علی لکھوی مرکز الاسلام میں تشریف فرما تھے۔ اس سال مئی کے

مہینے میں فیروز پور کی مجلس احرار کے تین رہنما۔۔۔مولانا عبیداللہ احرار، خان عبدالعظیم خاں اور حکیم احمد علی۔۔۔ ان کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اب سے پانچ مہینے بعد اکتوبر 1937ء میں ہم فیروز پور میں مجلس احرار کا جلسہ منعقد کرنا چاہتے ہیں۔آپ سے درخواست ہے کہ اس میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور ضلع فیروز پور کے قصبات و دیہات میں جلسے کی تشہیر کا اہتمام کریں۔

مولانا نے ان کی بات سنی اور درخواست منظور فرمائی۔ ان کے بڑے صاحب زادے مولانا محی الدین لکھوی نے جو پنجابی کے شاعر تھے، جلسے کی تشہیر کے لیے دو تین پنجابی نظمیں لکھیں اور طلبا کے لیے لال رنگ کی قمیصیں سلا دی گئیں۔مولانا محی الدین اور معین الدین کو ان کے قائد مقرر کردیا گیا۔مئی کا مہینا، سخت گرمی کا موسم، طلبا نے لال رنگ کی قمیصیں پہنیں اور احرار کے جلسے کی تشہیر کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں گاؤں پیدل جاتے۔ اچھی سی آواز والا کوئی لڑکا نظم کا ایک شعر پڑھتا اور پھر سب لڑکے اس کے پیچھے پیچھے اس شعر کو دہراتے۔ اس طرح طلبا ہر گاؤں کی گلی گلی گھومتے، عورتیں گھر کے دروازے میں کھڑی ہو کر اور مرد باہر نکل کر انھیں دیکھتے اور بچے ساتھ چل پڑتے۔ جس گاؤں میں دوپہر ہوجاتی، وہاں کی مسجد میں چلے جاتے، لوگ گھروں سے روٹیاں لا کر کھلاتے اور لسی پانی پلاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد اگلے گاؤں کا قصد کرلیا جاتا۔ جس گاؤں میں رات پڑتی، وہاں کی مسجد میں ڈیرے ڈال دیتے۔ روٹی پانی کا انتظام اس گاؤں کے لوگ کرتے۔ عشا کے بعد مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پہلے پنجابی نظم پڑھی جاتی، پھر عام طور سے مولانا محی الدین لکھوی تقریر کرتے۔ صبح کو لسی پانی پی کر پھر سلسلہ سفر شروع ہو جاتا۔

نظموں اور تقریروں میں انگریزی حکومت کے مظالم بیان کیے جاتے، انگریز دشمنی کی پاداش میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو جن اذیتوں میں مبتلا کیا گیا تھا یا مبتلا کیا جا رہا تھا، ان کی وضاحت کی جاتی۔ اس طرح کچھ عرصہ وہاں کے طلبا نے مجلس احرار اور اس کے قائدین وزعما کے ''فضائل ومناقب'' کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف کیا اور اپنی ہمت

کے مطابق لوگوں کو اس کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی تلقین کی۔

مولانا محی الدین اور معین الدین پنجاب کے مشہور علمی اور روحانی خاندان کے فرزند اور بڑے باپ کے بیٹے تھے، جن کا خاندانی اور ذاتی اعتبار سے اس علاقے میں بہت اثر تھا، اس لیے وہ جس گاؤں میں جاتے، لوگ عزت واحترام سے پیش آتے، ساتھ طلبا کا بھی داؤ لگ جاتا اور انھیں بھی ''مستحق تکریم'' گردانا جاتا۔ یعنی ان کے طفیل یہ طفیلی موج میں رہتے۔

ان دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کے ہولناک حادثے کی شکل اختیار کرنے میں چند لمحوں کا فرق رہ گیا تھا۔ دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے جو نہریں نکلتی ہیں، ان میں ایک نہر بہاول پور کے علاقے کو جاتی ہے اور نہر صادقیہ کہلاتی ہے۔ وہ پختہ نہر ہے۔ نواب بہاول پور نے حسینی والا ہیڈ سے لے کر تمام نہر کو اپنے خرچ پر اندر سے پختہ کرادیا تھا۔ اس میں کوئی بکری بھینس وغیرہ گر جائے یا انسان گر جائے تو اس کو باہر نکالنا اور اس کا باہر نکلنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے، اس لیے کہ پختہ اینٹوں میں کہیں ہاتھ ڈالنے اور گری ہوئی شے کو باہر نکالنے کی کوئی صورت نہیں۔ ایک دن شدید گرمی پڑ رہی تھی اور طلبا اس نہر کے کنارے کنارے جارہے تھے کہ ایک ساتھی حاجی محمد رفیق نے نہانے کے لیے اس پختہ نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اب اس سے ان کا نکلنا مشکل ہوگیا۔ لڑکوں نے شور مچادیا۔ ''حاجی ڈوب گیا''۔۔۔ جلدی سے مولانا محی الدین نے ایک بڑا سا کپڑا نہر میں پھینکا جس کو رفیق نے زور سے پکڑا اور اس طرح انھیں کپڑے کے ذریعے کھینچ کر نہر سے نکالا گیا۔

یہ منظر بڑا خوف ناک تھا۔ اس واقعے پر پچھتر (75) برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی یہ واقعہ کبھی ذہن میں آتا ہے تو عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

1937ء میں جب مجلس احرار کے جلسے کے لیے ضلع فیروز پور کے بعض دیہات کا چکر لگایا گیا تھا، اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اب اس عمر میں وہ حالات یاد آتے ہیں تو خیال گزرتا ہے کہ انسان زندگی میں کتنی ہی عجیب وغریب منزلوں سے گزرتا ہے۔

واپس آکر مولانا محمد علی لکھوی کو رودادِ سفر سنائی تو وہ نہایت خوش ہوئے اور طلبا کی حوصلہ

افزائی کی۔ وہ زندہ دل اور خوش مزاج عالمِ دین تھے۔ اس عہد کے طبقہ علماء میں ان کا ایک خاص نوع کا نہج کلام تھا۔

اکتوبر 1937ء کو جلسے سے ایک دن پہلے مولانا محمد علی لکھوی کی قیادت میں احرار رضا کاروں کی طرح سرخ قمیصیں پہنے ایک بڑے جلوس کی شکل میں مرکز الاسلام کے طلباء فیروز پور پہنچے اور نعرے لگاتے ہوئے جلسے کے میدان میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد علی اسی لباس میں تھے جو وہ ہمیشہ پہنتے تھے، یعنی سفید کھدر کی قمیص، کھدر کا سفید عمامہ اور کھدر کا تہبند۔ ہر ضلعے کے لیے الگ الگ کیمپ تھے، ہمارا بھی ایک کیمپ تھا۔

احرار رضا کار، سرخ قمیص کے ساتھ ایک صاف ستھری چمکتی دمکتی کلہاڑی ہاتھ میں رکھتے تھے، لیکن ہمارے پاس کلہاڑیاں نہیں تھیں۔ مجلس احرار کے بعض اکابر بھی سرخ قمیص پہنتے اور ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے تھے۔

عشا کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہونے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اسی دن جلسے کے میدان میں نماز عصر کے بعد مجھے پہلی مرتبہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ پورا قد، گٹھا ہوا جسم، سرخ وسفید رنگ، موٹی موٹی چمک دار آنکھیں، سیاہ اور سفید بالوں پر مشتمل داڑھی جو نہایت خوب صورتی سے ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کھدر کی سرخ رنگ کی قمیص، سر پر قدرے اونچی دیوار کی قراقلی ٹوپی، جس سے ان کے پٹے باہر جھانک رہے تھے۔ پاؤں میں پشاوری چپل، ہاتھ میں کلہاڑی، جس کا دستہ ان کی کمر کے برابر تھا اور خاکی رنگ کی ٹخنوں سے ذرا اونچی شلوار۔ وہ چل پھر کر جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی بھی ادھر آ نکلے۔ وہ مصافحے کے لیے شاہ صاحب کی طرف بڑھے، شاہ جی بھی تیزی سے ان کی جانب آئے اور دونوں بزرگ بغل گیر ہو گئے۔ پھر گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے خیر وعافیت پوچھی۔ اس وقت مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ حسام الدین اور چند اور لوگ شاہ جی کے ساتھ تھے۔ وہ بھی احترام اور تپاک سے مولانا محمد علی لکھوی سے ملے۔ اس کے بعد یہ حضرات بعض مقامی اصحاب کی رفاقت میں

پنڈال میں داخل ہوئے اور گھوم پھر کر انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔

یہ اولین موقع تھا کہ میں شاہ جی کے دیدار سے بہرہ مند ہوا۔ وہ مردانہ حسن کا پیکر دل نواز تھے اور اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے۔ نظیری کا یہ شعر ان پر حرف بحرف صادق آتا تھا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دل می کشد کہ جا اینجاست

آج جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، اس واقعہ پر پچھتر (75) برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے، اور وہ سب لوگ وفات پا چکے ہیں مگر وہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور لیل ونہار کی بہت سی خوش گوار اور ناخوش گوار گردشوں کے باوجود حافظے نے ان کے اس وقت کے حلیے اور ہیئت کذائی کا کوئی گوشہ فراموش نہیں کیا۔ ہر چیز کو نہایت احتیاط سے محفوظ کر رکھا ہے۔

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقتِ ناز اک جنبش ترے ابرو میں تھی

یہ واقعہ بھی مولانا محی الدین لکھوی کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اس وقت اس نواح میں اس واقعہ نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ مختلف دیہات کے لوگ ان کی خدمت میں آتے اور اپنے ہاں تشریف لے جانے کے لیے اصرار کرتے۔ انھوں نے جلسے کی مناسبت سے چند نظمیں لکھیں۔ جس گاؤں میں جاتے، کوئی اچھی سی آواز والا لڑکا مولانا کی لکھی ہوئی نظم پڑھتا اور سماں بندھ جاتا۔ کبھی مولانا خود بھی اپنی کوئی نظم جلسے میں سناتے اور حاضرین بے حد غور سے ان کی تقریر بھی سنتے اور نظم بھی۔ افسوس ہے یہ دلچسپ نظمیں محفوظ نہیں رہیں۔ موقع کی مناسبت سے کاغذ پر لکھیں اور ضائع ہو گئیں۔

مولانا نے پاکستان آکر بھی چند نظمیں لکھیں، جو آئندہ صفحات میں مستقل باب کی صورت میں درج کی جائیں گی۔

خوش مزاجی

خوش مزاجی مولانا محی الدین لکھوی کی زندگی کا ہمیشہ لازمی جزو رہی۔ اس میں وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بھی شامل کر لیتے تھے اور پھر ایک عجیب پُر لطف ماحول بن جاتا تھا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

1937ء کی گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت۔ ہم چار پانچ طالب علم سرکنڈا کاٹنے کے لیے ''دندی'' میں گئے۔ ''دندی'' مرکز الاسلام کے قریب ایک خشک مگر خاصی گہری اور چوڑی نہر کا نام تھا۔ سرکنڈا اس کے ارد گرد دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم کلہاڑیوں اور درانتیوں سے سرکنڈا کاٹ رہے تھے کہ مٹی کا ایک بڑا ڈلا ہمارے قریب آ کر گرا۔ کام بند کر کے ہم اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک اور ڈلا آیا۔ ہم سہم گئے۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ دوپہر کے وقت جنگل میں جن بھوت آ جاتے ہیں، ذہن میں آیا کہ کوئی جن بھوت ہے، جس نے ہماری طرف یکے بعد دیگرے دو ڈلے پھینکے ہیں۔ اب ایک اور ڈلا آیا۔ اس کے بعد مسلسل چار پانچ ڈلے آئے اور ہمارے قریب آ کر گرے۔

ہمارے ساتھ ہمارا ایک عزیز محمد زکریا تھا جو عمر میں ہم سب سے چھوٹا تھا۔ قیام پاکستان کے زمانے میں ہم اپنے وطن سے اکٹھے پاکستان آئے اور جڑاں والا میں مقیم ہوئے۔ محمد زکریا نے وہیں 25۔فروری 2006ء کو وفات پائی۔

اس نے اعلان کیا کہ اگر ڈلے چلانے والا ہمارا واقف ہے اور اس کا مقصد محض مذاق بازی ہے تو بول پڑے، ورنہ ہم جو جی میں آیا اسے کہیں گے۔ اس وارننگ کے نتیجے میں دو ڈلے اور آئے جو ہمارے پاؤں کے قریب آ کر گرے۔ پھر محمد زکریا نے زبان کو حرکت دی تو تیزی سے ڈلوں کی بارش ہونے لگی او ساتھ ہی سرکنڈے ملتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ کبھی وہ سرکنڈا ہل رہا ہے، کبھی وہ حرکت کر رہا ہے اور ضرب و حرکت کا یہ سلسلہ تیزی سے ہمارے قریب آ رہا ہے۔ اتنے میں سرکنڈوں میں بیٹھے ہوئے انسانی جسم کے مونڈھوں پر نظر پڑی اور ساتھ ہی سفید بنیان دکھائی دی۔ ہماری طرف سے بہ یک زبان نعرہ

بلند ہوا۔ ”مولوی محی الدین“۔

محی الدین ہنستے ہوئے سرکنڈوں کی اوٹ سے نمودار ہوئے اور ہماری نگاہیں مارے شرم کے جھک گئیں۔ جو کچھ ہم نے ان سے متعلق کہا، اس کی وجہ سے ان کا سامنا کرنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔

مولانا محی الدین اور معین الدین کے ایک دوست چودھری برکت علی تھے جو فیروز پور کے بالکل قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور منشی احمد الدین پٹواری کے بیٹے تھے، جن کا ذکر حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے حالات میں قارئین کے مطالعہ میں آیا۔ حصولِ تعلیم کے بعد چودھری برکت علی کا تقرر لاہور، اے جی آفس میں اکاؤنٹ آفیسر کی حیثیت سے ہوا۔ وہ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ مولانا محی الدین نے ایک دفعہ بتایا کہ جس زمانے میں وہ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے فیروز پور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے اور ہوسٹل میں گئے تو برکت علی بھی وہیں تھے۔ ایک دن وہ گھر سے تین چار سیر ”پنجیری“ ڈبے میں بند کر کے لائے اور ڈبا الماری میں رکھ دیا۔ وہ باہر گئے تو موقع غنیمت جان کر لڑکوں نے ان کی الماری کھولی، جس میں خود محی الدین بھی شامل تھے۔ اس سے ڈبا نکالا اور چند لمحوں میں پنجیری ختم کر ڈالی۔ برکت علی نے آکر دیکھا تو قصہ تمام ہو چکا تھا۔

کشتینز

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مرکز الاسلام میں مہمان بہت آتے تھے اور بعض کا قیام کئی کئی دن رہتا تھا۔ انھی میں سے ہمارے ایک بزرگ دوست قاضی عبیداللہ تھے جو کئی مہینے وہاں رہے۔ انھیں اخبار پڑھنے اور ان دواؤں کے اشتہار دیکھنے کی عادت تھی جو اخبار میں چھپتے تھے۔ وہاں بذریعہ ڈاک اخبار سہ روزہ ”زمزم“ آتا تھا جس کا دفتر لاہور کے اردو بازار میں تھا اور اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط تھے۔ یہ اخبار سیاسی نقطۂ نظر سے کانگرس کا حامی تھا۔ قاضی عبیداللہ نے اس اخبار میں کوئی اشتہار پڑھا۔ ایک دن وہ صبح کے وقت مرکز الاسلام سے نکلے اور شام کو واپس آئے۔ پوچھا کہاں گئے تھے؟ کہاں بس یوں ہی ایک گاؤں میں گیا تھا۔

دوسرے دن پھر یہی ہوا کہ صبح کو گئے اور شام کو آئے۔ پوچھنے پر اب بھی یہی جواب دیا کہ ایک گاؤں میں ایک دوست کے پاس گیا تھا۔ تیسرے دن بات واضح کی کہ انھوں نے اخبار میں کسی مرض کے علاج کا ایک نسخہ پڑھا ہے، جس کے اجزا میں سے ایک جز ''کشنیز'' ہے۔ نسخے کے تمام اجزا مل گئے ہیں لیکن کشنیز نہیں ملا اور کشنیز نسخے کا ضروری جز ہے۔

مولانا محی الدین ان کی یہ بات سن کر اٹھے اور گھر سے دھنیا کا چھنا بھر کر ان کے سامنے لا رکھا اور فرمایا: لیجیے کشنیز۔

قاضی عبیداللہ تعجب سے بولے اچھا یہ ہے کشنیز۔!!

رحم دلی

جہاں تک میں جانتا ہوں مولانا محی الدین نہایت رحم دل اور نرم مزاج تھے۔ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک مرتبہ سردیوں میں کھیس اوڑھے ہوئے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے۔ کھیس اتار کر اسے دے دیا۔ مرکز الاسلام میں آنے والے مہمانوں میں سے مولانا کو اگر کسی کے بارے میں احساس ہو جاتا کہ اسے کپڑے کی ضرورت ہے تو اسے کپڑا عنایت فرماتے اور پیسے کی ضرورت والے کو کرائے کے لیے پیسے دیتے۔

وہ قرآن و حدیث میں جو کچھ پڑھتے تھے، اس پر عمل کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ حصولِ علم کا مقصد صرف حصولِ علم نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اس پر عمل کرنا ہے۔ قرآن میں انھوں نے پڑھا کہ

اما السائل فلا تنھر

(سوال کرنے والے کو ڈانٹ نہ پلاؤ)

اسے انھوں نے اللہ کا حکم قرار دیا اور سائل کو ہمیشہ امداد کا مستحق گردانا۔ سخاوت ان کا پیشہ اور رحم دلی ان کا شیوہ تھا۔ 1937 کا پورا سال میرا ان سے قریبی تعلق رہا۔ اس کے بعد بھی جیسا کہ آگے آئے گا میرے ان سے مراسم رہے۔ وہ بے حد نرم خو اور صاحب جودوسخا

تھے۔ وسیع القلب اور کشادہ دست عالم۔ اس کے ساتھ ہی پیکرِ صالحیت اور مجسمۂ خیر۔!

خطبۂ جمعہ اور مہمان نوازی

مولانا محمد علی کی غیر موجودگی میں اور بسا اوقات ان کی موجودگی میں بھی جمعہ مولانا محی الدین پڑھاتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد مکرم کے حکم کے مطابق 17 (سترہ) سال کی عمر میں 1931ء میں جمعہ پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ جمعے کے دن صبح ہی سے ارد گرد کے دیہات کے لوگ مرکز الاسلام آنا شروع ہو جاتے۔ نماز جمعہ تک اچھا خاصا مجمع ہو جاتا تھا۔ بہت سے لوگ دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے۔ کھانا مولانا کے گھر سے آتا اور مہمانوں کو کھانا مولانا خود کھلاتے۔ بعض دفعہ انھیں کھانا لانے کے لیے کئی کئی دفعہ گھر جانا پڑتا تھا۔ پہلے ایک مہمان آیا، پھر دوسرا آیا، پھر تیسرا۔ اس طرح وہ بار بار گھر جاتے اور کھانا لاتے۔ اس اعتبار سے یہ بڑا فراخ حوصلہ اور کھلے دل کا گھرانا تھا۔ لائق احترام خواتین کا زیادہ تر وقت مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرنے میں صرف ہو جاتا۔ شروع شروع میں ہم بہت حیران ہوتے تھے کہ اس گھر کی خواتین اتنے لوگوں کے لیے کھانا پکاتی ہیں اور مولانا محی الدین اور معین الدین نہایت احترام سے ان لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ بڑے دل گردے کا کام تھا، خواتین کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی۔!

پھر جب مرکز الاسلام میں طلباء کی تعداد بڑھ گئی تو وہاں قریب کے گاؤں موضع برج کے یعقوب عرب بیلا کو باورچی رکھ لیا گیا تھا، لیکن پھر بھی بسا اوقات مولانا کے گھر سے کھانا آتا تھا۔ علم و عمل کی یک جائی اور سخاوت و ترحم کا اجتماع بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے اور جہاں تک میرا تجربہ ہے مولانا محمد علی لکھوی کے گھرانے میں یہ نعمت وافر مقدار میں پائی جاتی تھی۔

شہری زندگی سے بیزاری

مولانا محی الدین نے ہمیشہ شہری زندگی سے بیزاری کا اظہار کیا۔ وہ شہری زندگی پر دیہاتی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ مرکز الاسلام کے جنگل کو انھوں نے تمام دیہات وقصبات

اور بڑے بڑے بلاد وامصار سے فائق تر گردانا۔ فیروز پور شہر میں وہ تھوڑا عرصہ ہی رہے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا، جب وہ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل تھے۔ ان دنوں دیہات میں ہائی سکول نہیں ہوتے تھے۔ پرائمری سکول بھی ہر گاؤں میں نہیں تھے۔ بڑی آبادی کے کسی گاؤں میں پرائمری سکول ہوتا تھا اور اس میں قرب وجوار کے دیہات سے آکر بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بعض بڑے دیہات میں لوئر مڈل سکول بھی ہوتے تھے۔ جن میں چھٹے جماعتوں تک تعلیم دی جاتی تھی۔

مولانا محی الدین لکھوی بتایا کرتے تھے کہ فیروز پور شہر میں وہ جتنا عرصہ رہے، شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رہے۔ امتحان دے کر مرکز الاسلام آئے تو دل کو تسکین ہوئی۔ مرکز الاسلام سے ان کی قلبی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہاں سے اپنے آبائی گاؤں لکھو کے بھی بہت کم جاتے تھے۔ اگر کسی ضروری کام سے جاتے بھی تو جلد ہی کام سے فارغ ہو کر مرکز الاسلام تشریف لے آتے۔

دوستی کی ایک مثال

مرکز الاسلام جاتے ہی میری ان سے دوستی ہوگئی تھی۔ وہ بہت بڑے علمی خانوادے کے عظیم رکن تھے اور میں نیم خواندہ گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن ان دونوں بھائیوں سے ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہی۔ میری والدہ مئی 1937ء میں فوت ہوئیں تو یہ دونوں بھائی تعزیت کے لیے (کوٹ کپورہ) ہمارے گھر گئے اور وہاں ایک رات رہے۔ پھر اس سے دو مہینے بعد غالباً جولائی میں میں کسی کام سے گھر گیا اور دس بارہ دن وہاں رہا۔ مولانا محی الدین لکھوی مرکز الاسلام سے سائیکل پر میرے پاس پہنچے اور ایک دن اور ایک رات وہاں رہے۔

یہ اس فقیر سے ان کی دوستی کی ایک مثال ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہی۔ مرکز الاسلام سے وہاں سائیکل پر جانے کی یہ صورت تھی کہ مرکز سے لکھو کے جاؤ، وہاں سے نہر کی پٹڑی پر کھائی پھیمکی پہنچو، یہ سات میل کا فاصلہ تھا۔ پھر کھائی پھیمکی سے سات میل فیروز پور اور فیروز پور سے تیس (30) میل کوٹ کپورہ۔ اس طرح پینتالیس میل کا سفر ہوا۔ آج کل کے حساب

سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر۔!

مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین کے بیٹوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے انہی خصائل سے نوازا ہے۔ ہر شخص سے احترام سے پیش آتے ہیں۔ اپنے والد سے ملنے والوں کو بالخصوص تکریم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے اور اپنے بزرگوں کے اوصاف حسنہ کی دولت سے نوازے۔



دسواں باب

سلسلۂ تدریس

گزشتہ صفحات میں مولانا محی الدین لکھوی کے کوائف حیات 1937ء تک کے لیل ونہار تک مشتمل تھے، جن میں ان کا دورِ طفولیت بھی آیا اور عہدِ طالب علمی بھی۔! یہ پورا زمانہ ان کے حسنِ کردار کا شاہد ہے۔ اس اثنا میں ان کا ہر قدم صالحیت کی طرف بڑھا اور وہ ہر آن امورِ خیر کے متلاشی رہے۔

1937ء کے آخر میں فیروز پور کی جماعت اہل حدیث کے چند سرکردہ ارکان حضرت مولانا محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے مولانا ممدوح سے عرض کیا کہ فیروز پور ضلعے کا مرکزی شہر ہے، اور وہاں مسجد بھی ہے جسے گنبداں والی مسجد کہا جاتا ہے۔ لیکن نہ وہاں جماعت اہلِ حدیث کا کوئی مستقل خطیب ہے اور نہ اس کا دینی مدرسہ۔ فیروز پور چھاونی کی بھی یہی حالت ہے۔ وہ اجازت دیں کہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمات فیروز پور کی جماعت اہلِ حدیث کے لیے حاصل کی جائیں تاکہ گنبداں والی مسجد میں مدرسہ بھی جاری کیا جائے اور مستقل خطیب کا انتظام بھی ہو جائے۔ ان کی اس بات کو مولانا محمد علی لکھوی نے صحیح گردانا اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی فیروز پور تشریف لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ وہاں چلا گیا۔

1939ء میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مستقل طور سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور مسجد نبوی میں طلبا کو قرآن وحدیث کی تعلیم دینے لگے تھے۔ اب مولانا محی الدین لکھوی کی

زندگی کا دھارا بالکل بدل گیا۔ مرکز الاسلام میں انھوں نے باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہاں دو قسم کے طالب علم تھے۔ ایک وہ جو دور کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور دن رات وہاں رہتے تھے۔ دوسرے وہ جو اردگرد کے دیہات سے صبح آتے اور شام کو چلے جاتے۔ یہ تمام طالب علم ابتدا سے لے کر ہر فن کی انتہائی کتابیں پڑھتے تھے۔ بعض ناظرہ قرآن مجید پڑھنے والے بھی تھے۔ مولانا اکیلے ان کو پڑھاتے تھے اور اس کام پر وہ خوش اور مطمئن تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین بھی وہیں رہتے تھے۔ لیکن وہ کئی قسم کی ذمہ داریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ لکھوکی کے مدرسے کا اہتمام بھی (عملی طور پر) انھی کے سپرد تھا اور مرکز الاسلام میں رہنے والے طلباء کے مصارف کا انتظام بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ علاوہ ازیں زمینوں کی دیکھ بھال، مزارعوں کے معاملات اور گھر کے اخراجات وغیرہ تمام امور ان کے سپرد تھے۔

مولانا محمد علی صاحب نے چوں کہ مرکز الاسلام کی سکونت ترک کر کے مدینہ منورہ کو اپنا مستقل ٹھکانا قرار دے لیا تھا، اس لیے وہاں مسئلے مسائل پوچھنے والے مولانا محی الدین کی خدمت ہی میں آتے تھے۔ اللہ کے فضل سے خاندانی اور ذاتی طور پر تمام اوصافِ حسنہ مولانا محی الدین میں پائے جاتے تھے۔

ایک کاروباری منصوبہ

ضلع فیروز پور میں فاضلکا بنگلہ خاصا بڑا شہر تھا اور تحصیلی مقام۔ اوڈ برادری کے لوگ وہاں کثرت سے آباد تھے۔ یہ راجپوت تھے اور اہلِ حدیث تھے۔ وہاں ایک بزرگ مولانا عبداللہ اوڈ قیام پذیر تھے جو چودھری قسم کے عالم تھے اور اوڈ برادری کے سربراہ تھے۔ کسی زمانے میں وہ لکھوکے میں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ مرکز الاسلام [illegible] کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک دفعہ (1938ء میں) وہ مرکز الاسلام آئے تو مولانا محی الدین نے ان سے اپنے ایک کاروباری منصوبے کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ اپنے کارندوں کے ذریعے اردگرد کے دیہات

سے دودھ اکٹھا کر کے فیروز پور چھاونی میں فوجیوں کو بھجوانا چاہتے ہیں۔ مولانا عبداللہ اوڈ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا آپ اس کام میں مصروف ہو جائیں گے تو آپ کی تدریس اور تبلیغ دین کے بنیادی مقاصد کو نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ مولانا نے اس منصوبے پر عمل نہیں کیا اور اپنا سلسلۂ تبلیغ و تدریس جاری رکھا جو صدیوں سے ان کے بزرگوں کی طرف سے جاری تھا۔

فوجیوں کو دودھ کی ترسیل میں بھی مولانا کی نیت صالحیت پر مبنی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب فوجیوں کو صاف ستھرا دودھ ملے گا اور دوسرے لوگوں سے سستا بھی ہوگا تو اس سے وہ متاثر ہوں گے اور یہ تاثر انھیں ہمارے قریب لانے کا باعث بنے گا اور ان میں نیکی کے جذبات پیدا ہوں گے، لیکن مولانا عبداللہ اوڈ کے کہنے پر انھوں نے اس منصوبے پر عمل نہیں کیا۔ [1]

وسیع لنگر خانہ

1937ء کے بعد فیروز پور کے زمانۂ طالب علمی میں بھی میں مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد مرکز الاسلام کا چکر لگایا کرتا تھا۔ عام طور پر وہاں ایک رات گزارتا اور دوسرے دن نو بجے کی ٹرین سے واپس فیروز پور چلا جاتا۔ ان دنوں بھی مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بہ دستور پہلے کی طرح جاری تھا۔ کہنا چاہیے کہ رفت کم اور آمد زیادہ تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ جس کی آمد ہوگئی، بس ہوگئی، رفت کا دور بہت دنوں کے بعد آتا اور آمد قیام میں بدل جاتی۔

وہ نہایت امن کا زمانہ تھا۔ نہ چوری ڈاکے کا خطرہ اور نہ کسی مہمان کی طرف سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ۔ کبھی کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ یہ بھی کبھی کسی سے نہیں پوچھا گیا کہ وہ کس کام سے آیا ہے۔ ہمیشہ لنگر جاری رہتا۔ جو میسر آیا، پیش کر دیا گیا۔ کبھی کسی نے جاتے وقت جزاک اللہ بھی نہیں کہا۔ ہر آنیوالا

[1] مولانا عبداللہ اوڈ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ''کاروان سلف'' صفحہ 173 تا 182۔ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد۔۔۔ لاہور۔

وہاں رہ کر کھانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ میں نے زندگی میں نہ کوئی ایسا مہمان نواز خاندان دیکھا اور نہ کبھی اس قسم کے مہمانوں سے واسطہ پڑا، جن کی آمد برائے قیام ہوتی ہو۔

ہم نے کتابوں میں برصغیر کے بعض صوفیا و اولیا کی خانقاہوں کے لنگر خانوں کے متعلق پڑھا۔ حیرانی ہوتی تھی کہ وہ مہمانوں اور مریدوں کو کہاں سے کھلاتے تھے۔ وہ لوگ بادشاہوں اور حکمرانوں کی امداد بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ وقت کے کسی بادشاہ یا وزیر یا امیر نے نقد روپے یا زمین کی صورت میں کچھ دینا چاہا تاکہ خانقاہ میں آنے والوں پر خرچ کیا جائے، لیکن ان حضرات نے امداد لینے سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا اور جواب دیا کہ یہ لوگ اللہ کا دین سیکھنے کے لیے آتے ہیں اور اللہ ہی ان کے خورونوش کے اسباب پیدا کرنے والا ہے۔

یہی صورت حال ہم نے مرکز الاسلام میں دیکھی کہ مہمانوں اور طالب علموں کی اللہ مدد فرما رہا ہے۔ میں 1937ء میں طالب علم کی حیثیت سے وہاں رہا۔ پھر 1942ء کے آغاز سے جولائی 1947ء تک وہاں فریضۂ تدریس انجام دیتا رہا۔ اس وقت ہمارے دوست چودھری غلام حسین تہاڑیہ بھی وہاں معلم تھے جو آج کل تلونڈی ضلع قصور میں مقیم ہیں۔ اس طویل عرصے میں ہم نے وہاں کسی آنے والے کو نہیں دیکھا کہ اس نے جامعہ محمدیہ کے لیے تھوڑی یا زیادہ، کوئی رقم دی ہو۔ ہم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کسی زمیندار نے تھوڑی یا زیادہ مقدار میں غلہ بھیجا ہو۔ بالکل صحیح ہے کہ اللہ اپنے دین کے خادموں کی خود ہی مدد فرماتا ہے اور ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ تمام معاملات اچھی طرح چلتے رہتے ہیں۔

بہر حال عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ 1938ء میں مولانا محی الدین لکھوی نے مرکز الاسلام میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جو قیامِ پاکستان تک پوری مستعدی اور کامیابی سے جاری رہا۔ انھوں نے ناظرہ قرآن سے لے کر فنی کتابوں تک طلباء کو پڑھائیں اور طلباء ان کے اندازِ تدریس سے مطمئن تھے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ ایک دفعہ مولانا نے اپنے نام کے ساتھ عبدالسلام لکھنا

شروع کیا تھا۔ یعنی محی الدین عبدالسلام۔ کچھ عرصہ محی الدین حسان بھی لکھتے رہے۔ شاعر بھی تھے اور شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت کی نسبت سے حسان تخلص کرتے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ آگے نہیں چلا۔ بس محی الدین ہی لوگوں کی زبان پر چڑھا رہا۔

مولانا سلام کثرت سے کہتے تھے۔ اگر کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور کسی ضرورت کی بنا پر وہاں سے اٹھ کر کہیں جانا پڑتا اگرچہ چند قدم پر ہی، تو واپس آ کر السلام علیکم کہتے۔

یہی عادت میں نے مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کی دیکھی۔ وہ بھی چند منٹ کے لیے بھی کسی مجلس سے اٹھا کر جاتے تو واپس آ کر حاضرین مجلس کو ضرور السلام علیکم کہتے۔ شرعی مسئلہ بھی یہی ہے۔



گیارھواں باب

حضرت حافظ صاحب گوندلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں

مدارسِ دینیہ میں یہ روایت ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ ہر عالم اپنی سند کو عالی ثابت کرنے کی غرض سے اپنے عہد کے بڑے عالم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے فیض یاب ہونے کی سعی کرتا ہے۔ پھر یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ صحاح ستہ بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھنے کے لیے اپنے دور کی لائق ترین اور مشہور ترین علمی شخصیت کے بابِ علم پر حاضری دی جائے۔ بعض شائقینِ علم انتہائی کتابیں ایک سے زائد اساتذہ سے پڑھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ہر استاذ کا پڑھانے کا الگ الگ طریقہ اور ایک دوسرے سے جداگانہ انداز ہے۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس سلسلے میں خاص شہرت حاصل تھی۔ بلاشبہ وہ محدثِ عصر، کثیر العلم اور وسیع المطالعہ استاذ تھے۔ اللہ نے ان کو حفظ واتقان کی نعمت سے بھی خوب نوازا تھا اور تقوی وطہارت کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ ان کا اسلوبِ تفہیم اور نہجِ تدریس طلبا کے لیے خاص جاذبیت رکھتا تھا اور ان کے حلقۂ تلامذہ میں شرکت کو بہت بڑی سعادت سمجھا جاتا تھا۔

مولانا محی الدین کی حاضری

مولانا ممدوح مرکز الاسلام میں فریضۂ تدریس انجام دیتے تھے لیکن 1940ء میں وہ حضرت العلام حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت حافظ صاحب ممدوح کی مسندِ درس گوجرانوالا میں آراستہ تھی۔ میں بھی اسی سال وہاں

پہنچا تھا۔ ہمارے ایک دوست مولوی محمد افضل بھی وہیں تھے جو مرکز الاسلام کے قریبی گاؤں ''چک مولوی والا'' کے رہنے والے تھے۔ ہم تینوں (میں، مولانا محی الدین اور مولوی محمد افضل) کی رہائش ایک ہی کمرے میں تھی۔ یہ کمرہ باورچی خانے سے متصل تھا۔ مولوی افضل کھانا پکانے میں بڑے ماہر تھے۔ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی درسِ قرآن دیتے تھے۔ درس کے فوراً بعد مولوی افضل باورچی خانے میں آتے اور حلوہ پکاتے۔ ہم تینوں کے حلوے پر تین یا چار آنے خرچ ہوتے تھے۔ اس وقت گوجراں والا کے چوک نیائیں میں جامع مسجد کے قریب دور تک خالی جگہ پڑی تھی، اب وہ جگہ آباد ہوگئی ہے اور لوگوں نے وہاں مکانات اور دکانیں تعمیر کرلی ہیں۔ خالی جگہ میں کشمیری جنھیں وہاں ''ہاتو'' کہا جاتا تھا، قطار میں بیٹھے روٹیاں اور سالن فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک روٹی دو پیسے میں ملتی تھی، میں یا مولوی افضل ضرورت کے مطابق سالن اور روٹیاں لاتے اور ہم تینوں صبح صبح کھانے پینے سے فارغ ہوجاتے۔

حضرت حافظ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت گوندلاں والا میں سکونت پذیر تھے جو ان کا آبائی مسکن تھا اور گوجراں والا سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اب گوجراں والا اور گوندلاں والا دونوں کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب ممدوح گوندلاں والا سے سائیکل پر تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ وقت مقررہ پر آتے اور آتے ہی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ کر مسندِ درس پر بیٹھ جاتے۔ صحیح بخاری سے درس کا آغاز ہوتا تھا۔ ہم لوگ جو صحیح بخاری پڑھنے والے تھے، ان کے تشریف لانے سے پہلے ہی وہاں موجود ہوتے تھے۔

صحیح بخاری کے طلبا

اس سال صحیح بخاری پڑھنے والے ہم مندرجہ ذیل نو طالب علم تھے۔

1۔ مولانا محی الدین لکھوی

2۔ مولانا محمد افضل: انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد بورے والا (ضلع وہاڑی) میں

رہائش اختیار کی۔

3۔ حافظ محمد زکریا: یہ میاں محمد باقر (جھوک دادو، ضلع فیصل آباد) کے صاحب زادے تھے۔ 1949ء میں فوت ہوئے۔

4۔ مولانا خالد گھرجاکھی: مشہور واعظ ومقرر مولانا نور حسین گھرجاکھی کے فرزند تھے۔

5۔ حافظ عبداللہ: یہ استاذِ مکرم حضرت حافظ محمد صاحب گوندلوی کے قریبی رشتے دار تھے۔ ضلع گوجرانوالا کے قصبہ لدھے والا وڑائچ کے رہنے والے تھے۔

6۔ سرور شاہ: یہ علاقہ کشمیر کے باشندے تھے۔

7۔ فضل شاہ: ان کا تعلق بھی ریاست کشمیر سے تھا۔

8۔ محمد بشیر: یہ تحصیل چونیاں (ضلع قصور) کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور مولانا محمد اشرف سندھو (ہیڈ بلوکی) کے عزیزوں میں سے تھے۔

9۔ ان سطور کا راقم عاجز۔

نو طلبا کی اس فہرست کے آٹھ افراد وفات پا گئے ہیں، البتہ نواں فرد اتفاق سے زندہ ہے جو ان واقعات کا راوی اور عینی شاید ہے اور خوانندگانِ محترم کی خدمت میں حاضر ہے۔ ان میں سے چند حضرات کا تذکرہ ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں مولانا محی الدین لکھوی کے ہم جماعت طلبا کی حیثیت سے ہوگا۔

حضرت حافظ صاحب کا اسلوبِ درس بخاری

حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوبِ درس بخاری خاص انفرادیت اور بے حد جاذبیت رکھتا تھا۔ وہ انتہائی وقار اور تمکنت کے مالک تھے اور اسی وقار اور تمکنت سے مسندِ درس پر بیٹھتے اور طلبا کو پڑھاتے۔ درس کے علاوہ ادھر ادھر کی کوئی بات نہ کرتے تھے۔ دورانِ درس ان سے ملاقات کے لیے کوئی شخص آتا تو اس کی طرف نہ دھیان دیتے، نہ اس سے بات کرتے۔ وہ آکر بیٹھ جاتا، درس ختم ہوتا تو اس سے مخاطب ہوتے۔

بخاری شریف میں ایک مہینے سے زیادہ عرصہ حجیتِ حدیث، اتباعِ حدیث، امام بخاری کی شرائط صحتِ حدیث، امام کے مقام ومرتبہ کی تعیین اور دیگر محدثین سے ان کے امتیاز وغیرہ امور کی وضاحت میں صَرف ہوجاتا۔ استاذ عالی مقام بڑی روانی اور صفائی سے درس دیتے تھے۔ دورانِ درس مختلف شروحِ بخاری کے حوالے دیتے۔ ان کے ارشادات انتہائی احتیاط اور توجہ سے سننے کی ضرورت ہوتی تھی۔ آسان اور عام فہم انداز میں ان کے لیے علمی بات کرنا مشکل تھا۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ مشکل کلام تھے۔ خالص علمی انداز میں تقریر فرماتے۔ بسا اوقات بعض طلبا ان کی بات بالکل نہیں سمجھ پاتے تھے۔ بس بیٹھے ہیں اور سن رہے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی طالب علم عبارت پڑھنا شروع کرتا لیکن اگر وہ اٹک اٹک کر پڑھتا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا تو اسے یہ نہیں کہتے تھے کہ تم نہ پڑھو، بلکہ فرماتے کوئی تیز پڑھنے والا پڑھے۔ چند طلبا تیز پڑھتے تھے اور اللہ کی مہربانی سے بالکل صحیح پڑھتے تھے، ان میں مولانا محی الدین، مولوی محمد افضل، حافظ محمد زکریا اور ان سطور کا راقم عاجز شامل تھے۔ بحمد اللہ ہم چاروں کا یا یوں کہیے کہ ''رفقاء اربعہ'' کا اسلوبِ قراءت حضرت استاذِ گرامی قدر کے مزاج عالی کے عین مطابق تھا اور ہمیں یہ شرف حاصل تھا کہ حضرت ممدوح ہم پر خوش تھے۔ اس کا اظہار وہ زبان مبارک سے تو نہیں فرماتے تھے، البتہ ان کے چہرے کی بشاشت اور آنکھوں کی چمک سے اس کی وضاحت ہوجاتی تھی۔ بعض اوقات بے زبانی بھی زبان کا کام دیتی ہے۔

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

اگر کوئی طالب علم حضرت حافظ صاحب کی کوئی بات سمجھ نہ پاتا تو اس کے پوچھنے پر اسے بتاتے۔ پھر بھی اسے اطمینان نہ ہوتا تو تھوڑا سا انداز بدل کر دوبارہ سمجھاتے۔ اگر اب بھی سمجھنے سے قاصر رہتا تو فرماتے چلو آگے پڑھو۔ ایسے موقعے پر ''چلو آگے پڑھو'' کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی اور یہ اس قابل نہیں کہ مزید سمجھانے میں وقت ضائع کیا جائے۔

گوجرانوالا میں قیام کا عرصہ

مولانا محی الدین سے حضرت حافظ صاحب بہت خوش تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ خالص علمی گھرانے کے نیک فرد تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اللہ نے ان کو ذہانت کی نعمت سے نوازا تھا، لیکن گوجرانوالا میں ان کا قیام زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ وہ عیدالاضحیٰ کی چھٹیوں پر مرکز الاسلام گئے اور دوبارہ نہیں آئے۔ ایک دن حضرت حافظ صاحب نے ان کے بارے میں پوچھ بھی لیا کہ مولوی محی الدین کیوں نہیں آئے۔

حضرت حافظ صاحب کی تدریس سے مولانا محی الدین نہایت متاثر تھے اور ان کی فراوانیٔ علم کا ان پر بہت اثر تھا۔ لیکن ان کی چند مجبوریاں تھیں، جن کی وجہ سے وہ گوجرانوالا میں زیادہ عرصہ قیام نہیں کر پائے۔ ان کی گزشتہ زندگی جس قالب میں ڈھلی تھی، وہ خالص دیہاتی قالب تھا، جس کی وجہ سے انھیں شہری طرزِ حیات سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی، بلکہ صحیح لفظوں میں کہنا چاہیے کہ شہری زندگی سے وہ نفرت کرنے لگے تھے۔ قدم قدم پر برائی اور جگہ جگہ خلافِ شرع کاموں کا ارتکاب ان کے لیے سوہانِ روح تھا۔

ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی عدم موجودگی میں مرکز الاسلام کا مدرسہ اجڑ گیا تھا اور جمعہ و جماعت کا نظام بھی مختل ہو گیا تھا۔ مولانا معین الدین زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے، اس لیے مولانا محی الدین کو واپس مرکز الاسلام آنا پڑا۔ تاہم انھوں نے مروّجہ نصاب مکمل کر لیا تھا۔

قیام گوجرانوالا کے زمانے میں صحیح بخاری کے علاوہ حضرت حافظ صاحب سے صحیح مسلم اور موطا امام مالک پڑھنے میں بھی ہم شریک تھے۔

پھر اسی زمانے میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین پڑھیں۔ اس طرح مولانا محی الدین نے مختلف اساتذہ سے علوم متداولہ کی تکمیل فرمائی۔ استاذ کے درس میں جانے سے پہلے ہر کتاب کا مطالعہ وہ بڑے انہماک سے کرتے تھے اور مشکل مقامات حل کرنے میں انھیں درک حاصل تھا۔

دین داری کا عملی نمونہ

مولانا محی الدین اگرچہ زیادہ عرصہ گوجرانوالا نہیں رہے اور اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر واپس مرکز الاسلام آ گئے۔ لیکن ان کی ذہانت، نیکی، حسن اخلاق اور خاندانی وجاہت کا سب نے اعتراف کیا۔ اساتذہ نے بھی، طلباء نے بھی اور مدرسے کے اصحابِ انتظام نے بھی۔ طلبا عام طور پر نماز تہجد نہیں پڑھتے، فرض نمازوں میں بھی زیادہ خشوع وخضوع کا اہتمام نہیں کیا جاتا، لیکن مولانا محی الدین بالالتزام تہجد پڑھتے اور نماز نہایت خشوع وخضوع سے ادا کرتے تھے۔ کتب احادیث میں مختلف اوقات میں جو وظائف پڑھنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، اس پر وہ عمل پیرا تھے۔ اس میں ان کے ذاتی کردار کا بھی دخل تھا اور خاندانی اثرات بھی کارفرما تھے۔ وہ ہر عمل خیر کی انجام دہی کے لیے کوشاں رہتے اور قرآن وحدیث کے ہر حکم کی تعمیل ان کے نزدیک ضروری قرار پاتی۔ وہ سراپا عمل اور پیکرِ حسنات تھے۔

ان کے اس قسم کے اعمال کا ان کے ساتھی طلبا پر بھی اثر پڑتا تھا اور ان کے دل میں اعمال خیر کی انجام دہی کا جذبہ ابھرتا تھا۔ ہم لوگ دعوے تو بہت کرتے ہیں۔ لیکن دعوے کا عملی ثبوت فراہم کرنے میں اکثر وبیشتر درماندہ رہتے ہیں۔ مولانا محی الدین لکھوی کو اللہ نے اس خصوص سے بہرہ مند فرمایا تھا کہ وہ بات سے زیادہ عمل کے عادی تھے۔ مکارم اخلاق کا حسین ترین مجسمہ اور للّٰہیّت و دین داری کا عملی نمونہ۔ رحمہ اللہ تعالیٰ



بارھواں باب

اساتذہ کرام

مولانا محی الدین لکھوی نے اپنے عہد کے پانچ جلیل القدر اساتذہ سے علوم دینیہ کا اکتساب کیا۔ علی الترتیب ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا عطاء اللہ لکھوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی۔ اب آئندہ سطور میں مختصر الفاظ میں ان حضرات عالی قدر کے بارے میں چند گزارشات ملاحظہ ہوں۔

کتاب کے پانچویں باب میں مولانا محمد علی لکھوی کا تذکرہ قارئینِ کرام کے مطالعہ میں آچکا ہے، اب دیگر چار بزرگانِ محترم کے ضروری کوائف پیش کیے جاتے ہیں۔

1۔ مولانا عطاء اللہ لکھوی:

آپ حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی کے صاحب زادۂ گرامی قدر تھے۔ 1882ء (1299ھ) میں بمقام لکھو کے پیدا ہوئے۔ مختلف مروّجہ علوم کی تحصیل اپنے والد مکرم حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی سے کی۔ امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں حضرت الامام عبدالجبار غزنوی سے بھی اخذِ فیض کیا۔ لاہور کے مدرسہ نعمانیہ میں مولانا غلام احمد سے بھی کسب علم کرتے رہے۔ رام پور، بانس بریلی اور سہارن پور کے مدارس میں بھی ان کا حصولِ علوم کا سلسلہ جاری رہا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد 1905ء میں اپنے خاندانی مدرسے لکھوکے میں تدریس کا آغاز فرمایا۔ یوں تو تمام علومِ درسیہ میں عبور رکھتے تھے، لیکن صرف ونحو وغیرہ فنون میں بالخصوص درجۂ امامت پر فائز تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے اور آسان زبان میں طلبا کو پڑھاتے۔

ہر مروّجہ علم کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں بارہا طلبا کو پڑھائیں۔ ان کے عہد تدریس میں یوں تو متحدہ ہندوستان کے تمام درسی حلقوں میں لکھوکی کے چھوٹے سے گاؤں کی شہرت پہنچی لیکن پنجاب میں بالخصوص اس گاؤں کے مدرسے کو ممتاز حیثیت حاصل ہوئی اور تشنگانِ علوم نے دور دراز علاقوں سے یہاں آکر اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

مولانا ممدوح کے اسلوبِ تدریس اور اندازِ تفہیم کا کوئی جواب نہ تھا۔ طلبا ان سے انتہائی مطمئن رہتے اور ان کا طرزِ کلام ان کے لیے بے حد اثر انگیز ہوتا تھا۔ جن حضرات نے ان سے حصولِ فیض کیا انھیں گنتی شمار میں لانا ممکن نہیں۔ ان میں مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، سید مولا بخش کوموی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا عبدالرحیم بھوجیانی، مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی، مولانا محی الدین لکھوی، حافظ محمد اسحاق حسینوی، حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ محمد بھٹوی، مولانا معین الدین لکھوی اور دیگر بے شمار حضرات شامل ہیں۔ نیز حضرت مولانا مرحوم ومغفور کے صاحب زادوں نے بھی ان کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیے۔

مولانا ممدوح استاذ العلماء تھے۔ انھوں نے 1905ء سے لے کر 1952 تک اڑتالیس برس مسندِ درس بچھائے رکھی۔ 26۔نومبر 1952ء (7۔ربیع الاول 1372ھ) کو جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں وفات پائی اور چک نمبر 18 ون۔ ایل نزد رینالہ خورد میں دفن کیے گئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

ان کے حالات میں نے اپنی ایک کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں لکھے ہیں۔ یہ مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی کے ماموں تھے۔ ان کے صاحب زادوں مولانا

عبدالرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن، حافظ شفیق الرحمٰن اور حافظ عزیز الرحمٰن کا تذکرہ میں نے اپنی ایک اور کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں کیا ہے۔

2۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی:

مولانا موصوف 1909ء کے لگ بھگ موضع بھوجیاں (تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم میاں صدر الدین حسن اور وہاں کے مقامی علماء مولانا فیض اللہ خاں اور ان کے بڑے صاحب زادے مولانا عبدالرحمٰن خاں بھوجیانی سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے دہلی گئے۔ وہاں مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی اور مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی کے سامنے زانوئے شاگرد تہہ کیے اور ان سے کتب حدیث سے پڑھیں۔ رجالِ حدیث کے موضوع سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی خاص طور سے دلچسپی رکھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ قیامِ دہلی کے زمانے میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) اور بعض دیگر اخباروں میں ان کے رشحاتِ قلم کی اشاعت ہونے لگی۔ دہلی میں صحاح ستہ کی تکمیل کی تو دیگر مروّجہ فنون کی کتابیں پڑھنے کے لیے استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی خدمت میں لکھوکے آئے۔ لیکن اس وقت طلباء کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی اور اس مدرسے میں ان کے داخلے کی بہ ظاہر کوئی صورت نہ تھی۔ پھر جب استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب لکھوی کو حدیث کے بارے میں ان کی قابلیت کا پتا چلا تو فرمایا اس شرط پر آپ کو داخل کیا جا سکتا ہے کہ آپ طلباء کو حدیث کی بعض کتابیں پڑھائیں گے اور میں آپ کو فنون کی مروّجہ کتابیں پڑھاؤں گا، چنانچہ انھوں نے حافظ محمد اسحاق حسینوی (جن کا تذکرہ آگے آئے گا) مولانا محی الدین لکھوی، مولانا معین الدین لکھوی اور بعض دیگر طلبا کو مشکوٰۃ شریف پڑھانا شروع کی اور خود حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے مروّجہ فنون کی بعض کتابیں پڑھنے لگے۔ اس طرح مولانا محی الدین لکھوی، مولانا عطاء اللہ حنیف

بھوجیانی کے حلقۂ تلامذہ میں آئے۔ ❶

لکھوکے میں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے استفادے کے بعد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے گوندلاں والا کا عزم کیا اور وہاں حضرت حافظ محمد گوندلوی سے مستفید ہوئے۔ پھر فارغ التحصیل ہونے کے بعد 1933ء میں کوٹ کپورہ (ریاست فریدکوٹ) تشریف لے گئے۔ وہاں سے حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے فرمان کے مطابق 1937ء میں مرکز الاسلام چلے گئے۔ وہاں مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین نے ان سے نسائی شریف پڑھی۔ ❷ یعنی یہ دونوں بھائی دو بارہ مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔

1938ء میں مرکز الاسلام سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی فیروز پور تشریف لے گئے۔ وہاں کئی سال ان کا درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار طلباء نے ان سے کسب فیض کیا۔ قیام فیروز پور کے زمانے میں ایک سال دارالعلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) میں بہ طور مدرس خدمات سرانجام دیں۔ وہاں بھی ان سے متعدد حضرات نے تحصیل علم کی جنھوں نے آگے چل کر مختلف مدارس میں بے شمار حضرات کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔

تقسیم ملک کے بعد حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمات اپنے آبائی دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کے لیے بہ طور شیخ الحدیث حاصل کر لیں۔ ایک عرصے تک وہ اس منصب پر فائز رہے اور بہت سے حضرات نے ان سے اخذِ فیض کیا۔

درس وتدریس کے علاوہ مولانا ممدوح کا بہت بڑا علمی کارنامہ نسائی شریف کی شرح ہے۔ جو ''التعلیقات السّلفیہ علی سنن النسائی'' کے نام سے عربی میں تحریر فرمائی اور خوب صورت انداز میں شائع ہوئی۔

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے ''الاعتصام'' کے خاص نمبر بہ سلسلہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی میں حافظ محمد اسحاق حسینوی کا مضمون صفحہ 334۔ نیز ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''گلستان حدیث'' صفحہ 320۔

❷ اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔

اگست 1949ء میں اخبار ''الاعتصام'' کا اجرا انھی نے کیا۔ اس اخبار کے پہلے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔ مولانا ندوی نے اس اخبار میں مسلک اہل حدیث کی نہایت شان دار اسلوب میں ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے بعد ان سطور کے راقم کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ میں نے آخر مئی 1965ء تک پندرہ سال یہ خدمت انجام دی۔ بعد ازاں مختلف حضرات اس کے منصب ادارت پر فائز رہے۔ خود مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی بھی ایک عرصے تک اس اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ انھوں نے دارالدعوۃ السّلفیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ ان کے نام سے ایک بہت بڑی لائبریری ہے، جس سے اہل علم استفادہ کرتے ہیں۔ اخبار ''الاعتصام'' اسی ادارے کا حصہ ہے۔ اس ادارے کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ مصباح القرآن کے نام سے حفظ قرآن کا مدرسہ بھی جاری ہے۔ طویل عرصے سے اخبار ''الاعتصام'' کی ادارت مولانا کے صاحب زادۂ گرامی حافظ احمد شاکر کے سپرد ہے۔ مولانا محی الدین لکھوی کے استاذِ عالی قدر مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے 2 اور 3۔ اکتوبر 1987ء کی درمیان رات کو وفات پائی۔

3۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی

حضرت ممدوح 1897ء (1315ھ) کو گوندلاں والا (ضلع گوجرانوالا) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولوی فضل الدین تھا۔ مولوی فضل الدین نے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور گوجراں والا کے مولانا علاء الدین صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی۔ نہایت متقی، تہجد گزار اور عالی ہمت بزرگ تھے۔ لیکن 35 سال کی جوان عمر میں وفات پا گئے۔ اس وقت حضرت حافظ صاحب کی عمر صرف نو برس کی تھی اور قرآن مجید کے چند سپارے حفظ کیے تھے۔

والدہ بے حد صالحہ اور صابرہ وشاکرہ خاتون تھیں۔ وہ اپنے اس بچے کو علم دین پڑھانے کا عزم رکھتی تھیں۔ چنانچہ انھیں قرآن مجید یاد کرایا اور دینی تعلیم کے لیے مولانا علاء الدین کی

خدمت میں گوجرانوالا بھیجا۔ وہاں انھوں نے عربی ادب اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس وقت امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کی بڑی شہرت تھی۔ گونداں والا کے ایک نیک دل بزرگ عبداللہ ٹھیکیدار تھے جو حافظ صاحب کے والد مولوی فضل الدین کے عقیدت مند تھے، انھوں نے ان کو مدرسہ غزنویہ میں داخل کرادیا۔ حضرت حافظ صاحب نے اس مدرسے میں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی اور مولانا عبدالرزاق پشاوری سے تفسیر وحدیث، فقہ واصول، صرف ونحو، معانی وبیان اور دیگر علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے بھی اخذِ فیض کیا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے اور طبیہ کالج میں اس کے نصاب کے مطابق علم طب پڑھا۔ اس کالج میں ان کے استاذ حکیم محمد اجمل خاں تھے، جنھوں نے ملکی سیاسیات میں بھی بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور طبی دنیا میں بھی بے حد شہرت پائی اور مسیح الملک کے لقب سے پکارے گئے۔ دہلی میں حضرت حافظ صاحب نے مولانا احمد اللہ دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن پنجابی اور مولانا محمد اسحاق منطقی سے بھی خوب استفادہ کیا۔ قیام دہلی کے زمانے ہی میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ مولوی فاضل کو اب فاضل عربی اور منشی فاضل کو فاضل فارسی کہا جاتا ہے۔

حافظ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت وفطانت کی نعمت بھی فراوانی سے عطا فرمائی تھی اور زہدو اتقاء کی دولت سے بھی بہت نوازا تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے تدریسی خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔ اپنے آبائی مسکن گونداں والا میں بھی ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ پھر دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ میں بھی کچھ مدت ان کی مسندِ درس آراستہ رہی۔ علاوہ ازیں مختلف اوقات میں گوجرانوالا، دارالسلام عمر آباد (مدراس) دارالعلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد)، جامعہ اسلامیہ (گوجرانوالا)، جامعہ سلفیہ (فیصل آباد)، جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کے لیے ان کی خدمات حاصل کی گئیں اور ان مدارس وجامعات میں ان سے بے شمار علماء وطلباء نے

حصولِ فیض کیا۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی ان کی تگ ودو کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا مولانا محی الدین لکھوی 1940ء میں حافظ صاحب کی خدمت میں گوجرانوالا گئے۔ حافظ صاحب صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک کا درس دیتے تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی نے حضرت ممدوح کے ان دروس میں شرکت کا اعزاز حاصل کیا۔

حضرت حافظ صاحب نے کم وبیش نوے (90) برس کی عمر پا کر 4۔جون 1985ء (14۔رمضان المبارک 1405ھ) کو تین بجے سہ پہر اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا اور عالم جاودانی کی راہ لی۔ دوسرے دن 5۔جون کو صبح نو بجے ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور گوجراں والا کی سرزمین نے ان کے جسدِ خاکی کو بہ درجہ غایت مسرت کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیا۔ اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس۔

4۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی:

مولانا محی الدین لکھوی کے ایک انتہائی لائق احترام استاذ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی تھے۔ ان کے حلقۂ تلمذ میں وہ گوجراں والا میں 1940ء میں شامل ہوئے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے خاندان میں کئی پشتوں سے علم وعمل کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا کے والد گرامی کا نام مولانا محمد ابراہیم تھا۔ وہ اپنے عہد کے نامور عالم دین بھی تھے اور مشہور خطاط بھی۔! حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی کی کتابت انھی نے کی تھی۔ مولانا محمد ابراہیم کا مسکن موضع ڈھونیکے تھا جو وزیر آباد شہر کے قریب ایک گاؤں ہے۔ انھوں نے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے حصولِ فیض کیا تھا۔

حضرت ممدوح عبادت وصالحیت میں بھی ممتاز درجے پر فائز تھے۔ انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اسے علوم دینی کی تعلیم دلائیں گے۔ چنانچہ 1897ء میں اللہ نے انھیں بیٹا عطا کیا، جس کا نام انھوں نے محمد اسماعیل رکھا۔ پھر خود ہی بیٹے کو ابتدائی تعلیم

دی۔ بیٹے نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو انھیں وزیر آباد میں حضرت حافظ عبدالمنان کے حلقۂ درس میں داخل کرادیا گیا۔ حضرت حافظ صاحب ممدوح سے انھوں نے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں وہ مدرسہ غزنویہ امرتسر چلے گئے اور کچھ عرصہ وہاں کے اساتذہ سے حصولِ فیض کرتے رہے۔ پھر عازم دہلی ہوئے اور وہاں حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری اور دیگر حضرات سے اخذ علم کیا۔ سیالکوٹ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے تحصیل علم کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اللہ نے ان کو ذہانت سے بھی خوب نوازا تھا اور کسبِ علم کا بے پناہ شوق بھی ودیعت فرمایا تھا۔

سندِ فراغت لینے کے بعد وہ 1921ء میں گوجرانوالا چلے گئے اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث میں درس وتدریس اور خطابت وامامت کا سلسلہ شروع کردیا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی کا انداز کلام بے حد موثر اور زوردار تھا اور جو کچھ فرماتے، قرآن وحدیث کی روشنی میں فرماتے اور گوجراں والا میں اسی قسم کے خطیب کی ضرورت تھی۔ اہل حدیث کی تعداد اس زمانے میں وہاں بہت کم تھی، لیکن مولانا سلفی نے جس طریقے سے کام کا آغاز کیا اور وعظ وخطابت کے لیے جو لہجہ اختیار فرمایا اس نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور روز بروز اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ پھر جلد ہی اس شہر میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جو ہر اعتبار سے مقبول تھی اور اس کا ہر رکن کتاب وسنت کا داعی تھا۔

مولانا نے ایک خاص انداز سے سیاسیات میں بھی حصہ لیا اور آزادیٔ ملک کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ اس کے نتیجے میں وہ قیدوبند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہوئے۔

تحریر ونگارش میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ تحقیق میں ڈوب کر قلم کو حرکت دیتے اور خالص علمی انداز میں اظہارِ رائے فرماتے۔ اللہ نے ان کی تصنیفات کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی اور اہل علم نے ان میں سے بیشتر کو عربی میں منتقل کیا۔ ہندوستان کے مشہور فاضل

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے ان کی چار اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ وہ کتابیں ہیں۔ (1) تحریک آزادیٔ فکر اور شاہ ولی اللہ کی مساعیٔ جمیلہ (2) مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ (3) زیارت قبور (4) حجیت حدیث۔

ان کتابوں کے علاوہ حضرت مرحوم کے بعض مضامین کو بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے عربی کے قالب میں ڈھالا۔

ہندوستان کے ایک اور عالم مولانا صلاح الدین مقبول احمد (ساکن کویت) نے بھی مولانا سلفی کی بعض اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

مولانا ممدوح سے مولانا محی الدین لکھوی نے گوجراں والا میں تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی کے بعض حصے پڑھے۔ مجھے شبہ پڑتا ہے، ہدایہ کا کچھ حصہ بھی ان سے پڑھا تھا۔ میں ان کتابوں میں مولانا لکھوی کا ہم درس تھا۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی نے 20۔فروری 1968ء کو وفات پائی۔

مولانا محی الدین لکھوی کے یہ پانچوں اساتذہ جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا، بہت مشہور اور اونچے مرتبے کے اہل علم تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

استاذ کے تذکرے سے شاگرد کی قابلیت کا پتا چلتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ استاذ اگر بہت قابلیت کا مالک ہے تو شاگرد میں بھی لازماً اس کے اثرات پائے جاتے ہوں گے۔

ان کے ان اساتذۂ گرامی کو بارگاہِ الٰہی سے بے شمار خصائص سے نوازا گیا تھا۔ صالحیت میں، تدریس میں، وعظ وارشاد میں، بلندیٔ اخلاق میں، لوگوں سے ہم دردی میں ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ بے شک مولانا محی الدین لکھوی بھی ان تمام معاملات میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا، وعظ وتقریر میں بھی ان کو خاص

حیثیت حاصل رہی۔ نیکی وصالحیت اور ذکرواذکار میں بھی ان کو بے شمار لوگوں سے امتیاز حاصل تھا اور لوگوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ بھی ان میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے عالی قدر اساتذہ کے اوصافِ حسنہ کا خوب صورت نمونہ تھے۔

یہ سب حضرات اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں۔ ہم عاجز بندوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ ان کی حسنات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمادی ہے۔

ان الحسنات یذھبن السیاٰت



تیرھواں باب

مولانا لکھوی کے چند ہم درس حضرات

مولانا محی الدین لکھوی نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں تین مقامات میں مروّجہ علوم وفنون کی تکمیل کی۔ ابتدائی اور اوسط درجے کی کتابیں اپنے آبائی گاؤں لکھوکے میں پڑھیں۔ بعض انتہائی کتابیں اپنے والد مکرم مولانا محمد علی لکھوی کے آباد کردہ مقام مرکز الاسلام میں پڑھیں اور مزید انتہائی کتابوں کے لیے حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بابِ فضیلت پر حاضری دی۔ ان تینوں مقامات میں بے شمار طلبا ان کے ہم جماعت رہے۔ مجھے ان میں سے بہت سے حضرات کا علم ہے۔ ان سب کا ذکر تو نہیں کیا جاسکتا، تاہم جی چاہتا ہے کہ اس طائفۂ ذی مرتبت کے چند افراد کا ذکر ضرور کیا جائے تاکہ مولانا مرحوم کی آل اولاد کو بھی پتا چلے کہ ان کے اس عالی قدر بزرگ کے ساتھ کن لوگوں نے تعلیم حاصل کی اور وہ کس حیثیت کے مالک تھے اور اس کتاب کے خوانندگانِ محترم بھی ان سے تھوڑا بہت متعارف ہو جائیں، تو آیئے آج سے پچھتر (75) سال قبل کی تاریخ کے اس گوشے سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن حضرات کا میں تذکرہ کرنے چلا ہوں افسوس ہے وہ سب وفات پا چکے ہیں اور اس جہانِ آب وگل میں کوئی ان میں سے باقی نہیں رہا۔ جی چاہتا ہے کہ چند ثانیے مولانا کے ان مرحوم ساتھیوں کی یاد میں صرف کیے جائیں، جن سے کسی زمانے میں ان کے گہرے مراسم تھے اور ان سے کئی قسم کی باتیں کی جاتی تھیں اور خود اس خاک نشین کا بھی ان سے تعلق رہا تھا۔

1۔ حافظ محمد اسحاق حسینوی:

ان میں سے پہلے حافظ محمد اسحاق کا تذکرہ کرتے ہیں جن کا ذکر اس سے قبل بھی ہو چکا ہے۔ اب کچھ مزید باتیں سنیے۔ وہ لکھوکے میں مشکوٰۃ شریف میں ان کے ہم سبق تھے۔ حافظ صاحب موضع حسین خاں والا (تحصیل پتوکی ضلع قصور) میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور بعض اساتذہ سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر لکھوکے گئے اور وہاں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ درس میں رہے۔ گوندلاں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی سے استفادہ کیا، عمر آباد (مدراس) میں بھی حضرت حافظ صاحب گوندلوی سے مستفید ہوئے۔ دہلی میں مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی سے بعض کتبِ حدیث پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اوڈاں والا ضلع فیصل آباد میں خدمت تدریس سرانجام دی۔ طویل عرصے تک دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز رہے۔ جامعہ اہل حدیث قدس (لاہور) میں بھی کئی سال بطور شیخ الحدیث ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ مشہور مدرس اور ماہر علوم درسیہ تھے۔

تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ عربی کتابوں کا بہترین اردو ترجمہ کرتے تھے۔ صاف اور ادیبانہ اندازِ تحریر تھا۔ درسِ نظامی کی عربی نظم کی مشہور کتاب حماسہ کا اردو ترجمہ کیا۔ امام ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ چار جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی تو اسے اردو میں منتقل کیا۔ جدید اور قدیم عربی کے ماہر عالم تھے۔ انھوں نے متعدد عربی کتابوں کے ترجمے بھی کیے اور کتابیں تصنیف بھی فرمائیں۔ لکھوکے میں انھوں نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے مشکوٰۃ شریف پڑھنا شروع کی تو مولانا محی الدین ان کے ہم سبق تھے۔ اب اگلی بات خود حافظ صاحب کی زبانی سنیے! فرماتے ہیں:

(مشکوٰۃ شریف کی عبارت پڑھنے میں) میرے اور مولوی محی الدین لکھوی کے درمیان مقابلہ ٹھن گیا۔ ہم دونوں یہ کوشش کرتے تھے کہ عبارت پڑھنے میں دوسرے کی نسبت غلطیاں کم ہوں۔ ہم سبق پڑھتے وقت ایک دوسرے کی غلطیاں گنتے، جس کی غلطیاں کم ہوتیں وہ

خوش ہوتا اور جس کی زیادہ ہوتیں وہ ندامت محسوس کرتا اور آئندہ پہلے کی نسبت زیادہ صحیح پڑھنے کی کوشش کرتا۔ ❶

حافظ محمد اسحاق حسینوی نے 4۔ جولائی 2002ء (22۔ ربیع الثانی 1423ھ) کو لاہور میں وفات پائی۔

2۔ حافظ محمد زکریا:

یہ میاں محمد باقر کے فرزند دلبند تھے۔ میاں صاحب چک 427 گ۔ ب جھوک دادو تحصیل تاندلیاں والا ضلع فیصل آباد کے رہنے والے تھے۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد تھے اور حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی سے تعلقِ ارادت رکھتے تھے۔ نہایت متقی بزرگ تھے۔ حافظ محمد زکریا انہی کے فرزند گرامی تھے جو 1914ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ مختلف حضرات سے تعلیم حاصل کی اور 1940ء میں حضرت حافظ محمد صاحب گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں گوجراں والا پہنچے۔ اس وقت مولانا محی الدین لکھوی بھی وہیں تھے۔ دونوں ہم عمر بھی تھے اور عابد و زاہد بھی۔ گوجراں والا میں دونوں ہم سبق تھے۔ دونوں کے والد اصحابِ علم تھے۔

حافظ محمد زکریا عبارت بالکل صحیح اور تیز پڑھتے تھے۔ مولانا محی الدین میں بھی یہ خوبی پائی جاتی تھی۔ عبارت پڑھنے میں کہیں ٹھوکر نہیں کھاتے تھے۔

حافظ محمد زکریا کو یہ شوق دامن گیر رہتا تھا کہ حدیث کی کتابوں پر اہلِ حدیث علماء کے عربی حواشی ہونا چاہئیں، چنانچہ مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے کہنے پر جو ''مرعاۃ المصابیح شرح مشکوٰۃ المصابیح'' لکھنا شروع کی تھی، اس میں حافظ محمد زکریا کی کوشش کو بڑا دخل تھا۔

❶ ہفت روزہ الاعتصام کا مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نمبر بابت مارچ 2005ء۔ محرم 1426ھ (مضمون حافظ محمد اسحاق حسینوی) صفحہ 335۔

حافظ محمد زکریا خود بھی تصنیف و تالیف سے دلچسپی رکھتے تھے اور عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنے میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ کیا، جن میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہم اللہ کے بعض رسائل بھی شامل ہیں۔

1۔ الوابل الصیب

2۔ افاداتِ ابن تیمیہ

3۔ ذکرِ الٰہی

4۔ زرادی: یہ علم صرف کی ابتدائی درجے کی کتاب ہے اور بڑی مشکل ہے۔ اس کے مصنف فخر الدین زرادی (متوفی 651ھ) تھے۔ حافظ محمد زکریا نے ''ہادی'' کے نام سے اس کی اردو شرح لکھی، جس کا نام ''ہادی شرح زرادی'' رکھا۔

5۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے امام شوکانی کے حالات میں ایک چھوٹا سا رسالہ لکھوایا، جس کا نام ''امام شوکانی'' ہے۔ 1945ء میں حافظ صاحب نے یہ رسالہ شائع کیا۔ وہ کاتب بھی تھے۔ مندرجہ بالا تمام رسائل کی انھوں نے خود ہی کتابت کی۔

6۔ امام رازی کی کتاب ''عصمۃ الانبیاء'' کا ترجمہ کیا، لیکن یہ ترجمہ شائع نہیں ہوا۔

7۔ حضرت حافظ محمد لکھوی کی مشہور درسی کتاب ''ابواب الصرف'' کی شرح لکھی۔ لیکن یہ شرح بھی شائع نہیں ہوسکی۔ معلوم نہیں یہ مسودہ اب ان کے گھر میں موجود ہے یا نہیں۔ اگر موجود ہو اور ہمت کر کے کوئی صاحب یہ کتاب شائع کردیں تو یہ علم صرف کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

حافظ صاحب نہایت نیک اور عبادت گزار تھے۔ عین عالمِ جوانی میں اگست 1949ء میں فوت ہوئے۔

3۔ مولانا خالد گرجاکھی:

جس زمانے کی میں بات کررہا ہوں اس زمانے میں گوجرانوالا سے گرجاکھ ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ اب یہ فاصلہ ختم ہوگیا ہے اور گوجرانوالا اور گرجاکھ ایک دوسرے کے قریب

آ گئے ہیں۔

مولانا نور حسین گرجاکھی مشہور واعظ اور مناظر تھے۔ پنجابی کے شاعر بھی تھے، مولانا خالد گرجاکھی انہی کے لختِ جگر تھے۔ یہ 1940ء میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ وہ 11۔جنوری 1922ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا نور حسین سے حاصل کی۔ پھر جملہ علوم وفنون کی تحصیل گوجراں والا میں حضرت حافظ صاحب گوندلوی اور حضرت مولانا سلفی سے کی۔ 1940ء میں وہ مولانا محی الدین لکھوی اور اس فقیر کے ہم درس رہے اور 1941ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔ کتبِ احادیث کی عربی عبارت بڑی صفائی سے پڑھتے تھے۔ ان کے والد گرامی مولانا نور حسین گرجاکھ کی مسجد کے امام وخطیب تھے۔ 18۔دسمبر 1951ء کو ان کا انتقال ہوا تو مولانا خالد گرجاکھی باپ کی جگہ خطابت وامامت کے منصب پر فائز ہوئے۔

مولانا خالد گرجاکھی قلم وقرطاس سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔ وہ مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی سے بہت متاثر تھے۔ ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرتِ طیبہ کے موضوع پر بھی انھوں نے کتاب تصنیف کی، جس کا نام ”سیرۃ الاخوین“ رکھا۔ انھوں نے بعض اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔ جماعتی اخباروں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے۔ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت مجاہدین سے وہ بہت متاثر تھے اور اس جماعت کی مساعیٔ جمیلہ سے انھیں بے حد دلچسپی تھی۔

اردو کے علاوہ انھوں نے عربی میں بھی تحریری کام کیا۔ وہ باہمت اور خوش گفتار عالم تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی کا قیام گوجراں والا کے زمانے میں ان پر جو اثر ہوا، وہ ان کے ذہن میں قائم رہا۔ میری ان سے ملاقات ہوتی تو دوران گفتگو مولانا لکھوی کا ذکر بھی آتا۔ انھوں نے 9۔اپریل 2005ء کو وفات پائی۔

4۔ مولانا محمد افضل:

مرکز الاسلام سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ''چک مولوی والا'' تھا جو نواب افتخار حسین (آف ممدوٹ) کی جاگیر میں شامل تھا۔ مولوی محمد افضل کا مسکن یہی گاؤں تھا۔ وہ 9۔ ستمبر 1919ء کو پیدا ہوئے۔ ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اس خاندان کے تمام افراد لکھوی علمائے کرام کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے۔ مولوی محمد افضل کسی زمانے میں لکھوکے میں مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین کے ہم درس رہے تھے۔ وہ تعلیم کے لیے گاؤں سے لکھوکے آتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔ لکھوکے ان کے گاؤں سے شاید تین میل ہوگا۔ جب 1937ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مرکز الاسلام گئے اور وہاں انھوں نے سلسلۂ تدریس شروع کیا تو مولوی افضل مرکز الاسلام آنے لگے تھے۔

مولوی محمد افضل بڑے نیک اور شریف الطبع تھے۔ 1940ء میں وہ گوجراں والا میں مولانا محی الدین اور میرے ہم درس تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ایک سرکاری سکول میں عربی اور اسلامیات کے معلم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ بورے والا آئے۔ یہاں بھی سکول میں ملازمت کی اور یکم اکتوبر 1981ء کو ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اگست 1985ء میں انھوں نے بورے والا میں اپنا سکول جاری کیا، جس کا نام ''تابندہ ماڈل ہائی سکول بورے والا'' ہے۔ اس سکول نے بورے والا اور اس کے گردونواح میں بڑی شہرت پائی۔

مولوی محمد افضل 88 برس کی عمر کو پہنچ کر یکم مارچ 2007ء کو فوت ہوئے۔

5۔ راقم عاجز محمد اسحاق بھٹی:

ان سطور کے راقم عاجز کو دو مقامات میں مولانا محی الدین لکھوی کے ہم درس ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ 1937ء میں مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے

سننِ نسائی ہم نے اکٹھے پڑھی۔ گوجرانوالا میں صحیح بخاری اور بعض دیگر کتابوں میں ہم دونوں ہم سبق تھے۔ اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔

6۔ حافظ عبداللہ:

مولانا محی الدین لکھوی کے ہم درس حضرات میں سے ایک طالب علم حافظ عبداللہ تھے جو ضلع گوجرانوالا کے ایک قصبہ لدھے والا وڑائچ کے رہنے والے تھے اور حضرت حافظ محمد گوندلوی کے رشتے داروں میں سے تھے۔ نیک اطوار اور محنتی طالب علم تھے۔ عبارت صاف اور صحیح پڑھتے تھے۔ مولانا محی الدین کی صالحیت سے نہایت متاثر تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے کہیں سلسلۂ تدریس شروع کر دیا تھا۔ درسی کتابوں پر عبور حاصل تھا اور طلباء کو پڑھانے کا انھیں شوق بھی تھا۔ علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور تدریس ان کی دلچسپیوں کا محور تھا۔ قلم و قرطاس سے لگاؤ نہ تھا۔

اس خوش کردار عالم نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے بے حد حلیم الطبع اور شریف النفس عالم تھے۔

ان حضرات کے علاوہ گوجرانوالا میں اور بھی متعدد لوگ تھے، جو مولانا محی الدین کا بے حد احترام کرتے اور خاندانی اور ذاتی اعتبار سے ان کے ساتھ قلبی تعلق رکھتے تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ فوت شدگان کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور زندوں کو عمل خیر کی توفیق سے نوازے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنھوں نے اعمال خیر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور انھیں ان کی نیکیوں کی وجہ سے بہتر الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔



چودھواں باب

چند واقعات

اس باب میں مولانا محی الدین لکھوی سے متعلق چند چھوٹے چھوٹے واقعات ملاحظہ فرمایے، جن کا تعلق مرکز الاسلام سے ہے

1۔ مولانا معین الدین لکھوی کے پاس بے شمار تعویذ لینے والے آتے تھے اور وہ انھیں تعویذ لکھ کر دیتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ بعض معاملات میں ان کا تعویذ فوری اثر کرتا تھا مثلاً جنات کے سلسلے میں ان کا دم اور تعویذ موثر ہوتا تھا اور جس شخص کو یہ عارضہ لاحق ہوتا، اسے اللہ افاقہ عطا فرماتا تھا۔ بے اولادوں کے لیے، بچوں کی بعض بیماریوں دق الاطفال اور اٹھرا وغیرہ کے لیے بھی ان کے تعویذ میں اللہ نے تاثیر رکھی تھی۔ عورتوں کے بعض عوارض کے سلسلے میں بھی ان کا تعویذ افاقے کا ذریعہ ثابت ہوتا تھا۔ لیکن ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین تعویذ نہیں لکھتے تھے۔ وہ چینی یا نمک پر دم کرتے اور اس کے استعمال سے اللہ تکلیف رفع فرما دیتا۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر تھا کہ چند اشخاص آئے، انھوں نے مولانا کو نمک کی ایک ایک ڈلی پیش کی اور ان پر دم کرایا۔ ایسے مواقع پر ہم بے عملوں کو بے عملوں جیسی باتیں ہی سوجھا کرتی ہیں۔ وہ لوگ دم کرا کے چلے گئے تو میں نے عرض کیا کہ اس طرح نمک کی ایک ایک ڈلی پر دم کرنے سے بہتر ہوگا کہ کسی دن آپ کوہستان نمک پر تشریف لے جائیں اور وہاں کھڑے ہو کر پھونک ماردیں تا کہ نمک کھانے والے سب بیمار صحت مند ہو جائیں اور جو صحت مند ہیں، وہ بیماری سے محفوظ رہیں۔

میری یہ ''بے عملانہ'' بات سن کر مولانا مسکرائے اور خاموش رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ممدوح نہایت تقویٰ شعار عالم تھے۔

2۔ مرکز الاسلام سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں خلجی برادری کا ایک زمیندار خاندان آباد تھا۔ ان کا بعض لکھوی حضرات سے کسی معاملے میں کچھ اختلاف تھا جس کی تفصیل کا مجھے علم نہیں۔ انھیں جنات پریشان کرتے تھے اور ان کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ مولانا محی الدین کی خدمت میں جاؤ، انھیں ساری بات بتاؤ۔ وہ اللہ کریں گے اور اللہ بھلی کرے گا۔ لیکن خلجی ان کے پاس جانے سے گھبراتے تھے کہ ایسا نہ ہو مولانا ہم پر خفگی کا اظہار کریں اور ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔

لوگوں نے کہا: ایسا نہیں ہوگا۔ تم جاؤ، وہ بہت اچھی طرح پیش آئیں گے، اللہ کا نام لیں گے اور تمھاری تکلیف رفع ہو جائے گی۔

چنانچہ وہ مولانا کی خدمت میں آئے اور اپنی مصیبت بیان کی۔ مجھے یاد پڑتا ہے مولانا نے جنات کے نام ان کو اس قسم کے چند الفاظ لکھ کر دیے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از محی الدین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہ لوگ تمھارے ہاتھوں بہت پریشان ہیں۔ اب تم چلے جاؤ۔

والسلام

فرمایا: یہ رقعہ کسی صاف ستھرے کپڑے میں بند کر کے اس دروازے پر باندھ دو جس سے گھر میں داخل ہوا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تکلیف رفع فرما دے گا، چنانچہ مولانا کے فرمان پر عمل کیا گیا اور ان لوگوں کی پریشانی ختم ہوگئی۔

3۔ مولانا کا ایک مزارع چھوٹے قد کا گول گپا سا تھا۔ اس کا نام چراغ تھا۔ مولانا اسے سراج کہا کرتے تھے۔ مولانا نے اس کے قد کے مطابق چھوٹے قد کے دو بیل خرید کر اسے دیے۔ وہ یہ بیل جوڑ کر ہل چلایا کرتا تھا۔ بعض دفعہ مولانا اس کے پاس چلے جاتے اور

اس سے ہل پکڑ کر خود چلانے لگتے۔ وہ مولانا کو ہل چلاتے دیکھ کر بڑا خوش ہوتا۔

4۔ مولانا کی مرکز الاسلام والی زمین کا ایک مزارع خان محمد ریکوال تھا، جسے لوگ خانوں کہا کرتے تھے۔ اس کے ایک بھائی نور محمد تھے جو نکھرے ہوئے رنگ کے داڑھی منڈے طویل قامت جوان تھے اور ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ حضرت مولانا محمد علی مرحوم سے نور محمد کے اچھے مراسم تھے۔ وہ مولانا کے سامنے سگریٹ پیتے تھے تو مولانا انھیں کچھ نہیں کہتے تھے، حالاں کہ وہ سگریٹ نوشی کے سخت خلاف تھے۔ ایک دن مولانا محی الدین کے سامنے سگریٹ پیا تو انھوں نے ان کو روک دیا۔ نور محمد نے اسے محسوس کیا اور کہا کہ میں ان کے باپ کے سامنے سگریٹ پیتا تھا اور وہ مجھے کچھ نہیں کہتے تھے۔ کیا یہ ان سے بھی زیادہ عالم ہیں؟ اس کے بعد انھوں نے مولانا محی الدین سے معافی مانگ لی تھی اور معاملہ ختم ہوگیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد نور محمد جڑاں والا کے قریب چک نمبر 5 گ ب میں آباد ہو گئے تھے۔ مرکز الاسلام میں مجھ سے وہ بہت اچھا تعلق رکھتے تھے۔ انھیں جب ہمارے متعلق معلوم ہوا کہ ہمارا خاندان اسی علاقے میں آبسا ہے تو وہ جڑاں والا کی غلہ منڈی میں گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے پر پہنچے اور میرے عزیزوں سے میرے متعلق پوچھا اور اپنے متعلق انھیں بتایا اور پیغام دیا کہ میں انھیں ضرور ملوں یا ان کے گاؤں پہنچوں یا لاہور سے جڑاں والا آؤں تو انھیں وہاں بلالوں۔ لیکن افسوس ہے میں ان سے مل نہ سکا۔ میں لاہور سے جب بھی جڑاں والا گیا، مجھے گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے سے اپنے عزیزوں کی زبانی نور محمد کا پیغام ملا، مگر ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ایک دن میں بذریعہ بس جڑاں والا سے لاہور آرہا تھا کہ چک نمبر 5 سے خان محمد (خانوں) اسی بس میں سوار ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے پہچان لیا اور نہایت تپاک سے ملے۔ میں نے بھی پہچان لیا۔ کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ نور محمد صاحب چک نمبر 5 سے حجرہ شاہ مقیم (ضلع اوکاڑہ) چلے گئے تھے۔ معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے حج بھی کرلیا تھا اور زندگی بالکل بدل گئی تھی۔ حجرہ شاہ مقیم میں فوت ہوئے۔ مولانا محمد علی لکھوی کے گھرانے سے وہ عقیدت مندانہ علاقہ رکھتے تھے۔ اس دور کے بہت سے لوگ جو

مرکز الاسلام کے قرب وجوار میں رہتے تھے۔ وفات پا چکے ہیں، ان سے ہمارے مراسم تھے اور ہر روز کی ملاقات تھی۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے اور اس گناہ گار کو عملِ خیر کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

5۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ 1938ء میں دو غیر مسلمان نوجوان بھائیوں نے مولانا محی الدین کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ بڑے بھائی کا نام محمد دین رکھا گیا اور چھوٹے کا محمد حنیف۔ مولانا انھیں کچھ پڑھاتے بھی رہے۔ وہ دونوں بڑے شریف اور نیک نوجوان تھے۔ ان کے لیے رہنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ مولانا نہایت رحم دل تھے۔ انھیں وہ اس مکان میں لے آئے جس میں مرکز الاسلام کی چاردیواری کے اندر 1937ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رہتے تھے۔ ان کے لیے کچھ کام کاج کا انتظام بھی کردیا۔ دونوں بھائیوں کے میرے ساتھ بھی اچھے تعلقات تھے۔

ایک دن گیارہ بجے کے قریب میں نے محمد دین سے کہا کہ آج تین بجے کی ٹرین سے میں اپنے گھر کوٹ کپورہ جاؤں گا اور ہفتے کے روز واپس آؤں گا۔ وہ بالعموم مسکراتا رہتا تھا۔ مسکراتے ہوئے مجھے کہا آج آپ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھایے، میں آپ کے لیے کھیر اور گوشت پکاؤں گا۔ میری دعوت قبول کیجیے۔ کھانا کھا کر چلے جایے گا۔

میں نے کہا: ٹھیک ہے تمھاری دعوت منظور۔ تمھارے ہاتھ کی پکی ہوئی کھیر بھی کھائیں گے اور گوشت بھی۔

اس زمانے میں کھیر پکا کر اس کے اوپر عام طور سے شکر ڈالی جاتی تھی۔ اس نے کانسی کی بڑی سی تھالی میں کھیر ڈالی اور اس کے اوپر شکر بکھیری اور ہم نے کھائی۔ محمد دین صحت مند جوان تھا۔ کھانے کے دوران اس نے ہنستے ہوئے مجھے کہا:

جناب! ہماری شادی اس دنیا میں کہیں ہوگی یا جنت میں حوروں کے ساتھ ہوگی؟

میں نے کہا: فکر نہ کرو، کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی۔

یہ ہنسی مذاق کی بات تھی۔ میں چلا گیا۔ تیسرے دن واپس آیا تو پتا چلا کہ محمد دین کو دل

کی تکلیف ہوئی او وہ وفات پا گیا۔

سن کر نہایت افسوس ہوا اور اس کی حوروں کے ساتھ شادی والی بات میرے دل میں بیٹھ گئی جو اس کی وفات کی اطلاع دینے والوں کو میں نے سنائی۔ ہنسی مذاق کی بات حقیقت میں بدل گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس پاک باز شخص کی شادی ضرور جنت میں حوروں کے ساتھ ہوئی ہوگی۔

دونوں بھائیوں کا سانولا سا رنگ تھا، محمد دین کا کم اور محمد حنیف کا قدرے زیادہ۔ یوں تو دونوں بھائی قدآور تھے، لیکن محمد دین کا قد محمد حنیف سے کچھ لمبا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد مختلف اوقات میں محمد حنیف سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ اس نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ وہ گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) میں مقیم ہے۔ پاکستان آکر اس کی شادی ہوگئی تھی اور وہ صاحبِ اولاد تھا۔ بہت مدت سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خدا جانے کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

مولانا محی الدین ان دونوں بھائیوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کیا کرتے تھے۔

اس قسم کے لوگوں کی مدد کرنا ان کی زندگی کا ضروری حصہ تھا اور ان کی فطرت میں داخل تھا۔

6۔ مارچ 1943ء سے لے کر جولائی 1947ء تک میں بہ طور مدرس مرکز الاسلام رہا۔ چودھری غلام حسین تہاڑیا بھی وہیں تھے اور ہماری آپس میں دوستی ہوگئی تھی جو اللہ کی مہربانی سے اب تک قائم ہے۔ ایک دن مولانا محی الدین نے مشورہ دیا کہ مرکز الاسلام کے طلبا اردو میں گفتگو کیا کریں۔ چودھری صاحب بھی یہی چاہتے تھے، اور اس پر عمل شروع ہوگیا۔ اب تو پنجاب کے دیہات میں بھی بچے اردو بولتے ہیں، اس وقت پنجاب کے شہروں میں بھی اردو بولنے کا زیادہ رواج نہ تھا۔ مرکز الاسلام میں چھوٹے بچے اردو بولتے تو بسا اوقات عجیب قسم کی لطیفانہ صورت حال پیدا ہوجاتی۔ پھر آہستہ آہستہ معاملہ ٹھیک ہوگیا تھا اور لڑکے صحیح اردو بولنے لگے تھے۔

7۔ پھر جامعہ محمدیہ کی زبان عربی کردی گئی تھی۔ اس میں بھی ابتدا میں لطائف کا عنصر غالب رہا، لیکن آگے چل کر سب کچھ درست ہوگیا اور بچے اردو کی طرح عربی بھی اچھی طرح بولنے لگے۔

8۔ مولانا محی الدین نمازِ فجر سے کچھ دیر پہلے مسجد میں آجاتے اور السلام علیکم کہتے۔ گرمیوں میں لڑکے صحن میں چارپائیوں پر لیٹے ہوتے تھے۔ مولانا کسی کو جگاتے نہیں تھے۔ قدرے بلند آواز سے نماز تہجد میں قرآن پڑھتے۔ نہایت موثر اور خوب صورت آواز تھی جو رات کے سناٹے میں جنگل کی اس کھلی فضا میں دور تک پہنچتی اور سننے والے کے ذہن میں خاص قسم کے اثرات کروٹ لینے لگتے۔

9۔ عشا کی نماز وہاں دیر سے پڑھی جاتی تھی۔ سردیوں میں تو دیر کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ سرسوں کے تیل کے دیے یا مٹی کے تیل کی لالٹین کی روشنی میں اپنے ذوق اور پسند کی کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوجاتے اور وقت آسانی سے گزر جاتا، لیکن گرمیوں میں زیادہ دیر انتظار کرنا مشکل ہوتا تھا۔ دیے کی روشنی میں پڑھا نہیں جاتا تھا۔ اس لیے کہ پروانوں کی فوج دیے پر ٹوٹ پڑتی تھی اور بیٹھنے والوں کو اپنا رقیب سمجھ کر اجتماعی حملے کی زد میں لے آتی تھی۔ اب دیا بجھا کر سوائے چارپائی پر لیٹنے کے چارہ نہ ہوتا اور لیٹنے کا نتیجہ نیند کی شکل میں نکلتا، اس طرح نماز تو پڑھ ہی لیتے تھے، لیکن غنودگی سی طاری رہتی۔ مولانا کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو صورتِ حال بدل گئی اور نماز کچھ پہلے پڑھی جانے لگی۔ لیکن یہ توجہ کیسے دلائی گئی اور نماز کس طرح پہلے پڑھی جانے لگی؟ اس کا پس منظر کچھ ''گستاخانہ'' سا ہے اور اس ''گستاخی'' کا باعث یہ گناہ گار ہی ہے۔ اس کا ذکر میں اپنی ایک کتاب ''قافلہ حدیث'' میں کرچکا ہوں، یہاں بھی پڑھ لیجیے اور مولانا کے تحمل اور برداشت کی داد دیجیے اور میرے لیے دعا فرمایے۔ مجھے جب بھی 67۔68 سال پہلے کا یہ واقعہ یاد آتا ہے، سخت شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔

ایک دن اتفاق سے چودھری غلام حسین وہاں نہیں تھے۔ مجھے ایک بات سوجھی (یا یوں کہیے کہ شیطان نے سوجھائی) میں نے لڑکوں سے کہا کہ مولانا کے تشریف لانے سے پہلے نماز

پڑھ لو اور چار پائیاں پیچھے ہٹا کر سو جاؤ۔ نیند آئے یا نہ آئے بس لیٹے رہو اور ''سوئے رہو۔'' چنانچہ میں نے آہستہ آواز میں جماعت کرائی اور اس سے فارغ ہو کر طے شدہ منصوبے کے مطابق سب چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ ایسے چوری چھپے کے مواقع پر نیند تو آتی نہیں، صرف لیٹنا ہی ہوتا ہے۔ بعض لڑکے مصنوعی خراٹے بھی لینے لگے۔

مولانا حسبِ معمول دیر سے تشریف لائے۔ لم لیٹوں کو دیکھا اور بہ آواز بلند السلام علیکم کہہ کر اذان کہی، دو رکعتیں پڑھیں اور پھر اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے دو تین دفعہ کھانسنے کی آواز نکالی۔ جب ''گہری نیند سونے'' والوں کی طرف سے کسی ردِعمل کا اظہار نہ ہوا تو چار فرض پڑھنے کے لیے ''سوئے ہوئے'' لشکر کو السلام علیکم کی مسنون آواز سے جگانے کی کوشش کی۔ سوئے ہوئے کو تو آدمی جگا سکتا ہے، جاگنے والے کو کون جگائے۔ رات کے اندھیرے میں سب انھیں دیکھ رہے تھے۔ وہ جہری قرأت سے اکیلے نماز پڑھ کر چلے گئے۔ کسی سے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن بھی اس ضمن میں کوئی بات نہیں کی۔ البتہ عشاء کی نماز کے لیے روزانہ کے معمول سے پہلے تشریف لائے اور پھر ہر روز پہلے آنے کو معمول بنا لیا۔ اس کے بعد ہمیں کبھی ''سونے'' کی ضرورت نہیں پڑی۔

10۔ مولانا ممدوح کی ظہر کی نماز خاصی طویل ہوتی تھی۔ ایک دو مرتبہ نماز کی طوالت کی بنا پر کچھ مہمان گاڑی سے بھی رہ گئے۔ میں نے عرض کیا تو مسکراتے ہوئے فرمایا نبی ﷺ تو ظہر کی نماز میں لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ بہر حال جب انھیں پتا چلا کہ نماز میں طوالت کی وجہ سے مہمان ٹرین پر سوار نہیں ہو سکتے تو نماز اختصار سے پڑھنے لگے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محی الدین لکھوی نہایت حلیم الطبع اور بے حد سلیم الفطرت عالم دین تھے۔ حلم ان کا خاصہ، سلامت روی ان کا شب و روز کا ضروری عمل اور صالحیت ان کا جزوِ حیات تھا۔ شائستگی کا پیکر اور شگفتگی کا اعلیٰ نمونہ، پاکیزہ کلام، عالی کردار، انتہائی خوش گفتار اور عذوبت لسان کے وصف سے متصف۔ خندہ رو، کھلے دل اور بلند حوصلے کے مالک۔ سادہ مگر صاف ستھرا لباس پہنتے۔ وعظ و تقریر میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا۔ اثنائے کلام اور دورانِ

تقریر میں اللہ اکبر کہتے تو پتا چلتا کہ یہ پاکیزہ ترین لفظ ان کے قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی فرمان کا حوالہ دیتے تو کہتے "اللہ پاک نے فرمایا"۔ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرتے۔ بسا اوقات وضو کے بعد "تحیۃ الوضو" کی دو رکعتیں پڑھتے۔ مسجد میں تشریف لے جاتے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا فرماتے۔ کوئی شخص دعا کی درخواست کرتا تو فوراً بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھاتے۔ کسی خاص آدمی کے لیے دعا کے لیے کہا جاتا تو اس کا نام پوچھتے اور پھر اس کا نام لے کر دعا فرماتے۔ عمدہ خصال اور عالی کردار بزرگ تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

11۔ کتبِ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کھانے پینے کے بعد یہ دعا پڑھی جائے۔ **الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین۔**

(سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے، جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا)

ایک حدیث میں یہ دعا بھی مروی ہے: **الحمد لله الذی اطعم وسقاو سوّغه وجعل له مخرجا۔**

یہ دعا مولانا محی الدین لکھوی کو بہت پسند تھی۔ اس کے معنے ہیں: سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے، جس نے کھلایا اور پلایا۔ اور اسے ہضم کرایا اور اس کے نکلنے کے لیے جگہ بنائی۔

12۔ مولانا عنایت اللہ امین صدر مدرس دارالحدیث (راجووال) نے مجھے شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف صاحب کے حوالے سے مولانا محی الدین لکھوی سے متعلق ایک واقعہ لکھ بھیجا ہے۔ یہ عجیب وغریب واقعہ قبل از تقسیم ملک کا ہے۔ مولانا محمد یوسف فرماتے ہیں:

"ہمارا گاؤں چک سومیاں ضلع فیروز پور میں شامل تھا۔ میرے والدین لکھوی خاندان کے مریدین میں سے تھے۔ میری والدہ نے وصیت کی تھی کہ میں فوت ہوجاؤں تو میرا جنازہ مولانا محی الدین لکھوی پڑھائیں۔ وہ فوت ہوئیں تو میں جنازہ پڑھانے کے لیے مولانا کو لانے مرکز الاسلام گیا۔ گھوڑی مولانا کی پسندیدہ سواری تھی اور ہم

دونوں گھوڑی پر سوار تھے۔ چلتے چلتے گھوڑی نے چھینک ماری تو مولانا نے فرمایا: "یرحمك اللّٰہ۔" میں نے عرض کیا: حضرت آپ کا یرحمك اللّٰہ کہنا بے محل تو نہیں؟ مولانا نے جواب دیا: اللہ کا فرمان ہے: وان من شیئی الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم یعنی ہر چیز اپنی بولی میں اللہ کی حمد بیان کرتی ہے۔ گھوڑی نے بھی چھینک کے ساتھ الحمد للہ کہا اور میں نے جواب میں یرحمك اللہ کہہ دیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کو چھینک آئے تو وہ الحمد للّٰہ کہے اور سننے والے اس کے جواب میں یرحمك اللّٰہ کہیں۔

مولانا محی الدین لکھوی کی زبان ذکر الٰہی میں مصروف رہتی تھی اور وہ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں خیال فرماتے تھے کہ ہر شے اپنے انداز میں حمد الٰہی میں مصروف ہے۔ ان کا یہ اجتہاد ارشادِ قرآن کے بالکل ہم آہنگ ہے اور بلاشبہ صحیح ہے۔ اس طرف کسی بہت بڑے متقی انسان کا دھیان ہی جا سکتا ہے، ہر عالم کو یہ بات نہیں سوجھی۔

(مذکورہ بالا واقعات قیامِ پاکستان سے قبل کے ہیں)



پندرھواں باب

مرکز الاسلام تشریف لانے والی چند شخصیات

مولانا محی الدین لکھوی کا مسکن ''مرکز الاسلام'' آبادی سے دور جنگل میں تھا، لیکن اس میں اتنی کشش تھی کہ بے شمار لوگ وہاں آتے تھے، جن میں اس دور کی بڑی بڑی علمی اور مشہور شخصیات شامل تھیں۔ اگر ان سب کا ذکر کیا جائے اور تھوڑا تھوڑا تعارف کرایا جائے تو کم سے کم دوسو صفحات اسی میں صرف ہو جائیں گے۔ میں یہاں صرف ان چند شخصیات کا ذکر کروں گا، جن کا ورود وہاں میرے زمانہ قیام میں ہوا۔

1۔ مولانا عبداللہ (ساکن کھپیاں والی):

ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر کے ایک گاؤں ''کھپیاں والی'' کے رہنے والے ایک بہت بڑے عالم مولانا عبداللہ تھے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ تھا: مولانا عبداللہ بن نور احمد بن قطب الدین بن رحمت اللہ۔ اس سلسلۂ نسب کے یہ تمام افراد علمائے دین تھے اور اس علاقے میں اپنے علم وعمل کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔

مولانا عبداللہ جن کا یہاں ذکر کرنا مقصود ہے، 1890ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگ وار مولانا نور احمد سے پائی۔ پھر لکھو کے چلے گئے۔ وہاں مولانا عبدالقادر لکھوی اور ان کے فرزندِ گرامی استاذِ پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی کی مسانید درس آراستہ تھیں۔ ان سے مروّجہ علوم وفنون کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ وہیں حضرت مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کا پتا چلا تو ان کی

خدمت میں پہنچے۔ ان سے کتبِ حدیث کا درس لیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو وزیر آباد کا قصد کیا اور حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے بابِ علم پر حاضری دی اور ان سے خوب استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے گاؤں کھپیاں والی میں ''نصرت الاسلام'' کے نام سے مدرسہ جاری فرمایا، جس میں بہت سے شائقینِ علم نے استفادہ کیا۔ وہ اس عہد کے کامیاب مدرس تھے۔ چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کے عمل اور وعظ و تبلیغ سے لوگ بہت متاثر تھے۔ ان کا کتب خانہ بھی بہت اچھا تھا، جس سے اہل علم مستفید ہوتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ جب جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی لکھ رہے تھے تو انھیں بعض کتابوں کی ضرورت پڑی جو کہیں سے نہ ملیں۔ پتا چلا کہ یہ کتابیں مولانا عبداللہ صاحب کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے بلاتوقف مطلوبہ کتابیں مبارک پور بھجوادیں جو کئی سال بعد وہاں سے واپس آئیں۔

تقسیمِ ملک کے زمانے میں وہ ایک بڑے قافلے کے ساتھ اپنے گاؤں سے پاکستان کو روانہ ہوئے۔ وہ ہیڈ سلیمان کی کی طرف سے پاکستان میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ بنگلہ فاضلکا کے قریب پہنچے تو سکھوں نے حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد تھے جو مدرسے میں ان کے ساتھ طلبا کو پڑھاتے تھے، انھیں بھی اسی وقت شہید کیا گیا۔ یہ حادثہ 24۔ اگست 1947ء کو پیش آیا۔ ہیڈ سلیمان کی وہاں سے قریب تھا۔ ان کے اہل و عیال کسی طرح پاکستان میں داخل ہو گئے۔

مولانا ممدوح کے بیٹے حافظ عبدالمنان تھے۔ انھوں نے ساہی وال میں سکونت اختیار کی اور وہاں مدرسہ جاری کیا۔ وہ 21۔ مارچ 2004ء کو فوت ہوئے۔

مولانا عبداللہ کا کتب خانہ گاؤں میں ہی رہ گیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے اس کا پتا ایک معقول قسم کے فوجی افسر کو چل گیا۔ اس نے فوری طور پر اسے اپنی تحویل میں لیا اور پھر اسے ہیڈ سلیمان کی کے راستے پاکستان پہنچا دیا۔ اس طرح یہ کتب خانہ حافظ عبدالمنان صاحب کے پاس ساہی وال پہنچ گیا اور انھوں نے اسے دارالحدیث راجووال میں مولانا محمد یوسف صاحب

کے حوالے کر دیا۔ اب یہ کتب خانہ دارالحدیث راجووال میں محفوظ ہے اور اہلِ علم اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ بہت اچھا کتب خانہ ہے۔ مجھے اس کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ اس میں بعض اکابر علمائے کرام کے خطوط بھی موجود ہیں۔

عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ مولانا عبداللہ (ساکن کھپیاں والی) مرکز الاسلام تشریف لائے تھے اور میں نے وہیں پہلی مرتبہ ان کی زیارت کی تھی۔ مرکز الاسلام میں ان کی زیادہ گفتگو مولانا محی الدین سے رہی اور وہ انھی سے ملاقات کے لیے آئے تھے۔ مولانا معین الدین مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت وہاں نہیں تھے۔

2۔ قاضی عبدالرحمٰن منصور پوری:

قاضی صاحب ممدوح حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین) کے برادرِ صغیر تھے۔ عابد وزاہد اور منکسر و متواضع عالمِ دین! فنِ ریاضی اور علم فلکیات میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ انھیں وکیل صاحب کہا جاتا تھا اور اسی عرف سے معروف تھے۔ پٹیالہ کے رہنے والے تھے اور ریاست پٹیالہ میں وکالت ایک سرکاری عہدہ تھا، جس کے معنے سفارت اور نمائندگی کے تھے۔ یعنی ریاست کی طرف سے اندرونِ ملک جس شخص کو کسی علاقے، کسی ضلعے یا کسی ریاست میں سفیر یا نمائندہ یا قونصلیٹ بنا کر بھیجا جاتا تھا، اسے وکیل کہا جاتا تھا۔

طویل عرصے تک قاضی عبدالرحمٰن منصور پوری ریاست پٹیالہ کے اس منصب پر فائز رہے اور مختلف اوقات میں انھوں نے لدھیانہ، فیروز پور، ریاست گوالیار، ریاست الور اور ریاست جے پور وغیرہ میں فرائض وکالت وسفارت سرانجام دیے۔

وہ مولانا محی الدین لکھوی کے جدِ امجد حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے مرید تھے اور انھوں نے ان کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی۔

قاضی عبدالرحمٰن منصور پوری 1946ء میں مرکز الاسلام تشریف لائے تھے اور مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین سے ملے تھے۔ میں نے ان کو پہلی اور آخری دفعہ وہیں

دیکھا۔ اس وقت میں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا۔ وہ لکھو کے بھی گئے تھے، جو ان کے مرشد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا مسکن رہا تھا اور کسی زمانے میں وہیں جا کر انھوں نے حضرت مرحوم کی بیعت کی ہوگی۔

وہ قیامِ پاکستان کے بعد 13۔نومبر 1947ء کی شب کو لاہور پہنچے۔ کچھ عرصہ بیمار رہے۔ 30۔دسمبر 1947ء کو وفات پا گئے اور کرشن نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد دریائے راوی میں سیلاب آیا اور قبرستان پانی میں ڈوب گیا۔ پانی اترا تو قبروں کے نشانات مٹ چکے تھے۔ ❶

3۔ مولانا عبداللہ اوڈ:

اوڈ ایک برادری یا گروہ کا نام ہے۔ تقسیم ملک سے قبل یہ لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں (مالیر کوٹلہ، فیروز پور، بہاول نگر، حصار، بیکانیر وغیرہ) میں رہتے تھے۔ فیروز پور کی تحصیل فاضلکا میں یہ خاصی تعداد میں آباد تھے۔ ان کے امیر مولانا عبداللہ اوڈ تھے جو فاضلکا شہر میں سکونت پذیر تھے۔ وہاں انھوں نے ایک مدرسہ بھی جاری کیا تھا۔ مولانا ممدوح 1903ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور جن مدارس میں تعلیم حاصل کی وہ ہیں جامعہ محمدیہ لکھوکے، مدرسہ غزنویہ امرتسر، مدرسہ غزنویہ منڈی صادق گنج (ضلع بہاول نگر) مدرسہ دارالکتاب والسنہ دہلی اور بعض دیگر مدارس۔۔۔! مولانا محی الدین لکھوی سے ان کا قریبی تعلق تھا اور ان سے وہ کافی متاثر تھے۔ مولانا سے ملاقات کے لیے مرکز الاسلام ان کی آمدورفت رہتی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد انھوں نے ضلع سرگودھا کے چک نمبر 20 ایم۔بی میں سکونت اختیار کی اور وہیں 28۔اکتوبر 1966ء کو وفات پائی۔ ❷

---

❶ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری ص 449 تا 452۔

❷ مولانا عبداللہ اوڈ کے حالات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب کاروان سلف ص 173 تا 182

4۔ مولانا عبدالغفار غزنوی:

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالغفار غزنوی بھی مرکز الاسلام گئے اور میں نے ان کو پہلی مرتبہ وہیں دیکھا اور آخری مرتبہ بھی۔ 1945ء کے انتخابات کا زمانہ تھا کہ مولانا عبدالرحیم کوٹلوی، مولانا عبیداللہ احرار اور مولانا عبدالغفار غزنوی مرکز الاسلام گئے۔ ان کا مقصد مولانا محی الدین لکھوی سے ملنا اور انھیں مولانا محمد داؤد غزنوی کا یہ پیغام پہنچانا تھا کہ مولانا عبدالغفار غزنوی تحصیل چونیاں سے انتخاب لڑ رہے ہیں اور اس حلقے کے لوگ آپ سے متاثر ہیں، اس لیے آپ وہاں جائیں اور مولانا عبدالغفار غزنوی کی مدد کریں۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا داؤد غزنوی کو یقین تھا کہ مولانا محمد علی لکھوی کے فرزندانِ گرامی ان کی بات مانیں گے اور مولانا عبدالغفار غزنوی کی مدد کریں گے۔ چنانچہ مولانا محی الدین لکھوی اور ان سطور کا راقم وہاں گئے۔ اور دو تین روز کے بعد واپس آ گئے۔

5۔ قاضی حبیب الرحمٰن منصور پوری

اب ایک اور شخصیت کا تذکرہ جو اکثر وہاں تشریف لاتے اور کئی کئی ہفتے اس جنگل میں گزارتے۔ ان کا تذکرہ کچھ تفصیل چاہتا ہے۔ امید ہے قارئین کرام مجھے اس کی اجازت دیں گے۔

1943ء کے ماہ جون کی کوئی تاریخ تھی کہ دوپہر ایک بجے کے قریب شور ہوا: قاضی صاحب تشریف لائے ہیں۔

مولانا محی الدین اور معین الدین دونوں بھائی جلدی سے باہر نکلے۔ میں اور چودھری غلام حسین بھی ان کے ساتھ گئے۔ دیکھا کہ گورے چٹے، تیکھے نقش ونگار کے ایک صاحب نگاہیں نیچے کیے آ رہے ہیں۔ چھوٹی موری کا سفید لٹھے کا پاجامہ اور بادامی رنگ کی ٹھنڈی شیروانی زیب تن۔ پاؤں میں جرابیں اور کالی گرگابی، سر پر پٹیا لے شاہی انداز کا سفید عمامہ، لمبی داڑھی جس کے سیاہ بال کم ہیں اور سفید زیادہ۔ دبلے پتلے، نکلتا ہوا قد اور ہونٹوں پر متانت سے بھرپور ہلکی سی مسکراہٹ۔ ساتھ ایک اور شخص ہے جو وضع قطع اور لباس سے

مزدور معلوم ہوتا ہے۔ وہ ان کا بھاری بھرکم ٹین کا بکس سر پر اٹھائے ہوئے ہے۔ سب نے نہایت ادب سے قاضی صاحب کو سلام کیا۔ وہ بھی انتہائی خندہ پیشانی سے ملے اور بغل گیر ہوئے۔ شیشم کے درخت کے سائے میں کھڑے کھڑے دو تین منٹ میں ایک دوسرے سے خیر و عافیت پوچھی اور معزز مہمان کو ہمارے کمرے میں لایا گیا۔ وہیں ان کے لیے چار پائی بچھادی گئی اور موسم کے مطابق بستر لگا دیا گیا۔ شیروانی اتاری تو بالکل دھان پان اور ہڈیوں کا ڈھانچا۔

مولانا محی الدین نے پوچھا: لسی پئیں گے یا شربت؟

بولے: پہلے تازہ پانی پلایے، پھر گرم گرم چائے کی پیالی لایے۔ سفر کی وجہ سے تکان محسوس ہو رہی ہے۔ ایک گھنٹا پہلے فیروز پور ریلوے اسٹیشن پر چائے پی تھی، اب پھر طلب ہو رہی ہے۔

جون کا مہینا، سورج سوا نیزے پر آیا ہوا۔ دوپہر آفتاب کی حدت سے تپ رہی ہے اور سر سے پاؤں تک پسینے نچڑ رہے ہیں، انتہائی تعجب ہوا کہ یہ عجیب شخص ہیں جو اس ابلتے موسم میں چائے طلب فرما رہے ہیں۔

ان کے ساتھی سے پوچھا گیا: آپ کیا پئیں گے؟

اس نے جواب دیا: لسی۔!

اس کے لیے لسی کا جگ لایا گیا۔ نمکین لسی کے دو بڑے بڑے گلاس اس نے حلق میں انڈیلے اور چلتا بنا۔ اس شخص کو سامان اٹھانے کے لیے مہمان نے جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے سٹیشن سے پکڑا تھا۔ آٹھ آنے اسے دیے گئے جو اس زمانے میں ڈیڑھ دو فرلانگ تک سامان اٹھا کر لے جانے کی بہت بڑی اجرت تھی۔

یہ مہمان گرامی تھے قاضی حبیب الرحمان منصور پوری۔ سیرت طیبہ کی شہرہ آفاق کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کے مصنف نام دار حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے اور قاضی عبدالرحمان منصور پوری وکیل کے (جن کا گزشتہ سطور میں ذکر ہوا)

فرزند ارجمند۔ یہ فیروز پور سے آنے والی ٹرین سے تشریف لائے تھے جو دن کے ساڑھے بارہ بجے وہاں پہنچتی تھی۔

قاضی صاحب ممدوح نے میٹرک تک تعلیم اپنے وطن پٹیالہ میں حاصل کی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''میں نے انٹرنس پٹیالہ میں کیا۔'' ان کا گھر دینی علوم کا گہوارہ تھا اور دینی علوم انھوں نے گھر ہی میں پڑھے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور آئے اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ یہ کالج اس عہد میں ہندوستان بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کا تعلیمی مرکز تھا اور ریلوے روڈ پر واقع تھا۔ اب بھی وہیں ہے۔ البتہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ بعد اس کا ایک حصہ ڈی اے، وی کالج (دیانند اینگلوورنیکلر کالج) میں منتقل ہوگیا تھا، جسے اب ''گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائن'' کہا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کچھ عرصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

قاضی صاحب ممدوح کا دائرہ معلومات بہت وسیع تھا۔ تفسیر، حدیث، شروح حدیث، فقہیات، خلافیات، سیرت، تاریخ، رجال، ادبیات وغیرہ ہر موضوع پر بے تکان اور روانی سے گفتگو کرتے تھے۔ قرآن وحدیث اور سیرت کے مختلف مقامات پر مستشرقین اور استشراق زدہ لوگ جو اعتراضات کرتے ہیں، اس پر ان کی اچھی نظر تھی اور جس نہج سے ان کا منھ بند کیا جاسکتا ہے، اس سے بھی وہ آگاہ تھے۔ عیسائی مشنریوں کی اسلام سے متعلق تنقیدات کا علمی اسلوب میں جواب دینا اور انہی کی کتابوں کے حوالے سے ان کی گرفت کرنا، ان کا خاص موضوع تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی اور میرے زمانہ ادارت میں اس ضمن میں ''الاعتصام'' میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ تحریر کی متانت اور معلومات کی کثرت کتاب کے بنیادی اجزاء ہیں۔ یہ کتاب میاں عبدالمجید مرحوم (سابق ناظم مالیات مرکزی جمعیت اہل حدیث) نے شائع کی تھی۔

عیسائیت سے متعلق قاضی حبیب الرحمان کی دلچسپی کا اصل باعث ان کے لائق صد احترام تایا قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم ومغفور تھے۔ اس موضوع پر سلسلہ کلام میں وہ

اکثر انھی کے حوالے دیا کرتے اور ان کا ذکر انتہائی تکریم کے لہجے میں کرتے تھے۔ وہ انھیں ''بڑے قاضی صاحب'' یا ''تایا صاحب'' کہا کرتے تھے۔ جب ان کے بارے میں بات شروع ہوجاتی تو ان کے بہت سے واقعات ان کی نوک زبان پر آجاتے اور پھر انتہائی جذباتِ محبت وعقیدت کے ساتھ مسلسل سناتے چلے جاتے۔

عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں سے وہ آگاہ تھے۔ قدیم شعراء کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے۔ بالخصوص فارسی سے کافی شغف تھا۔ غرض وہ کسی موضوع میں بند نہ تھے۔ جس مسئلے میں زبان کو حرکت دیتے، مختلف کتابوں کے حوالوں کی مدد سے پورے اعتماد سے بات کو آگے بڑھاتے چلے جاتے۔ دھیمے لہجے سے گفتگو کا آغاز کرتے اور آخر کلام تک روانی سے یہ سلسلہ جاری رہتا۔ وہ اپنی بات میں دوسرے کی مداخلت برداشت نہ کرتے تھے، نہ عام طور سے اسے بولنے کا موقع دیتے۔ اسلام کے اوامر و احکام کے بارے میں ان کے احساسات نہایت نازک تھے۔ اس کے کسی پہلو سے متعلق کوئی ادنیٰ سی تنقید اور نرم سے نرم لفظوں میں بھی کوئی اعتراض سننا انھیں گوارا نہ تھا۔

جون 1943ء میں جب وہ مرکز الاسلام تشریف لائے، مولانا محمد علی لکھوی مرحوم اس وقت مدینہ منورہ میں فروکش تھے۔ البتہ ان کے فرزندان گرامی مولانا محی الدین اور معین الدین وہیں تھے اور یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ قاضی صاحب اس سے پہلے کئی مرتبہ وہاں جا چکے اور ان کے مہمان رہ چکے تھے۔ مولانا محمد علی کی مہمان نوازی اور ان کے علم وعرفان کی وسعتوں سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کے دونوں صاحب زادوں کے اخلاق حسنہ اور عادات واطوار کا بھی ان پر بہت اثر تھا جو ان کے عالی قدر باپ کی تربیت سے ان میں منتقل ہوئے تھے۔ جس شخص کی زندگی کے کسی گوشے سے قاضی حبیب الرحمان اثر پذیر نہ ہوتے، اس کے ہاں چند ثانیوں کا قیام بھی ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ اس ضمن میں وہ انتہائی حساس تھے۔ ان کا خاص معیار انتخاب اور انسان کی پرکھ کا اپنا ہی پیمانہ تھا، جو اس پر پورا نہ اترتا، اس سے ہم کلام ہونا پسند نہ کرتے۔

انھوں نے بہت بڑا منصوبہ اپنے ذہن میں یہ بنا رکھا تھا کہ ایک مثالی یونیورسٹی قائم کی جائے گی جو ''اسلامی یونیورسٹی'' ہوگی۔ اس میں ہزاروں کی تعداد میں طلباء کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے اور انھیں ہر زبان اور ہر مضمون کی تعلیم دی جائے گی اور ان کے لیے شان دار ہوسٹل بنائے جائیں گے۔ ہر مضمون اور ہر فن کے مشہور و ماہر اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ کچھ استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے، کچھ جامعہ ملیہ دہلی سے، کچھ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے، کچھ ندوہ العلما لکھنؤ سے، کچھ دارالعلوم دیوبند سے اور کچھ ہندوستان کے مختلف مدارس اہل حدیث سے لیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ کوشش کی جائے گی کہ جامعہ ازہر (قاہرہ) اور بعض دیگر اسلامی ملکوں کے سربراہوں اور ماہرین تعلیم سے رابطہ کر کے وہاں کے ممتاز اساتذہ کی خدمات مستعار لی جائیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اساتذہ کے قیام کے لیے ان کے مقام و مرتبے کے مطابق یونیورسٹی کیمپس میں الگ الگ بنگلے تعمیر کیے جائیں گے اور اس یونیورسٹی کا ایک وائس چانسلر اور ایک چانسلر ہوگا۔

وہ نہایت سنجیدگی سے کہا کرتے تھے کہ ہماری یونیورسٹی سے ملحق کالجوں کا پورے ہندوستان میں ایک جال بچھا دیا جائے گا۔ ان کالجوں میں اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ حضرات کو پرنسپل اور پروفیسر مقرر کیا جائے گا۔ مختلف ملکوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اسی یونیورسٹی اور انہی کالجوں کے فارغ التحصیل لوگوں کو بھیجا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ یہاں سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے بہترین مبلغ اور مقرر ہو چکے ہوں گے۔

اس مجوزہ ذہنی یونیورسٹی کے قیام کے لیے رہ رہ کر ان کی نگاہ انتخاب مرکز الاسلام پر پڑتی تھی۔ ان کے خیال میں ابتدائی تعلیم کا سلسلہ وہاں جاری تھا ہی، دو مربعے زمین بھی تھی اور مزید زمین حاصل کرنے کے امکانات بھی تھے۔ بس ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں سے پروفیسروں کو بلوا کر اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا باقی تھا، اور یہ ان کے نزدیک کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اگر اس کے لیے ان سے سرمائے کی بات کی جاتی تو جواب دیتے، اتنا سرمایہ جمع کرنا کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ ملک میں بہت سے سرمایہ دار موجود ہیں۔ کام کا

منصوبہ بن جائے اور اس پر عمل شروع ہو جائے تو سرمایہ دار خود ہی سرمایہ دینے لگیں گے۔ ان کے بچے بھی تو آخر اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں گے، وہ والدین کو سرمایہ دینے پر مجبور کریں گے۔

اس یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں وہ اپنے دل میں اس درجے جذبہ صادقہ رکھتے تھے اور اس قدر بے تاب رہتے تھے کہ ہر شخص سے اس کا تذکرہ فرماتے اور صاف لفظوں میں اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے۔ اس نواح کے ایک گاؤں میں ایک شخص نور محمد ریکوال رہتے تھے، (جن کا گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے) ہم سے وہ مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔ اور بہت ملن سار تھے۔

نور محمد کی مرکز الاسلام میں کافی آمدورفت تھی۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ قاضی صاحب ان سے محو گفتگو ہیں اور یونیورسٹی کے منصوبے کا ذکر کر رہے ہیں۔ پہلے تو ان کو یونیورسٹی کا مطلب سمجھایا۔ پھر اثنائے گفتگو میں کہا کہ جب تک یونیورسٹی کے طلبا کے لیے کمرے تعمیر نہیں ہو جاتے، ہم ان کے لیے عارضی طور پر کھس کی ٹٹیاں بنا دیں گے اور ایک ایک طالب علم کو ایک ایک ٹٹی دے دیں گے (یعنی جھگی نما کمرہ۔)

قاضی صاحب اردو میں گفتگو کر رہے تھے، نور محمد ان پڑھ تھے، وہ ان سے پنجابی میں بات کرتے تھے۔ وہ ''ٹٹی'' کا مطلب بیت الخلاء سمجھے۔ بولے: قاضی صاحب! یہ کھلی جگہ ہے، چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے، یہاں ٹٹیاں بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

قاضی صاحب نے فرمایا: ٹٹیاں نہیں بنائیں گے تو طالب علم کہاں رہیں گے؟

نور محمد نے قاضی صاحب کے اس سوال کا بصورت سوال ہی جواب دیا کہ یہ جنگل ان کے لیے کافی نہیں ہے؟

پھر کہا: طالب علم ٹٹیوں میں کیسے رہیں گے؟ غلاظت میں انھیں بدبو نہ آئے گی؟ نور محمد کے اس سوالیہ جواب سے قاضی صاحب کے چہرے پر خفگی کے آثار ابھر آئے، مگر انھوں نے اپنی طبیعت کے خلاف اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے نہایت آرام سے فرمایا: بھائی نور محمد!

ان کے لیے ٹٹیاں بنانا ضروری ہے۔ اس پر ہمارا کیا خرچ ہوگا۔ ایک ایک طالب علم کے لیے ایک ایک ٹٹی بن جائے گی۔ سرکنڈا یہاں عام ہے، کاٹ کر بنا دیں گے۔

نور محمد نے مسکراتے ہوئے کہا: حضور! آپ میری بات نہیں سمجھے، میں کہتا ہوں سرکنڈا کاٹ کر جو ٹٹیاں بنائیں گے، کیوں نہ طالب علم اس کی اوٹ میں بیٹھ کر ٹٹی کر لیا کریں۔

یہ دلچسپ بحث کافی دیر جاری رہی اور ہم محظوظ ہوتے رہے۔ نہ قاضی صاحب نور محمد کی بات سمجھے، نہ نور محمد قاضی صاحب کی۔ آخر نور محمد نے ہتھیار ڈال دیے اور کہا:

میرے خیال میں تو اس جنگل میں ٹٹیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب لوگ گھروں سے نکل کر جنگل میں ٹٹیاں کرتے ہیں۔ آگے جو آپ کی مرضی۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں، ٹٹیاں ضروری ہیں تو بنا لیجیے۔ اردو میں ''ٹٹی'' سرکنڈے یا بانس سے بنائے ہوئے جھونپڑے کو کہا جاتا ہے، لیکن نور محمد کو اس کا علم نہ تھا۔

قاضی صاحب تقریباً دو مہینے وہاں رہے، لیکن افسوس کہ ان کے منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔

اس کے بعد وہ ادھر ادھر کے چکر کاٹتے ہوئے اپنے بہت ہی قریبی عزیزوں کے ایک گاؤں، بڈھیمال'' تشریف لے گئے جو علماء کا گاؤں تھا اور ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں واقع تھا۔ ان کے ننھیال کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہاں کے لوگ تحصیل جڑاں والا (ضلع فیصل آباد) کے ایک گاؤں چک نمبر 36 گ ب میں منتقل ہو گئے تھے جو ہمارے گاؤں چک نمبر 53 گ ب سے بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر ہے۔

بڈھیمال کے باشندوں سے بھی قاضی صاحب نے یونیورسٹی کا منصوبہ بیان کیا۔ وہ لوگ اچھی خاصی زمینوں کے مالک تھے اور آپس میں رشتے دار تھے۔ تمام زمین بنجر تھی اور ریت کے اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں آندھی آتی تو چلنا پھرنا اور ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آندھی کے تیز جھکڑ پیدل چلنے والے کے پاؤں زمین پر نہ جمنے دیتے اور اسے دھکیلتے چلے جاتے۔ بہر حال وہاں کے نمبردار محمد سلیمان مرحوم نے قاضی صاحب کی دیرینہ خواہش پوری کر دی اور اپنی زمین کا ایک قطعہ ان

کے حوالے کر دیا۔

اب قاضی صاحب نے اپنے اس ''یونیورسٹی کیمپس'' میں پانی کا نلکا لگوایا اور صفیں بچھا دیں، جنھیں کلاس رومز کہنا چاہیے۔ پڑھانے کے لیے دو استادوں کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ گاؤں کے سب لڑکوں اور ان پڑھوں کے نام ''یونیورسٹی'' میں باقاعدہ روزانہ حاضر ہونے اور علم حاصل کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا اور لوگ دیکھتے تھے کہ ہر لڑکا تختی ہاتھ میں پکڑے، بستہ گلے میں لٹکائے اور قمیص سے ناک صاف کرتے ہوئے یونیورسٹی کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ پورے کیمپس میں کوئی کمرہ یا مکان تعمیر نہیں کیا گیا تھا، کھلی فضا میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ وہ ''قاضی حبیب الرحمان اوپن یونیورسٹی'' تھی۔ دن بھر قاضی صاحب (یعنی وائس چانسلر یا چانسلر صاحب) وہاں رہتے اور دو عدد اساتذہ کی (جنھیں یونیورسٹی کی بولی میں پروفیسر کہنا چاہیے) اور تیس بتیس طلبا کی نگرانی کرتے۔ رات کو گاؤں تشریف لے جاتے جو آدھ فرلانگ پر تھا۔ اپنی اس کامیابی پر جو طویل جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی تھی، وہ نہایت شاداں و فرحاں تھے۔

ایک دن غروب آفتاب سے کچھ پہلے قاضی صاحب اپنی اس اوپن یونیورسٹی میں تنہا تشریف فرما تھے کہ ناگہاں اس زور کی آندھی آئی کہ ان کے لیے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ آندھی نے ان کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور جدھر کا رخ کیا، ساتھ ساتھ اڑاتی چلی گئی۔ دبلے پتلے منحنی سے آدمی تھے، اڑتے اڑتے ایک گاؤں کی (جس کا نام غالباً ''باجا'' تھا) دیوار کے ساتھ جا لگے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا کہ راستے میں کنویں یا پانی کے جوہڑ جیسا کوئی خطرناک مقام نہیں آیا، سیدھے ایک مکان کی دیوار کے ساتھ جا ٹیک لگی۔

آندھی کی شدت کو دیکھ کر بڈھیمال کے چند نوجوان قاضی صاحب کو لینے کے لیے ''یونیورسٹی'' پہنچے۔ آندھی نے صورت حال کچھ ایسی بنا دی تھی کہ اگر وہاں نلکا نہ ہوتا تو یونیورسٹی کا محل وقوع تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ نلکے کی نشانی سے یونیورسٹی کا سراغ لگایا گیا۔ دیکھا تو صفیں یعنی کلاس رومز اڑ چکے ہیں اور قاضی صاحب غائب ہیں۔ تلاش کرنے والے سخت

پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ آندھی کا زور کچھ کم ہوا تو مالک مکان باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی دیوار کے ساتھ کھڑا ہے۔ پہلے تو اسے شبہ ہوا کہ چور ہے جو آندھی سے فائدہ اٹھا کر چوری کرنا چاہتا ہے۔ پھر قریب آ کر دیکھا تو قاضی صاحب کو پہچان لیا، کیوں کہ ان کی یونیورسٹی اس کے گاؤں کے راستے میں پڑتی تھی اور وہاں سے گزرتا ہوا وہ کئی مرتبہ انھیں دیکھ چکا اور آتے جاتے متعدد بار یونیورسٹی کے نلکے سے پانی پی چکا تھا۔ اس طرح وہ اگرچہ قاضی صاحب کا نمک خور نہ تھا مگر ان کا ''آب نوش'' ضرور تھا۔ وہ ان کو اپنے گھر لے گیا، چارپائی پر بٹھایا، گردوغبار جھاڑی، کپڑے صاف کیے اور ہاتھ منھ دھلائے، پانی پلایا اور ان کے طلب کرنے پر چائے پیش کی۔ اس کے بعد ان کو ساتھ لے کر بڈھیمال کو روانہ ہوا۔ کچھ آگے بڑھے تو بڈھیمال کے چند نوجوان مل گئے جو ان کی تلاش میں نکلے تھے اور ادھر کو جا رہے تھے۔

یہاں یہ بتاتے چلیں کہ قاضی حبیب الرحمان صاحب نے اس یونیورسٹی کا نام ''جامعہ سلیمانیہ'' رکھا تھا۔ اس سے ان کی مراد تو اپنے تایا قاضی محمد سلیمان منصور پوری تھے، لیکن وہ بہ طور مزاح مسکراتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میں یہاں سید سلیمان ندوی کو بلاؤں گا تو وہ سمجھیں گے کہ ''جامعہ سلیمانیہ'' ان کی طرف منسوب ہے۔ ایک نہایت متقی بزرگ مولانا صوفی محمد سلیمان (روڑی والے) تھے جو بہت سی طبی کتابوں کے مصنف مولانا حکیم عبداللہ روڑی والے کے والد محترم تھے، انھیں وہ جامعہ سلیمانیہ میں تشریف لانے کی دعوت دیں گے تو وہ خیال فرمائیں گے کہ یونیورسٹی کا یہ نام ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے لیے زمین دینے والے محمد سلیمان نمبردار سمجھتے ہوں گے کہ اس کا انتساب ان کی طرف ہے۔

اس تاریخی آندھی کے بعد جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا، قاضی صاحب نے ''یونیورسٹی'' میں ایک چھوٹا سا کچا کمرہ تعمیر کرالیا تھا جسے ''وائس چانسلر ہاؤس'' کہنا چاہیے۔ قاضی صاحب کی چارپائی، بستر اور ضروری سامان وغیرہ اسی کمرے میں تھا۔ ایک دن قاضی صاحب نے اندر پڑی ہوئی چارپائی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے یونیورسٹی کے بعض طلبا سے فرمایا: ''چارپائی باہر نکالو''۔۔۔ چارپائی باہر نکالی گئی تو قاضی صاحب نے

”جامعہ سلیمانیہ کے ایک طالب علم کو حکم دیا کہ ”اندر سے تکیہ لاؤ۔“
وہ فوراً اندر گئے اور ایک کتاب جو قاضی صاحب کے زیر مطالعہ تھی، اٹھا لائے۔ قاضی صاحب نے فرمایا: ”میں نے تکیہ مانگا ہے“

اب سعادت مند شاگرد نے اندر جا کر کتاب رکھ دی اور اس کے بجائے ہاتھ میں چھتری پکڑی اور نہایت ادب سے قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔

قاضی صاحب نے فرمایا: ”تم نے سنا نہیں، میں نے تکیہ لانے کو کہا ہے۔“

لائق شاگرد نے پھر تعمیل ارشاد کی اور کمرے میں جا کر دیکھا کہ کونے میں قاضی صاحب کا ایک بڑا سا بکس پڑا ہے جو ان کے ضروری کاغذوں، مسودوں اور کپڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہونہار طالب علم نے اسے پورے زور سے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور قاضی صاحب کے سامنے لا رکھا۔

قاضی صاحب نے بکس دیکھا تو فرمایا: ”یہ کیا لے آئے ہو؟ بھائی! میں نے تکیہ کہا ہے جسے تم سرھانا کہتے ہو“

خدمت گزار طالب علم نے عرض کیا: ”پہلے ہی کہہ دیتے کہ سرھانا لاؤ۔ خود اتنا کھپنے اور مجھے کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔

اس سے کچھ عرصے بعد ملک آزاد ہو گیا، پاکستان معرض وجود میں آ گیا اور قاضی حبیب الرحمان کی جامعہ سلیمانیہ ختم ہو گئی۔ یوں سمجھیے کہ آزادی کی خیر میں ”شر“ کا پہلو یہ تھا کہ قاضی حبیب الرحمان کی یونیورسٹی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد قاضی حبیب الرحمان کے عزیز و اقارب اور دوست احباب مختلف مقامات میں بکھر گئے اور خود قاضی صاحب نے اپنے بعض متعلقین کے ساتھ ڈیرہ غازی خاں میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کا اصل سرمایہ ان کی کتابیں تھیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل تھیں اور اچھی خاصی تعداد میں تھیں، لیکن یہ بھی ایک جگہ نہ تھیں۔ کچھ تو ان کے آبائی وطن پٹیالہ میں رہ گئی تھیں اور کچھ مغربی پنجاب کے بعض مقامات میں پہنچ گئی تھیں۔ ایک بکس کہیں

تھا، دو کہیں اور تین کہیں۔

ڈیرہ غازی خاں میں کوئی شخص ان کا ہم ذوق نہ تھا، ویسے بھی وہ افراتفری کا دور تھا۔ ان کی اولاد ایک بیٹے اور ایک بیٹی پر مشتمل تھی۔ بیٹے کا نام قاضی رضی الرحمان اور بیٹی کا سلمہ تھا۔ رضی الرحمان ملازمت کے سلسلے میں واہ کینٹ چلے گئے تھے اور سلمہ (ریٹائرڈ) جنرل غلام عمر کی اہلیہ ہیں۔ یہ وہیں رہتی تھیں جہاں ان کے شوہر رہتے تھے۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ یہ وہی جنرل غلام عمر ہیں، جنھیں 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے مسند اقتدار پر بیٹھتے ہی چند دیگر فوجی افسروں کے ساتھ ان کے منصب سے علیحدہ کر دیا تھا۔

قاضی حبیب الرحمان منصور پوری نہایت متقی اور واقعتہً ولی اللہ تھے۔ ان کے بعض ساتھی اور دوست بتایا کرتے تھے کہ ان کے پاس ایک پیسا نہیں ہوتا تھا اور اچھے خاصے اخراجات کا منصوبہ بنا لیتے تھے اور اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے سامان فراہم کر دیتا تھا۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور ان کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلایا جائے۔ بغیر کسی نوع کے ظاہری اسباب کے اللہ تعالیٰ ان کی تمام ضرورتیں پوری کر دیتا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہنتے، کپڑوں کے کئی کئی جوڑے بکس میں رکھتے۔ عام طور پر گرم اور ٹھنڈی دو دو شیروانیاں ان کے پاس ہوتی تھیں۔ بعض غربا و مستحقین کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔۔۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنے وطن (پٹیالہ) میں ہوتے تو بالالتزام قربانی کرتے۔ تنگ دستی میں مسکینوں کی نصرت اور اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے مستحق کی اعانت ضروری سمجھتے۔ ایک نہایت عمدہ کتاب ''عشرہ مبشرہ'' تصنیف کی جو ان عالی مرتبت دس صحابہ کرامؓ کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے جن کی زندگی ہی میں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دے دی تھی۔ یہ کتاب خود ہی شائع کی۔

ایک مختصر سی کتاب جو صرف 24 صفحات پر مشتمل ہے، نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ کے بارے میں صحف انبیاء کی روشنی میں لکھی۔ اس کا نام ہے ''سیرت آنحضرت ﷺ'' یعنی ایلیا کے مصداق حقیقی کی تعیین ووضاحت (ماخوذ از صحف انبیاء مندرجہ بائبل)۔

اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی قسط یا پہلی جلد کہنا چاہیے، وہ ان حوالوں کی روشنی میں

چھوٹی چھوٹی اور کتابیں بھی لکھنا چاہتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ ایک جگہ جم کر اور بیٹھ کر کام کرنے کے عادی نہ تھے۔ چلتے پھرتے رہتے تھے اور منصوبے بنانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

ان کتابوں کے علاوہ بہت سے مسودات جو مختلف موضوعات پر مشتمل تھے، ان سطور کے راقم نے ان کے بکسوں میں دیکھے۔ ان کا خط عجیب سا تھا، لمبے لمبے لفظوں میں لکھتے تھے۔ چند جملوں بلکہ لفظوں میں صفحہ بھر جاتا تھا۔

قاضی صاحب کی دعاؤں، کوششوں اور مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ قیام پاکستان کے بعد ظہور میں آیا۔ یہاں دو اسلامی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، ایک بہاول پور میں اور ایک اسلام آباد میں۔ ان کے علاوہ خالص دینی علوم کی کئی جامعات معرض قیام میں آئیں۔ ان تمام یونیورسٹیوں اور جامعات میں طلبا کو قدیم تعلیم بھی دی جاتی ہے اور جدید بھی۔ علوم دینیہ سے بھی بہرہ ور کیا جاتا ہے اور دیگر علوم سے بھی۔!

پھر ان میں مصر اور سعودی عرب وغیرہ اسلامی ملکوں کے اساتذہ بھی تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ سعودی عرب کے اساتذہ جنھیں ''مبعوث'' کہا جاتا ہے، پاکستان کے بہت سے دینی مدارس اور جامعات میں خدمت تدریس پر مامور ہیں، ان کی تنخواہیں سعودی حکومت ادا کرتی ہے۔

آزادی برصغیر کے بعد ندوۃ العلما لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) جامعہ ملیہ دہلی اور ہندوستان کی دیگر بہت سی تعلیم گاہوں کے اساتذہ ومعلمین اور ان کے فارغ التحصیل حضرات پاکستان آئے اور انھوں نے اس ملک کی متعدد درس گاہوں میں تعلیمی خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ ان درس گاہوں سے جن حضرات نے فراغت پائی اور تکمیل نصاب کی سندیں حاصل کیں، ان میں سے کتنے ہی اہل علم مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں استاد

مقرر ہوئے اور علوم وفنون کے سلسلے کو آگے بڑھانے کا باعث بنے۔ یورپ، افریقہ، اور امریکہ وغیرہ کے بہت سے ملکوں میں اسلام کی تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ جاری ہوا۔ یعنی قاضی حبیب الرحمٰن منصور پوری نے جو خواب مرکز الاسلام میں دیکھا تھا، وہ شرمندہ تعبیر ہوا، اور جس کام کے لیے وہ عرصہ دراز تک کوشاں رہے تھے، وہ تکمیل کی منزل کو پہنچا۔ لیکن افسوس ہے، یہ سب چیزیں قاضی صاحب نہ دیکھ سکے۔

قاضی حبیب الرحمان متوکل علی اللہ، تہجد گزار، متبع سنتِ نبوی ﷺ، محبِ رسول عربی ﷺ، علما کے قدردان اور بزرگانِ دین سے والہانہ تعلق رکھنے والے تھے۔ نماز انتہائی خشوع وخضوع سے پڑھتے اور اس کے تمام ارکان نہایت اعتدال وتوازن سے ادا کرتے، اورادووظائف کے پابند تھے۔ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ حالتِ وظیفہ ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

اس عالم ہمہ اوصاف اور صوفیٔ مصفا قلب نے بڑی پاکیزہ زندگی بسر کی، زبان کو کبھی کسی کی غیبت سے آلودہ نہیں کیا۔ انھوں نے برصغیر پاک وہند کے بہت سے چھوٹے بڑے شہروں کی سیاحت کی اور اپنے دور کے کبار علماء وفضلاء سے تعلقات استوار کیے، لیکن وہ ڈیرہ غازی خاں کی مٹی میں دفن ہوئے اور غالبًا ان کے عہد کا کوئی بڑا عالم اور ممتاز فاضل ان کی میت کو کندھا دینے کی سعادت حاصل نہ کرسکا۔

4۔ جولائی 1957ء کو وہ میرے اس زمانے کے دفتر (''الاعتصام'' شیش محل روڈ لاہور) میں تشریف لائے اور مختلف موضوعات سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ دو تین دن کے بعد ڈیرہ غازی خاں چلے گئے۔ 17۔ جولائی کو ان کے صاحب زادے قاضی رضی الرحمان کا خط مجھے ملا، جس میں لکھا تھا کہ ڈیرہ غازی خاں پہنچنے کے بعد ان کو بخار ہوگیا۔ 14۔ جولائی کو بخار اتر گیا اور انھوں نے غسل صحت کیا۔ 15۔ جولائی کو ضعف قلب کے باعث پھر تکلیف ہوگئی۔ اس دن نماز ظہر کے لیے وضو نہیں کرسکے۔ تیمّم سے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(قاضی صاحب موصوف پر میں نے اپنی ایک کتاب نقوشِ عظمت رفتہ میں طویل مضمون لکھا ہے، جس میں ان کی زندگی کے متعدد واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ چند صفحات وہیں سے لیے گئے ہیں۔)

بہرکیف اس دور کے بے شمار علماء وزعماء مولانا محی الدین اور معین الدین سے ملنے مرکز الاسلام آتے اور وہاں کا ماحول دیکھ کر انتہائی مسرت کا اظہار کرتے۔ اگست 1947ء تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر مرکز الاسلام سمیت وہ تمام علاقہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ صدیوں سے قائم مدرسے ویران ہوگئے، مسجدیں اجڑ گئیں، اللہ اور رسول (ﷺ) کا نام لینے والا کوئی شخص وہاں نہ رہا۔ لکھو کے اور مرکز الاسلام کا مدرسہ جامعہ محمدیہ اوکاڑے منتقل ہوگیا۔ اس کے ناظم مولانا معین الدین ہوئے۔ مولانا محی الدین لکھوی نے دیپال پور کے قریب قلعہ تاراسنگھ کو اپنا مسکن قرار دیا اور لوگوں کی آمدورفت وہاں شروع ہوگئی۔ یہاں یہ یاد رہے کہ قلعہ تاراسنگھ کا نام مولانا نے خود ہی تبدیل کر کے "الہ آباد" رکھ لیا تھا اور اسی نام سے اپنے گاؤں کا تعارف کراتے تھے البتہ سرکاری سطح پر نام کی تبدیلی نہ ہوسکی۔



سولھواں باب

1945ء کے انتخابات

اب مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے، جسے ہم کسی قدر سیاسی دور کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا تذکرہ کرنے سے پہلے اس دور کے حالات سے آگاہ ہونا ضروری ہے آیئے چند سطور میں ان حالات سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری عالم گیر جنگ یکم ستمبر 1939ء کو شروع ہوئی تھی۔ اس وقت ہندوستان (جواب پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش پر مشتمل ہے) انگریزوں کے قبضے میں تھا اور برطانیہ کی دو سیاسی جماعتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ ایک کنزرویٹو پارٹی اور دوسری لیبر پارٹی۔ جنگ کے زمانے میں کنزرویٹو پارٹی برسرِ اقتدار تھی اور وزیرِاعظم مسٹر چرچل تھے۔ لیبر پارٹی کو حزب اختلاف کا مقام حاصل تھا۔ مسٹر چرچل ہندوستان کو آزاد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ ”مجھے اس لیے وزیرِاعظم نہیں بنایا گیا کہ ہندوستان اور دیگر برطانوی مقبوضات کو آزاد کر کے اپنے ملک کو دیوالیہ بنا دیا جائے۔“

جنگ کے زمانے میں برطانیہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کے لوگ فوج میں بھرتی ہو کر اس کی مدد کریں، لیکن ہندوستان کی سیاسی جماعتوں (کانگرس، جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار، سوشلسٹ پارٹی وغیرہ) کا بنیادی موقف یہ تھا کہ انگریزوں کی اس وقت تک فوجی مدد نہ کی جائے جب تک وہ ہندوستان کو آزاد کرنے کا اعلان نہ کریں۔ محکوم ہندوستان انگریزی حکومت کی فوجی مدد نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان جماعتوں کو انگریزی حکومت نے

خلافِ قانون قرار دے دیا، اور ان کے رہنماؤں اور بے شمار کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا۔

چھے سال بعد جولائی 1945ء میں جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے گرفتار شدہ ان رہنماؤں اور کارکنوں کو رہا کر دیا گیا، جنھیں حکومت کی مخالفت کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اب چھے سالہ جنگ کے اختتام کے بعد برطانیہ میں انتخابات ہوئے تو جنگ جیتنے والے چرچل کی کنزرویٹو پارٹی انتخابات ہار چکی تھی اور اس کی جگہ لیبر پارٹی نے زمامِ حکومت سنبھال لی تھی، جس کا وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کو منتخب کیا گیا تھا۔

برطانیہ کی نئی حکمران لیبر پارٹی نے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے آزادیٔ ہند کے مسئلے پر گفتگو شروع کی۔ اس نازک اور اہم مسئلے میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور اصل منزل تک پہنچنے کی راہ میں کئی خطرناک موڑ آئے۔ اس موقعے پر ان سیاسی بکھیڑوں کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، مختصر الفاظ میں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ بات چیت کے متعدد مرحلوں کے بعد آخر کار مسٹر اٹیلی نے ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ملک کے سیاسی رہنماؤں سے فیصلہ کن بات چیت کے لیے برطانوی کابینہ کا ایک ؎ دکنی وفد ہندوستان بھیجا جو اے وی الیگزینڈر، سر سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس پر مشتمل تھا۔ اسے کیبنٹ مشن کہا جاتا تھا۔

سیاسی لیڈروں سے طویل گفت و شنید کے بعد برطانوی حکومتِ ہند نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ اب ملک کے مختلف علاقوں کے بہت سے لوگوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ضلع فیروز پور میں مسلم لیگ کی طرف سے نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ امیدوار تھے۔ مجلس احرار نے مولانا محی الدین لکھوی سے رابطہ کیا اور انھیں انتخابات میں حصے لینے کے لیے کہا۔

انتخاب لڑنے کا فیصلہ

میں اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی سے متعلق مضمون میں

بیان کر چکا ہوں کہ لکھوی خاندان اور ممدوٹ کی نواب فیملی کے درمیان حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کے زمانے سے ذہنی کش مکش چلی آرہی تھی، جس کا ذکر پہلی دفعہ میں نے حضرت مولانا محمد علی لکھوی سے سنا تھا۔ ملک میں عام انتخابات کے زمانے میں مولانا محمد علی لکھوی مدینہ منورہ میں قیام فرما تھے۔ انھوں نے مولانا محی الدین اور معین الدین کو خط لکھا کہ نواب ممدوٹ کا مقابلہ کیا جائے، چنانچہ مولانا محی الدین نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرادیے۔ اُدھر نواب صاحب کا مقابلہ کرنے کے لیے محمد سرور بودلہ بھی یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر میدان میں اتر چکے تھے۔ وہ تحصیل فاضلکا میں بارہ دیہات کے مالک تھے اور اس علاقے کے بہت بڑے زمیندار۔ انھوں نے مرکز الاسلام کا چکر لگایا اور مولانا محی الدین سے کہا کہ وہ الیکشن نہ لڑیں، صرف انھی کو نواب ممدوٹ کا مقابلہ کرنے دیں، لیکن مولانا اس پر رضا مند نہ ہوئے۔ تحصیل فیروز پور میں نواب ممدوٹ کی جاگیر اسّی (80) دیہات پر مشتمل تھی اور وہ (غالبًا) متحدہ پنجاب کے سب سے بڑے جاگیردار تھے۔

مولانا فضل الٰہی کے کہنے سے فیصلہ بدل دیا

اس زمانے میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے سرحد پار کی جماعت مجاہدین کے ایک مشہور رہنما مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی کے وارنٹ گرفتاری جاری کر رکھے تھے۔ پولیس ان کے تعاقب میں رہتی تھی۔ مولانا ممدوح روپوش تھے اور بھیس بدل کر سفر کرتے تھے۔ وہ سیاسی طور سے مولانا ابوالکلام آزاد سے اختلاف کرتے تھے لیکن قلعہ احمد نگر سے مولانا کی رہائی کے بعد کچھ عرصہ خفیہ طور سے کلکتہ میں رہے، اور مولانا سے کئی دفعہ ملاقات کی۔ ان دنوں آزادئ ملک کے سلسلے میں سیاسی رہنماؤں کی وائسرائے ہند سے گفتگو ہورہی تھی۔ مولانا فضل الٰہی چاہتے تھے کہ مولانا آزاد ان کے بارے میں وائسرائے ہند سے بات کریں اور ان کے وارنٹ گرفتاری کا معاملہ ختم کیا جائے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اس سلسلے میں مولانا آزاد نے ان کی مدد کی تھی۔

مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی مسلم لیگ کے حامی تھے۔ بہت سے لوگوں کی طرح اس

وقت وہ بھی اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ مسلم لیگ کی کوشش سے پاکستان بن جائے گا تو اس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی اور اس خطۂ ارض میں خلافتِ راشدہ کا دور آجائے گا۔ علمائے کرام مرکز اور صوبوں کے وزیر ہوں گے، کمشنر اور ڈپٹی کمشنر بھی مولوی صاحبان ہوں گے، عدالتوں میں جج بھی انھی کو مقرر کیا جائے گا۔ ان کو جب پتا چلا کہ مولانا محمد علی لکھوی کے بیٹے مولانا محی الدین لکھوی مسلم لیگ کے نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو خفیہ طریقے سے کسی شخص کے ذریعے انھیں خط بھیجا کہ مسلم لیگ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی خواہاں ہے، اس لیے اس کے امیدوار نواب ممدوٹ کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محی الدین نے نواب صاحب سے مقابلے کا خیال ترک کر دیا۔ جس تاریخ کو امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی کی جانچ پڑتال ہونا تھی، اس تاریخ کو فیروز پور کے ڈی، سی آفس میں مولانا محی الدین یا ان کا کوئی نمائندہ پیش نہیں ہوا۔

اس سے کئی دن بعد مولانا معین الدین کی نواب ممدوٹ کے ایک شخص سے اچانک ملاقات ہوئی تو اس نے مولانا سے پوچھا کہ آپ اس دن کیوں نہیں آئے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں ایک بزرگ کا خط پہنچا تھا کہ مسلم لیگ کے امیدوار کا مقابلہ نہ کیا جائے، اس لیے ہم نہیں پہنچے۔ اس شخص نے مولانا معین الدین سے کہا کہ نواب صاحب اور ان کے رفقائے کار آپ کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آپ کے مقابلے میں ہمیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آپ نہیں آئے تو نواب صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

مولانا کے انتخابات کے میدان سے نکل جانے کے بعد محمد سرور بودلہ نے نواب صاحب کا مقابلہ کیا اور ناکام رہے۔

محمد سرور بودلہ کی مرکز الاسلام میں آمد

یہاں یہ بھی سنتے جائیے کہ محمد سرور بودلہ مرکز الاسلام مولانا محی الدین کی خدمت میں آئے تو کئی چودھری قسم کے لوگ اور نوکر چاکر ان کے ساتھ تھے۔ ایک ملازم نے پانی کا مشکیزہ کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ دوسرے کی کمر پر چمڑے کی پیٹی بندھی ہوئی تھی، جس کے تین چار خانے تھے۔ ایک

خانے میں شیشے کا گلاس تھا، ایک میں حقے کی چلم تھی، ایک خانے میں تمباکو کی تھیلی لٹک رہی تھی اور حقہ اس کے ہاتھ میں تھا، جس کی ربڑ کی لمبی سی نے تھی، جہاں سردار محمد سرور بودلہ بیٹھتے، حقے کی نے ان کی طرف کردی جاتی تاکہ وہ حقہ نوش فرمالیں۔ لیکن ازراہِ احترام وہ مرکز الاسلام کی چار دیواری کے اندر حقہ لے کر نہیں آئے۔ ان کا حقہ بردار چار دیواری کے باہر ہی رہا۔

یہ تو سردار محمد سرور بودلہ کی زمیندارانہ شان کا ایک حصہ تھا یا یوں کہیے کہ فیوڈل کلچر تھا، لیکن اس علاقے میں ذاتی طور پر وہ ایک شریف آدمی کی حیثیت سے مشہور تھے اور لوگوں کے خیرخواہ و ہمدرد گردانے جاتے تھے۔ تھانے کچہری میں لوگوں کے کام آتے تھے۔ ہر شخص کو ہر وقت مل سکتے تھے۔ مگر وہ مسلم لیگ کا دور تھا اور مسلم لیگ مسلمانوں کی اکثریت کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی، اس لیے زیادہ تر اسی کے امیدوار کامیاب ہوئے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے مسلمان امیدواروں نے بری طرح شکست کھائی۔ پورے پنجاب کے مسلمانوں میں صرف مولانا سید محمد داؤد غزنوی کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔

سردار محمد سرور بودلہ کے علاقے میں مولانا محمد علی لکھوی اور ان کے فرزندانِ گرامی مولانا محی الدین اور معین الدین کا بہت اثر تھا۔ مولانا معین الدین کم عمر تھے اور مولانا محی الدین سے لوگ متاثر تھے اور نہایت احترام سے انھیں اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دیتے اور ان کے مواعظ بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ خود سردار محمد سرور بودلہ ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے۔

نواب ممدوٹ سے لکھوی حضرات کا کوئی تعلق نہ تھا

نواب افتخار حسین پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ذاتی طور پر شریف آدمی تھے۔ ان کی جاگیر کے تمام دیہات کے لوگ لکھوی علماء سے متاثر تھے۔ بالخصوص مولانا محمد علی لکھوی اور ان کے صاحب زادوں سے عقیدت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ممدوٹ کے نواب خاندان سے نہ لکھویوں کا کوئی تعلق تھا اور نہ نواب افتخار حسین کے ان سے کسی قسم کے مراسم تھے۔ مولانا محی الدین یا مولانا معین الدین نے نواب صاحب سے کبھی ملاقات بھی نہیں کی اور نہ ان کو ان دونوں بھائیوں میں سے کسی نے کبھی دیکھا۔ نہ نواب صاحب نے ان سے کبھی ملنے

کی خواہش کی۔

مرکز الاسلام سے سات میل کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن "گورو ہر سائے" تھا۔ ایک دن کسی نے بتایا کہ کل وہاں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا ہے، جس میں نواب افتخار حسین خاں تقریر کریں گے۔ میں نے مولانا معین الدین سے کہا کہ نواب صاحب کی تقریر سننی چاہیے۔ فرمایا کیا ضرورت ہے وقت ضائع کرنے کی۔ وہ نہیں گئے، لیکن میں سائیکل پر گیا۔ ان کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو آدمی ہوں گے۔ پندرہ بیس منٹ تقریر کی اور جلسہ ختم ہو گیا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ انتخابات سے دست بردار ہونے کے بعد لکھوی خاندان نے یہ متفقہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی جماعت کے کسی شخص کو ووٹ نہیں دیں گے، چنانچہ وہ اس فیصلے پر قائم رہے اور ان میں سے کسی شخص نے کسی کو ووٹ نہیں دیا۔ میں اس زمانے میں مرکز الاسلام میں خدمت تدریس سرانجام دیتا تھا اور مجھے ذاتی طور پر ان سب باتوں کا علم ہے۔

مولانا محی الدین لکھوی مرحوم کی چھوٹی بہن محترمہ امۃ الرحمٰن اوکاڑہ میں مقیم ہیں۔ 1945ء کے انتخابات کے زمانے میں ان کی عمر سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ ان سے مولانا محی الدین لکھوی کے فرزند گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی نے اس سلسلے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ لکھوی خاندان نے کسی امیدوار کی نہ حمایت کی، نہ مخالفت کی اور نہ کسی کو ووٹ دیا۔ یہ لوگ غیر جانب دار رہے۔

محمد سرور بودلہ صاحب تقسیم ملک کے بعد

تقسیم ملک کے بعد محمد سرور بودلہ اور ان کے خاندان کے زیادہ لوگ میاں چنوں اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہو گئے تھے۔ سنا تھا کہ یہاں بودلہ صاحب کی حالت میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ داڑھی بڑھالی تھی اور اللہ کی عبادت اور ذکر و اذکار میں مشغول رہنے لگے تھے۔ میرے "الاعتصام" کے زمانۂ ادارت میں مجھے معلوم ہے کہ وہ الاعتصام کے مستقل خریدار تھے اور اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے خاندان کے اور بھی متعدد حضرات "الاعتصام" کے خریدار تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، موجودہ زمانے کے لوگوں کی نسبت

گزشتہ زمانے کے لوگ بہر حال اچھے تھے۔

اطمینان قلب کی دولت

مولانا محی الدین کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اطمینان قلب کی دولت سے بہرہ ور رہے، اگر کوئی تکلیف پہنچی تو صبر وضبط سے کام لیا اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ اللہ نے جس حالت میں رکھا، اس پر اطمینان کا اظہار کیا: قناعت ان کا شیوہ اور اطمینانِ قلب ان کے لیے اللہ کا عطیہ تھا۔

مولانا محی الدین کے حلقہ انتخاب میں

یہاں یہ بھی بتا دیں کہ جب مولانا محی الدین نے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تو میں اور مولانا معین الدین ان کے حلقۂ انتخاب میں گئے۔ سات آٹھ روز ہم نے مختلف دیہات کا چکر لگایا۔ جہاں گئے لوگوں سے اپنا مقصد بیان کیا، انھوں نے توجہ سے بات سنی اور ہر گاؤں سے تسلی بخش جواب ملا۔ لیکن پھر سارا منصوبہ ہی ختم ہو گیا۔

ان انتخابات کو 1945ء کے انتخابات بھی کہا جاتا ہے اور 1946ء کے بھی۔ 1945ء کے اس لیے کہ نومبر 1945ء میں شروع ہوئے تھے۔ 1946ء کے اس لیے کہ مارچ 1946ء میں ختم ہوئے تھے۔

مولانا فضل الٰہی کی گرفتاری اور رہائی

اب اس دور کی سیاسی تاریخ سے باخبر ہونے کے لیے مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کے بارے میں چند باتیں سنتے جایے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا وہ مسلم لیگ کے سخت حامی تھے اور قیام پاکستان کو ضروری قرار دیتے تھے۔ وہ تقریباً تیس برس سے اپنے آبائی مسکن وزیر آباد سے باہر تھے اور جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سالہا سال وہ مرکزِ مجاہدین میں رہے: ستائیس اٹھائیس برس سے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری تھے۔ وہ مرکزِ مجاہدین سے چھپ چھپا کر ہندوستان آتے اور بھیس بدل کر مختلف مقامات میں جاتے تھے۔ زیادہ تر ان کا ٹھکانا صوبہ بنگال رہا۔ 1920ء میں ان پر شاہِ برطانیہ سے جنگ کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور

کئی مقدمات میں وہ حکومت کو مطلوب تھے۔

قیامِ پاکستان کے آٹھ ماہ بعد 27۔اپریل 1948ء کو وہ اپنے آبائی وطن وزیرآباد آئے۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انگریزوں کی حکومت ختم ہوگئی ہے اور پاکستان قائم ہو گیا ہے جو خالص اسلامی ملک ہے، اب انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن وہ اپنے گھر آئے تو انھیں قتل کی دفعہ 302 کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ یہ وہ دفعہ تھی جو ان پر انگریزی حکومت نے قیامِ پاکستان سے اٹھائیس برس پہلے 1920ء میں لگائی تھی اور قیامِ پاکستان کے بعد تک قائم رہی تھی۔

ان کی گرفتاری پر بعض تنظیموں نے سخت احتجاج کیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اس زمانے میں پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے۔ انھوں نے اس کی شدید مذمت کی۔ مغربی پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ تھے۔ مولانا غزنوی ان سے ملے اور مولانا فضل الٰہی کی رہائی پر زور دیا۔ متعدد لوگوں کے اخبارات میں بیان شائع ہوئے۔ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کو تار دیئے گئے۔ بالآخر حکومت نے مولانا فضل الٰہی کو رہا کردیا۔

وہ سخت کمزور ہوگئے تھے۔ آخر بہتر (72) برس کی عمر پا کر 5۔مئی 1951ء کو اپنے آبائی وطن وزیرآباد میں انتقال کرگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں اس وقت اخبار ''الاعتصام'' سے منسلک تھا اور ان کے جنازے میں شریک تھا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت بالاکوٹ لے جائی گئی اور انھیں سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔



سترھواں باب

چند مسائل جو مولانا نے حافظ عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھے

حضرت حافظ عبداللہ روپڑی (متوفی 20۔اگست 1964ء) مشہور عالم دین تھے۔ ان کے ایک فاضل شاگرد مولانا محمد صدیق سرگودھوی نے ''فتاویٰ اہل حدیث'' کے نام سے ان کے فتاویٰ کی جمع و ترتیب کا فریضہ انجام دیا۔ یہ فتاوے دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی جلد بڑے سائز کے 730 صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور دوسری جلد 744 صفحات پر محیط ہے۔ فتاویٰ اہل حدیث کی یہ دونوں جلدیں قیامِ پاکستان کے بعد مولانا محمد صدیق کی کوشش سے معرضِ اشاعت میں آئیں۔ چند روز پیشتر میرے ذہن پر اچانک دستک ہوئی کہ مولانا محی الدین لکھوی نے مختلف اوقات میں حافظ صاحب سے تحریری صورت میں چند مسائل دریافت کیے تھے جو ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' (روپڑ) میں چھپے تھے۔ یہ قیام پاکستان سے قبل کی بات ہے۔ حضرت حافظ عبداللہ صاحب روپڑی چوں کہ سوالات وجوابات محفوظ رکھتے تھے، ممکن ہے مولانا محی الدین کے سوالات اوران

کے جوابات بھی محفوظ ہوں اور ''فتاویٰ اہل حدیث'' میں چھپ گئے ہوں۔ چنانچہ میں نے اس فتاویٰ کی دونوں جلدیں حاصل کیں اور انھیں شروع سے آخر تک دیکھا تو بحمد اللہ میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ پہلی جلد میں مولانا کا ایک سوال اور اس کا جواب درج ہے اور دوسری جلد میں چھے سوالات اور ان کے جوابات مرقوم ہیں۔ مولانا محی الدین لکھوی کی تاریخ کا یہ ایک اہم حصہ ہے۔ یہ سوالات و جوابات ایک مستقل باب کے تحت ذیل میں درج کیے جارہے ہیں تاکہ اس کتاب میں محفوظ ہوجائیں۔

(فتاویٰ کی دوسری جلد میں بعض مقامات پر لکھوی کے بجائے ''لکھنوی'' کمپوز ہوگیا ہے۔)

سوال نمبر 1: حدیث من قال لا الہ الا اللہ کے کیا معنی ہیں؟ کلمہ گو بے نماز، بے زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

محی الدین بن محمد علی لکھوی

جواب: جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ بے شک جنت میں داخل ہوگا۔ مگر مراد اس سے یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ اس کا آخری کلام ہو مثلاً مرنے کے وقت اس کی زبان پر لا الہ الا اللہ جاری ہو۔ اس کے بعد اس نے کوئی کلام نہ کیا اور لا الہ الا اللہ پر خاتمہ ہوگیا۔ وہ ضرور کسی نہ کسی وقت جنت میں جائے گا۔ کیوں کہ اس وقت لا الہ الا اللہ پڑھنا یا تو نئے سرے سے ایمان لانا ہے یا پہلے ایمان کو تازہ کرنا ہے۔ پس دونوں صورتوں میں دنیا سے بہتر حالت پر رخصت ہوا۔

جو لوگ بے نماز اور بے زکوٰۃ ہیں اور ان کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی ترغیب دی جاتی ہے لیکن وہ اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پروا نہیں کرتے ان سے قطع تعلق ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بنی اسرائیل نافرمانیوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو روکا۔ لیکن وہ

باز نہ آئے تو علماء نے ان سے قطع تعلق نہ کیا بلکہ بدستور ان کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے کھاتے پیتے رہے۔ پس خدا نے سب کے دلوں کو یکساں بنا کر داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کردی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، پہلے رسول اللہ ﷺ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ پھر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا خدا کی قسم یا تو تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑو گے اور اس کو حق پر روکو گے اور ظلم سے بند کرو گے ورنہ خدا تمھارے دل بھی یکساں بنا کر انھی کی طرح تمھیں لعنتی کرے گا۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

18۔ شعبان 1359ھ مطابق 21۔ ستمبر 1940ء [1]

سوال نمبر 2: حکومت وقت کو زمین کا لگان ادا کرنا

کیا حکومتِ وقت کو زمینوں کا لگان ادا کرنا جزیہ کی قسم سے ہے جس کے برداشت کرنے سے مسلمان کو ممانعت ہے؟

محی الدین لکھوی

جواب زمین کا لگان حکومت وقت کو ادا کرنا مجبوراً جائز ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے ایک دفعہ سخت فاقہ پہنچا۔ میں محنت مزدوری کے لیے عالی مدینہ کی طرف گھر سے نکلا۔ ایک عورت نے مٹی کے ڈلے جمع کیے ہوئے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ وہ انھیں بھگونا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے ایک ڈول کے عوض ایک کھجور پر فیصلہ کر لیا۔ میں نے سولہ ڈول کھینچے۔ یہاں تک کہ میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے، میں اس کے پاس آیا۔ اس نے مجھے سولہ کھجوریں گن کر دیں۔ میں رسول ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو خبر دی۔ آپ نے بھی وہ کھجوریں میرے ساتھ کھائیں۔ اس حدیث میں جس عورت کا ذکر ہے بظاہر وہ یہودیہ ہے ورنہ مسلمہ عورت حضرت علیؓ پر ایسی تنگی نہیں کرسکتی تھی۔ نیز اور روائتیں اس کی موید ہیں۔

[1] فتاویٰ اہل حدیث جلد اول صفحہ 129

چنانچہ ابنِ ماجہ میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو فاقہ پہنچا۔ حضرت علیؓ کو خبر ہوئی۔ آپ اسی وقت محنت مزدوری کی تلاش میں نکلے تاکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے طعام حاصل کریں۔ ایک یہودی کے باغ میں آئے، سترہ (17) ڈول بہ حساب فی ڈول فی کھجور نکالے۔ یہودی نے عمدہ کھجوریں عجوہ قسم کی حضرت علیؓ کو چن دیں۔ حضرت علیؓ نبی ﷺ کے پاس آئے۔ حضرت علیؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ ایک کھجور کے عوض ایک ڈول نکالنا اور عمدہ کھجور کی شرط کرنا۔ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! آپ ﷺ کا رنگ متغیر کیوں ہے؟ فرمایا بھوک سے متغیر ہے۔ انصاری اپنے گھر آیا۔ وہاں کچھ نہیں ملا۔ پس مزدوری کی تلاش میں نکلا۔ ایک یہودی کو دیکھا جو اپنی کھجوروں کو پانی پلا رہا تھا۔ کہا میں پانی پلا دوں؟ اس نے کہا ہاں۔ کہا ایک ڈول کے عوض ایک کھجور۔ انصاری نے شرط کی کہ کھری ہو۔ قریباً دو صاع کے عوض پانی پلایا۔ پس رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا۔ اس قسم کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت وقت کو لگان دینے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ کفار کی مزدوری سے لگان ادا کرنا بہتر حالت ہے۔ اور اس میں مزدوری کی نسبت عزت ہے۔ رہا جو خراج مسلمان بادشاہ کفار سے لیتا ہے تو وہ اس لگان کی قسم کا نہیں۔ کیوں کہ وہ خراج مذہبی امتیاز کی بنا پر لیا جاتا ہے اور اس سے مقصود کفار کی تحقیر ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ حتىٰ يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون اور حدیث نزع صغار كافر من عنقه سے معلوم ہوتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ کفار اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ ذلیل ہوں اور اس حدیث میں مسلمان کو کافر کی گردن سے اس خراج کی ذلت کو نکالنے کی ممانعت فرمائی ہے یعنی اس خراجی زمین کو خرید کر کافر کی ذلت اپنے گلے میں نہ ڈالے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی [1]

سوال نمبر 3: لا هجرة بعد الفتح

کیا فتح مکہ کے بعد بھی ہجرت کا حکم باقی ہے؟ محی الدین لکھوی

[1] فتاویٰ اہل حدیث جلد دوم ص 348

جواب: ایک حدیث میں ہے **لا هجرة بعد الفتح** یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں۔ دوسری حدیث میں ہے **لا تنقطع الهجرة** یعنی ہجرت کا سلسلہ ہمیشہ جاری ہے۔ ان ہر دو احادیث میں موافقت کس طرح سے ہے۔

(الف) دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت باقی ہے۔

(ب) فرضیتِ ہجرت فتحِ مکہ کے بعد منسوخ ہے۔ استحباب باقی ہے۔

(ج) مکہ سے مدینہ کی طرف منسوخ ہے۔ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہے۔

(د) فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت جس میں اپنے وطن کی طرف بغیر اذن کے رجوع کی نیت نہ ہو ایسی ہجرت منسوخ ہے اور جو اس طرح نہ ہو وہ باقی ہے اور عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں جو اسماعیل نے روایت کی ہے یہ لفظ ہیں کہ فتحِ مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت نہیں اور ویسے ہجرت باقی ہے جب تک جہاد ہوتا رہے۔ یعنی جب تک دنیا میں دارالکفر ہے اور انسان کو اس میں رہنے سے اپنے دین کا خطرہ ہے تو اس جگہ سے ہجرت ضروری ہے۔ اگر دارالکفر نہ رہے جیسے امام مہدی کے وقت ہوگا، تو پھر ہجرت نہیں اور (محدث) ابن تین کہتے ہیں کہ ہجرت مکہ سے مدینہ کی طرف واجب تھی۔ اور جو رسول اللہ ﷺ کے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد مکہ میں بغیر عذر کے اقامت کرے وہ کافر ہو گیا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں ابن تین کا یہ مطلق کہنا ٹھیک نہیں بلکہ فتح مکہ تک مقید کرنا چاہیے۔ کیوں کہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں اقامت کی اجازت تھی۔ ابن عربی کہتے ہیں ہجرت دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف نکلنے کا نام ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں فرض تھی اور اب بھی جس شخص کو اپنی جان کے خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہو اس پر ہجرت فرض ہے اور جو ہجرت منسوخ ہوگئی وہ مطلق کسی جگہ کی طرف ہجرت ہے۔ صاحب البحر کہتے ہیں۔ [1]

[1] کتاب کا پورا نام البحر الذاخر ہے اور فقہِ زیدیہ کی کتاب ہے۔

دارالکفر جہاں کسی قسم کے گناہ فعل یا ترک میں پھنسنے کا خطرہ ہو اس سے ہجرت کرنا اجماعاً واجب ہے۔ اگر امام ہجرت کا مطالبہ کرے تو بھی اجماعاً واجب ہے اور جعفر بن مبشر اور بعض ہادویہ دارالکفر پر قیاس کرتے ہوئے دارالفسق سے بھی وجوب ہجرت کے قائل ہیں مگر یہ قیاس مع الفارق ہے جو جائز نہیں کیوں کہ دارالفسق دارالاسلام ہے، پس اس کو دارالکفر پر قیاس کرنا نقلاً عقلاً کسی طرح صحیح نہیں۔ ❶

عبداللہ امرتسری روپڑی

سوال نمبر 4: ہندوستان میں اقامت

کیا ہندوستان میں رہنا جائز ہے؟

جواب: ہندوستان میں اقامت جائز ہے چنانچہ حبشہ کی طرف ہجرت کی رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی تھی جو عیسائی حکومت تھی۔ ❷

عبداللہ امرتسری روپڑی

سوال نمبر 5: مجرموں سے جنگ (من رای منکم منکرًا)

کیا مجرموں سے جنگ جائز ہے؟

محی الدین لکھوی

جواب: حسبِ طاقت برائی کی روک تھام ضروری ہے چنانچہ حدیث "من رای منکم منکرا" سے واضح ہوتا ہے۔ ہاں جس قوم سے معاہدہ یا مصالحت ہو ان کے ساتھ حسبِ شرائط برتاؤ ہوگا، اور شرائط کے خلاف سختی جائز نہیں ہوگی۔ ❸

عبداللہ امرتسری روپڑی

❶ فتاویٰ اہل حدیث جلد دوم ص 704

❷ ایضاً

❸ ایضاً

سوال نمبر 6: تبلیغ کی حد

تبلیغ کس حد تک ہونی چاہیے؟

جواب: تبلیغ کی حد استطاعت ہے جتنی طاقت ہو کرے۔ جن قوموں کو دعوت پہنچ چکی ہے ان کو تبلیغ ضروری نہیں۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کئی قوموں پر شب خونی کرتے اور اس وقت تبلیغ نہ کرتے۔ [1]

عبداللہ امرتسری

سوال نمبر 7: اسلامی جنگ مدافعانہ ہے یا جارحانہ

کیا اسلامی جنگ مدافعانہ ہے یا جارحانہ؟

محی الدین لکھوی

جواب: اسلامی جہاد دفاع کے لیے ہے نہ کہ جارحانہ۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے جب مسلمانوں کو لڑائی کا حکم دیا تو ان الفاظ سے دیا۔ **اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا**۔ یعنی جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے ان کو لڑائی کا اذن دیا جاتا ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو لڑائی کا اذن دینے کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لڑائی کیے جاتے ہیں، یعنی کافروں کی طرف سے لڑائی کی ابتدا ہوئی ہے۔ دوم یہ کہ وہ مظلوم ہیں، یعنی کافر ناحق ان کو ستاتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اسلامی جنگ کی اصل غرض مدافعت ہے نہ کہ اور۔ اور دوسری آیت میں ہے کہ اگر تو کسی قوم کی عہد شکنی سے ڈرے تو ان کی طرف برابری کے ساتھ ڈال دے یعنی اطلاع دے دے کہ ہمارا تم سے کوئی عہد نہیں تا کہ دونوں شریک یکساں مطلع ہو جائیں۔

اس آیتِ کریمہ سے بھی معلوم ہوا کہ اسلامی جنگ، جارحانہ نہیں، بلکہ جب کسی قوم کی

[1] فتاوی اہل حدیث جلد دوم صفحہ 705

طرف سے خطرہ ہوتا ہے تو مسلمان بھی جنگ کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس طرح ایک اور آیت میں ہے۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی الله انه هو السمیع العلیم کہ اگر دشمن صلح کے لیے جھکے تو تو بھی جھک جا۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اسلام صلح پسند مذہب ہے خواہ مخواہ جنگ چھیڑنا اس کی شان نہیں۔ اگر جارحانہ طریق اختیار کرتا تو یہ ہدایتیں اس میں نہ ہوتیں۔ [1]

عبداللہ امرتسری روپڑی

یہ وہ چند مسائل ہیں جو مولانا محی الدین لکھوی نے حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے دریافت فرمائے۔ سوال نمبر 1 جو "فتاوی اہل حدیث" کی پہلی جلد کے صفحہ 129 پر مرقوم ہے، قیامِ پاکستان سے سات سال قبل ستمبر 1940ء میں دریافت فرمایا گیا۔ اس کے بعد چھے سوال جو دوسری جلد میں مرقوم ہیں، کب دریافت کیے گئے، اس کا پتا نہیں چل سکا۔ ممکن ہے وہ بھی قیامِ پاکستان سے پہلے کے ہوں۔

---

[1] فتاوی اہل حدیث جلد دوم صفحہ 706

اٹھارھواں باب

ہندوستان سے روانگی اور پاکستان میں ورود

مولانا محی الدین لکھوی کے تذکرے میں ہم مختلف موڑ کاٹتے ہوئے اگست 1947ء تک پہنچ گئے ہیں۔ آئندہ سطور میں دیکھیں گے کہ آزادیٔ برصغیر اور قیام پاکستان کے اعلان کے بعد وہ اپنے اہل وعیال اور خاندان کے ساتھ اپنے قدیم مسکن لکھوکے (ضلع فیروزپور مشرقی پنجاب) اور اپنے والد مکرم کے قائم کردہ ''مرکز الاسلام'' سے جو لکھوکے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا، کیسے نکلے اور کس طرح پاکستان پہنچے۔

1997ء میں مولانا محی الدین کو میں نے خط لکھا کہ میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس میں آپ کے والد مکرم مولانا محمد علی لکھوی، مولانا معین الدین لکھوی اور آپ کے حالات بیان کرنا مقصود ہے، آپ یہ فرمایے کہ اگست 1947ء میں اعلان آزادی کے بعد کس طرح مرکز الاسلام سے نکل کر پاکستان میں داخل ہوئے؟ یہ بات میں نے اس لیے پوچھی تھی کہ وہ لکھوکے سے کچھ فاصلے پر جنگل میں رہتے تھے اور ان کے قریب سکھوں کے دو گاؤں تھے، ایک گاؤں کا نام جھوک ٹہل سنگھ تھا اور ایک اور گاؤں تھا، جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ان دونوں گاؤں میں اکالی سکھوں کی اکثریت تھی جو مسلمانوں کے سخت مخالف تھے، اور مولانا محمد علی لکھوی کے خاندان سے بھی کدورت رکھتے تھے۔ لیکن یہ بھی عجیب معاملہ تھا کہ مخالفت کے باوجود دم کرانے اور تعویذ لینے کے لیے خود ان کی اور ان کی خواتین کی مرکز الاسلام میں آمدورفت رہتی تھی اور وہ مولانا اور ان کے گھرانے کو احترام کا مستحق گردانتے تھے، مگر اس

وقت حالات اس درجہ خطرناک صورت اختیار کر گئے تھے کہ لوگوں نے احترام کے رشتوں کو پامال کر ڈالا تھا اور کسی گروہ پر کسی کو کوئی اعتماد نہیں رہا تھا۔

میرے خط کے جواب میں مولانا نے اپنے صاحب زادۂ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے ذریعے ایک تفصیلی تحریر بھیجی۔ ذیل میں ان کی وہ پوری تحریر درج کی جا رہی ہے۔ اس میں ان کے مرکز الاسلام سے نکلنے، لکھو کے پہنچنے اور وہاں سے اپنے خاندان کے ساتھ روانگی اور پاکستان میں ورود کی تمام تفصیل آ گئی ہے۔ یہ تحریر درد ناک بھی ہے، دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔! آیے دیکھتے ہیں مولانا ممدوح کب مرکز الاسلام سے نکلے، کس وقت اپنے خاندان کے ساتھ لکھو کے سے روانہ ہوئے، کہاں رات گزاری اور کس طرح گزاری۔ کس طرح پاکستان میں داخل ہوئے اور کہاں کہاں ان کا قیام رہا۔ ذیل میں ان کی تحریر ملاحظہ فرمایے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''تقسیمِ ہند کے دنوں میں عام طور پر خطرے کا سماں رہتا تھا۔ راتوں کو اکثر و بیشتر کسی نہ کسی طرف سے شور اٹھتا جو خطرے، بدامنی اور لوٹ مار کی علامت تھا۔ ہم ان دنوں مرکز الاسلام میں تھے۔ مرکز کے لیے بظاہر الحمدللہ کوئی خطرے کی بات نہیں تھی، جس کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ ایک بڑی چار دیواری کے اندر مدرسہ اور رہائشی مکانات تھے۔ اردگرد کے لوگوں کے دلوں میں مرکز کا رعب تھا کہ پتا نہیں اس کے اندر کیا ہے؟ بہر حال انہی دنوں ایک رات بہت بڑی سرچ لائٹ مرکز پر پڑی جو فیروز پور کی جانب سے آ رہی تھی اور دور دور تک (کئی دیہات تک) پھیلی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک یہ روشنی رہی (15 منٹ سے آدھ گھنٹے تک) یہ روشنی مرکز پر پڑتی دیکھ کر قریبی گاؤں ''دلارام'' کے لوگوں نے سمجھا کہ مرکز کے لیے شاید کوئی خطرہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سکھوں نے حملہ کر دیا ہو۔۔۔ اس تشویش کی وجہ سے دلارام کے کچھ دوست جن کی تعداد آٹھ دس ہوگی، مسلح ہو کر رات ہی کو مرکز آئے تا کہ خیریت کا پتا کیا

جا سکے۔ یہاں ہر طرح سے خیریت پا کر وہ اطمینان سے واپس لوٹ گئے۔

''ان دنوں مولانا معین الدین صاحب کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ میں مردوں میں وہاں اکیلا ہی تھا۔ مدرسے کے طلبا بھی عید اور رمضان کی چھٹیوں پر تھے۔

''سرچ لائٹ والی رات کے اگلے دن تقریباً دوپہر کے وقت حافظ شفیق الرحمٰن چند آدمیوں کے ساتھ ''لکھو کے'' گاؤں سے آئے، انھوں نے کہا کہ سارا گاؤں کوچ کی تیاری کر چکا ہے۔ آپ بھی آجائیں تاکہ جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے۔ ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ مویشی آگے لگا لیے۔ نوکر جو مویشیوں کے لیے رکھا تھا، فرار ہو گیا تھا۔ لہٰذا مویشی خود ہی ہانکنا پڑے۔

''جب ہم لکھو کے پہنچے تو گاؤں کے ہمارے خاندان کے تمام لوگ گاؤں سے باہر نکل کر چلنے کے لیے تیار تھے۔ گاؤں کے رہنے والے ڈوگر بھی نکلے لیکن ان کا ہمیں کچھ پتا نہیں کہ کس طرف گئے۔ ابھی ہم نے سفر شروع نہیں کیا تھا کہ جیپوں پر ہندو اور سکھ فوجی ادھر سے گزرے۔ انھوں نے ہوائی فائرنگ کر دی جس سے لوگ ڈر کر گھروں میں گھس گئے۔ ہمارے مویشی بھی بدک گئے۔ جیپیں فائرنگ کرتی ہوئی آگے نکل گئیں۔۔۔ شاید ان کا مقصد صرف ڈرانا دھمکانا تھا۔

''فائرنگ سے جب تھوڑی سی افراتفری پھیلی تو اس دوران ایک اونٹ کے بدکنے سے اس پر بندھی ہوئی ہمارے قیمتی کپڑوں اور زیورات کی ایک گٹھڑی گر گئی، جس کا فوری طور پر ہمیں پتا نہ چل سکا۔ بریف کیسوں کی بجائے چھوٹا موٹا جتنا سامان ساتھ لے سکتے تھے، گٹھڑیوں میں باندھا گیا تھا، گٹھڑیوں میں اس لیے باندھا کہ راستے میں لوٹ مار کا خطرہ کم سے کم ہو، اس طرح غریب سمجھ کر چھوڑ دیے جانے کے امکانات زیادہ تھے۔۔۔ مذکورہ گٹھڑی جو گر گئی تھی ایک آدھ دن کے سفر کے بعد جب اس کا خیال آیا تو بہت تلاش کے بعد بھی نہ ملی۔ مولانا معین الدین کی شادی کو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا، شادی والے قیمتی کپڑے اور تمام

زیورات اسی ایک گٹھڑی میں تھے۔ فوری طور پر تو اس کا کوئی سراغ نہ ملا، لیکن پاکستان آجانے کے بعد سراغ تو مل گیا مگر گٹھڑی اور اس کی قیمتی اشیا واپس نہ مل سکیں۔

''تقریباً عصر کے وقت ہم نے گاؤں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ دریائے ستلج کی طرف جانے کی بجائے ہم کھائی پھیمیکی کی طرف گئے۔ کیوں کہ دریا کی طرف ماہتم (سکھ) رہتے تھے، ان سے خطرہ تھا۔

''جب ہم مرکز الاسلام سے چلے تھے تو عین چلتے وقت جھوک ٹہل سنگھ کا رہنے والا ایک آدمی جو مسلمان تھا، مرکز کے آس پاس پھرتا دکھائی دیا۔ پتا چلا کہ اس کو سکھوں نے جاسوسی کے لیے بھیجا ہے۔ پہلے تو ہم نے اس کو مار دینے کا خیال کیا لیکن پھر یہ ارادہ ترک کر دیا اور اسی حال میں اسے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

''سفر کی پہلی رات ہم نے کھائی پھیمیکی کے سکول میں بسر کی۔ اندھیری اور پُر خطر رات۔ خالی گاؤں ایک عجب منظر پیش کر رہا تھا۔ گاؤں میں صرف عیسائی موجود تھے۔ اس رات ہماری ایک خوب صورت نوعمر بھینس گم ہوگئی۔ کوئی پتا نہیں چل سکا کہ چوری ہوئی یا کیا ہوا۔ بہرحال صبح فجر کی نماز پڑھ کر پھر چل پڑے۔ ہیڈ گنڈا سنگھ آپہنچے۔ ہیڈ پر بہت زیادہ رش تھا، اوپر سے گرمی کا موسم۔ بڑے انتظار اور تکلیف کے بعد ہم ہیڈ کے پل سے دریا کراس کرنے میں کامیاب ہوئے۔

''ہیڈ گنڈا سنگھ سے چند میل آگے ایک گاؤں ''کجیاں والا'' تھا، وہاں رات بسر کی۔ اس گاؤں کے اکثر لوگ اہل حدیث تھے۔ ہم میں سے کچھ لوگ مسجد میں اور کچھ لوگوں کے گھروں میں رہے۔ گاؤں والوں نے دیگ پکا کر ہمیں چاول کھلائے۔ اگلے روز پھر چل پڑے اور گاؤں ''بازید پور'' پہنچ کر رات کو قیام کیا۔ اس گاؤں میں بھی اہل حدیث حضرات کی اکثریت تھی۔ گاؤں والوں نے ہمیں ایک حویلی خالی کرا کے دے دی۔ اس گاؤں میں ہم ایک ہفتہ رہے۔ کھانے کا اہتمام گاؤں والے ہی کرتے رہے۔ بازید پور سے ڈھنگ شاہ

آ گئے۔ یہاں مولانا معین الدین صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ان کا خیال تھا کہ ڈھنگ شاہ میں ہی مستقل رہا جائے۔ یہ لکھوی حضرات کا قدیم مسکن تھا۔ بہر حال کافی دن کوئی مہینا بھر ہم وہاں رہے۔

''پھر وہاں سے ''بھاگیوال'' اور بھاگیوال سے ہمارا یہ قافلہ ضلع اوکاڑہ کے ایک گاؤں چک نمبر 11 بدھے والا پہنچ کر قیام پذیر ہوا۔ میں ''کھرل کلاں'' میں رک گیا تھا۔ یہ گاؤں ضلع اوکاڑہ اور ضلع قصور کی حد پر واقع ہے۔ گاؤں سے تقریباً تین کلومیٹر دور ہماری زمین ہے جو والد محترم نے تقسیم ہند سے پہلے خرید رکھی تھی۔ میں نے اپنی زمین پر رہائش اختیار کر لی اور مستقل طور سے وہیں رہنے کا ارادہ کیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد لنک نہر ٹوٹ جانے کی وجہ سے علاقے میں سیلاب آ گیا اور مجھے وہاں سے بچوں کو لے کر راتوں رات نکلنا پڑا۔ اس کے بعد دوبارہ وہاں رہائش اختیار نہ کی جاسکی۔ (ہندوستان) لکھوکی سے لے کر پاکستان ضلع اوکاڑہ تک راستے میں کسی سے کہیں کوئی تصادم نہیں ہوا۔''

مولانا کی تحریر ختم ہوئی۔

اب مولانا محی الدین اپنے خاندان سمیت پاکستان آ گئے ہیں اور ان کا تعلق مرکز الاسلام اور ہندوستان سے منقطع ہو گیا ہے۔ آئندہ صفحات میں ان کے وہ کوائف بیان کیے جائیں گے جو پاکستان میں پیش آئے۔

یہ نہایت دردناک وقت تھا۔ لوگوں پر اچانک مصیبت آ پڑی تھی۔ صدیوں سے اپنی اپنی جگہ جمے ہوئے لوگ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ مختلف قسم کے سامان سے بھرے ہوئے گھر کھلے چھوڑ دیے گئے۔ مسجدیں ویران ہو گئیں، مدرسے اجڑ گئے، دینی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ نہ قرآن محفوظ رہا، نہ حدیث کی کوئی کتاب محفوظ رہی۔ سب کچھ غیر مسلموں کے قبضے میں آیا اور انھوں نے اسے گلیوں میں پھینکا اور گندی نالیوں میں بہا دیا۔ یہ بہت بڑا سانحہ تھا، جس سے مسلمان دوچار ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے زمانے تک لکھوکی کے مدرسے

کے اجراء پر تقریباً ڈھائی سو سال کی طویل مدت بیت چکی تھی اور اس میں ہزاروں لوگوں نے تعلیم حاصل کی تھی، اب یہ مدرسہ ختم ہو گیا تھا اور اسے جاری کرنے والے بزرگوں کے اخلاف کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی نے اپنے ترکِ وطن کا جس انداز میں تذکرہ کیا ہے، وہ بے حد الم ناک ہے۔ وہ پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ یہاں آ کر انھوں نے کس اسلوب سے زندگی بسر کی اور کس نہج سے اسلام کی تبلیغ کو اپنا مقصدِ حیات ٹھہرایا۔



انیسواں باب

پاکستان میں قیام اور سلسلۂ وعظ وارشاد

کتاب کے گزشتہ باب میں مولانا محی الدین لکھوی کے ہندوستان سے روانگی اور پاکستان میں ورود کی ضروری تفصیل خود انہی کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ یہاں وہ مختلف مقامات میں قیام کرتے ہوئے ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپال پور کے قریب ایک گاؤں "قلعہ تارا سنگھ" میں اقامت گزیں ہوئے۔ ہم لوگوں نے ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا کے قریب ایک گاؤں چک نمبر 53 گ ب منصور پور کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اس گاؤں کو ڈھیسیاں بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے تھوڑے دن بعد میں مولانا معین الدین سے ملاقات کے لیے اوکاڑہ گیا اور پھر ان کے بتانے پر ایک دن قلعہ تارا سنگھ کو روانہ ہوا۔ مولانا معین الدین کی نشان دہی کے مطابق میں دیپال پور سے تقریباً ایک میل ورے پانی کے ایک "سوئے" پر بس سے اترا اور سوئے کی پٹری پر دائیں جانب کو چلنے لگا۔ اس سے تھوڑی دور آگے ایک پگ ڈنڈی پر ہولیا اور چند منٹ کے بعد موضع قلعہ تارا سنگھ میں مولانا محی الدین لکھوی کی خدمت میں جا حاضری دی۔

یہ ان کی خدمت میں میرا اچانک ورود تھا اور پاکستان آنے کے بعد ان سے پہلی ملاقات تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے۔ وہاں لکھوی حضرات کے اور بھی چند گھرانے موجود تھے، جن سے میرا پہلے سے تعارف تھا۔ ان میں ایک حکیم احمد علی اور ایک مولوی احمد حسن تھے۔ حکیم احمد علی بڑے لطیفہ باز اور خوش گفتار تھے۔ ایک شخص وہاں اور رہتے تھے، ان کا نام تو مجھے یاد نہیں رہا، انھیں شاہ صاحب کہا جاتا تھا۔ وہ مولانا محی الدین

لکھوی کے عقیدت مند تھے۔

مولانا نے مجھے فرمایا اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔ اب یہیں رہو۔ اگر اپنے افراد خانہ کو یہاں لا سکتے ہو تو لے آؤ۔ اگر وہ نہیں آنا چاہتے تو تم اپنا یہیں ٹھکانا بنا لو۔ تمھارے نام زمین الاٹ ہو جائے گی اور پھر یہاں ہم مرکز الاسلام کی طرح دارالعلوم جاری کریں گے اور اسی قسم کا ماحول بنانے کی کوشش کی جائے گی اور اس کوشش میں اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا فرمائے گا۔ شاہ صاحب سے بھی انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ اس وقت پٹواری وہیں تھا۔ غالباً پٹوار خانہ پہلے سے اسی گاؤں میں تھا۔ دوسرے تیسرے دن واقعی میرے نام کچھ زمین الاٹ کرادی گئی اور اس کی حد بندی بھی کردی گئی۔ لیکن میرے حالات کچھ ایسے تھے کہ اس وقت میرا مستقل طور سے وہاں رہنا مشکل تھا۔ پانچ چھے دن ان کے پاس رہا۔ پھر اوکاڑے آ گیا اور اوکاڑے سے اپنے گاؤں چلا گیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد اکتوبر 1948ء میں لاہور آ گیا اور یہاں قلم و قرطاس سے رابطہ پیدا ہوا تو پھر مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کر لی۔

مولانا محی الدین لکھوی نے قلعہ تارا سنگھ کا نام پہلے مرکز الاسلام رکھا۔ پھر اسے ''الہ آباد'' کہا جانے لگا اور یہی مشہور ہو گیا۔ وہ چوں کہ خالص علمی خاندان کے فرد تھے اور ان کے تمام آباواجداد کی زندگی صالحیت کی حسین فضاؤں میں بسر ہوئی تھی اور خود مولانا ممدوح کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کے ساتھ خیر و صلاح کی دولت مرحمت فرمائی تھی، اس لیے جلد ہی اس پورے علاقے میں ان کے اثرات پھیل گئے اور ان کی تبلیغی مساعی سے لوگ متاثر ہونے لگے۔

ان کے مسکن سے متصل ضلع قصور اور اس کی تحصیل چونیاں ہے۔ اس نواح کے لوگ قیام پاکستان سے بہت پہلے سے ان کے اسلاف کے دائرۂ عقیدت میں داخل تھے اور لکھوی کے اور مرکز الاسلام میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ انھوں نے مولانا کو اپنا مرکزِ ارادت قرار دیے لیا اور مسلکی مسائل کے لیے وہی ان کا مرجع ٹھہرے۔ مولانا کا درِ فضیلت ہر شخص کے

لیے ہر وقت وا تھا۔ جب بھی کوئی آیا، انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور انتہائی خندہ پیشانی سے ملے، اس کی مہمان نوازی کی اور کھلے دل سے اس کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ وہ اخلاص کا چلتا پھرتا پیکر اور اعلیٰ اخلاق کا عملی نمونہ تھے۔ ان کی گفتگو کا اصل محور ہمیشہ اللہ کی رضا اور کتاب وسنت کے احکام کی پیروی رہا۔ جو آیا اس سے اسی دائرے میں رہ کر بات کی۔ خود بھی اسی دائرے میں رہے اور دوسرے کو بھی اسی میں محدود رکھنے کی کوشش فرمائی۔ ان کے ہاں حاضری کے لیے وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ جس کا جس وقت جی چاہے آئے اور جب تک جی چاہے ان سے محو گفتگو رہے۔

لاریب ان سے ملنے اور ان کی مجلس میں بیٹھنے سے اللہ یاد آتا اور دل نیکی کی طرف راغب ہوتا تھا۔ 1954ء کی بات ہے، گرمیوں کے دن تھے اور شام کا وقت۔ مولانا محمد حنیف ندوی، عوامی نیشنل پارٹی کے رہنما محمد فاروق قریشی اور ان سطور کا راقم انارکلی میں حاجی محمد اسحاق حنیف کی دکان پر بیٹھے تھے کہ مولانا محی الدین کا ذکر چھڑ گیا اور ان کی صالحیت کی باتیں ہونے لگیں۔ حاجی صاحب دلچسپ آدمی تھے۔ کہا آیے آج ان سے ملنے کے لیے ان کے گاؤں چلتے ہیں۔ ان کے ڈرائیور کا نام عبدالکریم تھا۔ اسے آواز دی۔ وہ گاڑی لے کر آیا اور نماز مغرب کے بعد ہم چاروں لاہور سے دیپال پور کو روانہ ہو گئے۔ دیپال پور سے ان کا گاؤں ایک میل کے فاصلے پر ہوگا۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ ہماری اچانک آمد پر نہایت خوش ہوئے اور بڑی خاطر تواضع کی۔ گھنٹے سوا گھنٹے کے قریب ہم ان کے پاس رہے اور رات کو تین بجے واپس لاہور آ گئے۔ افسوس ہے میرے یہ تینوں ساتھی اپنی اپنی باری سے وفات پا گئے اور میں اس واقعہ کا راوی موجود ہوں۔

مارچ 1959ء کی بات ہے کہ ایک دن ان سے ملاقات کا میرے دل میں شدید جذبہ ابھرا۔ میں قلعہ تارا سنگھ پہنچا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ دوسرے دن انھوں نے کنگن پور جانا تھا۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں جاتے ہی وہ ارادت مندوں کے گھیرے میں آ گئے۔ ایک

رات میں ان کے پاس رہا۔ پھر وہیں سے اجازت لے کر لاہور آ گیا۔

ایک دفعہ وہ لاہور کے ایک علاقے مدینہ ٹاؤن تشریف لائے جو والٹن کے قریب ہے۔ سخت سردیوں کا موسم تھا۔ مجھے کسی ذریعے سے یاد فرمایا۔ یہ علاقہ میرے گھر سے تقریباً چودہ پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ میں نماز عشاء کے بعد وہاں پہنچا اور ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ بے حد خوش ہوئے۔ فوراً چائے منگوائی۔ کھانے کے لیے فرمایا، لیکن میں کھانا کھا کر گیا تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا۔ چند باتیں کیں۔ پھر اجازت لے کر واپس آ گیا۔

ایک مرتبہ مولانا محمد حنیف ندوی نے مجھے فرمایا کہ مولانا محی الدین لاہور آئیں اور تم سے ان کا رابطہ ہو تو مجھے اطلاع دیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چند روز بعد وہ لاہور تشریف لائے۔ میں انھیں گھر لے گیا اور مولانا ندوی کو اطلاع دی۔ وہ آئے اور دیر تک مختلف موضوعات پر دونوں باتیں کرتے رہے۔

میرے ایک دوست محمد سعید قادری تھے جو نیشنل بینک کے بڑے افسروں میں سے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث نہیں تھے۔ نیک لوگوں اور اہم شخصیتوں سے ملنے کا انھیں بڑا شوق تھا۔ 1989ء کے ماہ مئی کی کوئی تاریخ تھی کہ میں نے ان سے مولانا محی الدین لکھوی کا ذکر کیا۔ فوراً پکار اٹھے چلیے ان کی خدمت میں حاضری دیں۔ اب ہم دیپال پور کو روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر بس سٹاپ پر اترے تو ایک تانگے والے سے پوچھا کہ یہاں ایک گاؤں میں مولانا محی الدین رہتے ہیں۔ ہماری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس نے کہا: آپ مولوی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ بیٹھیے تانگے پر۔

پوچھا: وہاں کا کتنا کرایہ لو گے؟

کہا: جو مرضی دے دینا۔ آپ کی وجہ سے مولوی صاحب کی زیارت ہو جائے گی۔

وہ راستے میں مولانا کی نیکی کی باتیں سناتا گیا اور ساتھ ہی ان کی زمینوں کی نشان دہی کرتا گیا جو راستے میں پڑتی تھیں۔ وہاں پہنچ کر ہم نے اسے دس روپے دیے۔ بے حد

خوش ہوا۔

تانگے سے اتر کر ہم مسجد میں گئے۔ یہ نمازِ ظہر سے کچھ دیر بعد کا وقت تھا۔ مسجد میں ایک نوجوان قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ مجھے خیال گزرا یہ مولانا کے صاحب زادے احمد ہوں گے۔ پوچھنے سے پتا چلا کہ میرا خیال صحیح تھا۔ میں نے ان کو بتایا کہ میرا نام اسحاق بھٹی ہے۔ ہم لاہور سے آئے ہیں اور مولانا کو سلام عرض کرنا چاہتے ہیں۔

احمد صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا آپ کا نام تو بہت دفعہ سنا ہے لیکن ملاقات کا موقع آج ملا ہے۔

انھوں نے گھر جا کر مولانا کو اطلاع دی۔۔۔ مولانا چند منٹ بعد اس حالت میں تشریف لائے کہ دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑا ہوا ہے اور ٹرے میں دو شیشے کے گلاس ہیں اور شیشے ہی کا ایک جگ شربت سے بھرا ہوا ہے۔ السلام علیکم کہہ کر انھوں نے ٹرے فرش پر رکھا اور باری باری ہم دونوں سے مصافحہ و معانقہ کیا۔ پھر اپنے ہاتھ سے شربت پلایا اور کھانے کا پوچھا۔ لیکن ہم کھانا کھا کر گئے تھے۔

کچھ دیر ہم ان کی خدمت میں رہے اور ان کی باتیں سنیں۔ واپسی کے لیے اجازت مانگی تو فرمایا آج یہیں رہو۔ کل چلے جانا۔ ہم نے معذرت کی تو باہر تک رخصت کرنے آئے اور بچوں سے فرمایا ان کو گاڑی پر دیپال پور لے جاؤ اور وہاں سے لاہور جانے والی بس پر بٹھا دو۔

محمد سعید قادری ان کے اخلاق اور گفتگو سے انتہائی متاثر ہوئے۔ قادری صاحب میرے حلقۂ احباب کے مخلص ترین رکن تھے۔ نومبر 1990ء میں فوت ہوئے۔

جو لوگ مولانا سے ملتے اور جہاں وہ جاتے ان کو عام گفتگو میں بھی اور وعظ و نصیحت کی صورت میں بھی قرآن و حدیث کے احکام سناتے، ان سے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے اور قبر و قیامت سے متعلق مسائل بیان فرماتے۔ اِدھر اُدھر کی دنیوی باتیں کرنا ان کی عادت نہ تھی۔ ان کی گفتگو کا محور صرف قرآن و حدیث ہوتے۔ اسی کی روشنی میں وہ لوگوں سے مخاطب ہوتے۔ موقع کی مناسبت سے کبھی قرآن کی کوئی آیت پڑھتے، کسی وقت نبی ﷺ کی حدیث

سناتے اور کبھی اپنے پڑدادا حافظ محمد لکھوی کی تفسیر محمدی یا احوال الآخرت کے پنجابی اشعار پڑھتے۔ ان کی ہر بات دل کی گہرائی سے نکلتی اور حاضرین کے قلب پر نقش ہو جاتی۔ ان کا شمار بلاشبہ اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا تھا اور وہ نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں لوگوں کو خطاب کرتے تھے۔ علم و عمل کی یک جائی اور اخلاقِ حسنہ اور بلندئ کردار کا اجتماع اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جس سے وافر مقدار میں مولانا محی الدین لکھوی کو بارگاہِ الٰہی سے نوازا گیا تھا۔



بیسواں باب

تبلیغ بھی اور عملی تربیت بھی

مولانا محی الدین لکھوی اس انداز سے لوگوں کو تبلیغِ دین فرماتے کہ ساتھ ساتھ ان کی عملی تربیت بھی ہوتی جاتی اور جو بات وہ بیان کرتے اور جس پر عمل پیرا ہوتے سننے اور دیکھنے والے اسے حرزِ جان بنا لیتے۔

جہاں انھیں جانا ہوتا، سیدھے مسجد میں جاتے، کسی کے گھر نہیں جاتے تھے۔ مسجد میں جا کر وضو کرتے اور دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتے۔ اتنے میں لوگوں کو ان کی آمد کا پتا چل جاتا اور وہ مسجد ہی میں آجاتے اور وہیں ان کا کھانا آجاتا۔ ایک آدھ دن ان کا وہاں رہنے کا ارادہ ہوتا تو مسجد ہی میں قیام فرماتے۔ فجر کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دیتے اور پھر اشراق کا وقت ہو جاتا تو دو یا چار رکعت پڑھتے۔ بالعموم مسجد ہی میں ناشتہ کرتے۔

تحصیل چونیاں کے ایک شخص نے بتایا کہ وہ کبھی جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) کے لیے چندے کی غرض سے تشریف لے جاتے تو نہ نقد روپے مانگتے اور نہ غلے کا سوال کرتے۔ درسِ قرآن دیتے یا رات کو وعظ کرتے، لوگ خود ہی سمجھ لیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ نقد روپے بھی مل جاتے اور غلہ بھی جمع ہو جاتا اور مولانا نقد روپے اور غلہ دینے والے ہر شخص کو اس کی رسید دیتے، جسے وہ لوگ تبرک سمجھ کر محفوظ کر لیتے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی کا بیان

مولانا محی الدین لکھوی مرحوم و مغفور کے صاحب زادۂ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی

(پنجاب یونیورسٹی) بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا معین الدین لکھوی سے ایک گاؤں ''خرم ہٹھاڑ'' کے لوگوں نے جمعہ پڑھانے کا وعدہ لیا، لیکن مولانا معین الدین کے ڈرائیور کو فوری طور پر کوئی ایسا حادثہ پیش آیا کہ وہ انھیں نہ لے جا سکا۔ ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ مولانا نے ڈرائیور کے طور پر جانے کے لیے مجھے حکم دیا اور میں ان کی گاڑی پر انھیں اس گاؤں میں لے گیا۔ جمعہ پڑھنے کے بعد مولانا معین الدین لکھوی کے اردگرد لوگ آ کر بیٹھ گئے اور مسئلے مسائل پوچھنے لگے، لیکن میں الگ مسجد کے ایک کونے میں جا بیٹھا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر ایک معمر شخص میرے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ تمھارا کیا نام ہے اور کس کے بیٹے ہو؟ میں نے بتایا کہ میرا نام حماد ہے، میں مولانا معین الدین کا بھتیجا اور ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین لکھوی کا بیٹا ہوں۔

مولانا محی الدین کا نام سن کر اس عمر رسیدہ شخص نے مجھ سے معانقہ کیا اور رونے لگا۔ وہ لوگ مولانا کو بابا جی کو کہتے تھے۔ اس شخص نے بتایا کہ ہم اہل حدیث تو کیا صحیح طور پر مسلمان بھی نہ تھے۔ باقاعدہ نماز بھی نہیں پڑھتے تھے اور مسجد بھی صاف نہ تھی۔

ایک روز ایسا ہوا کہ ہمارے گاؤں کا ایک شخص اپنی زمین کو پانی لگا رہا تھا۔ اس کے کان میں درس قرآن کی آواز پڑی، جو قریبی گاؤں ڈھولن ہٹھاڑ سے آ رہی تھی۔ اس آواز نے اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ آواز کے پیچھے اس مسجد میں پہنچ گیا، جہاں درس ہو رہا تھا۔ یہ مولانا محی الدین کا درس تھا اور انھی کی آواز تھی۔ درس کے بعد وہ مولانا سے ملا اور انھیں اپنے گاؤں ''خرم ہٹھاڑ'' آنے کی دعوت دی۔

ہماری خوش قسمتی سے بابا جی (مولانا محی الدین) یہاں آئے اور انھوں نے مسجد میں وعظ کیا۔ نماز کی فضیلت بیان فرمائی اور نماز نہ پڑھنے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ مسلمان نہیں۔ انھوں نے اس انداز اور اس لہجے سے باتیں کیں کہ ان کی باتیں ہمارے دلوں میں بیٹھ گئیں۔ انھوں نے جنت دوزخ کا اس طرح نقشہ کھینچا کہ ایسا محسوس ہوا کہ ہم نے نماز

نہ پڑھی تو مرنے کے بعد واقعی دوزخ میں جائیں گے اور آگ میں جلیں گے۔ اگر نماز پڑھنے لگے تو بہشت ملے گی اور ہم اس میں نہایت آرام سے رہیں گے۔

مولانا نے نماز پڑھ کر انھیں بتایا کہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر اور اچھی طرح رکوع سجود کر کے نماز پڑھنی چاہیے۔ نماز میں پڑھی جانے والی دعائیں بھی سنائیں اور ان کے معنے بھی بتائے۔ اس کے بعد ہم لوگ باقاعدہ نماز پڑھنے لگے۔ مسجد کی صفائی کا اہتمام کیا اور مسجد میں بچوں کے لیے قاعدے سپارے اور قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

اس شخص نے بتایا کہ بابا جی (مولانا محی الدین لکھوی) نے فرمایا اپنے مال سے سال بھر کے بعد زکوٰۃ دینا فرض ہے اور غلے سے عشر ادا کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ اور عشر وغیرہ اپنے گاؤں کے غریبوں اور مستحق لوگوں کو دو۔ وہ لوگ تمھیں دعائیں دیں گے اور اللہ کی بارگاہ میں ان کی امداد تمھاری نجات کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

پھر بابا جی کی یہاں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تو انھوں نے ایک رجسٹر بنایا اور ان لوگوں کے نام لکھے جن پر زکوٰۃ اور عشر دینا فرض ہے۔ انھوں نے مستحقین کے نام بھی لکھے اور فرمایا زکوٰۃ، عشر اور فطرانے کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ لینے والے کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور انھیں کمزور نہ سمجھا جائے۔ وہ بھی امیروں کی طرح اللہ کے بندے ہیں۔ لیکن ان کی مالی حالت کمزور ہے۔ یتیم بچوں، بیوہ عورتوں، غریب طالب علموں سب کو مناسب طریقے سے دیا جائے۔

اس شخص نے بتایا کہ جب تک مولانا زندہ رہے، یہاں ان کا آنا جانا رہا۔ وہ جب بھی آتے زکوٰۃ اور عشر کا رجسٹر دیکھتے اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ ہماری عملی تربیت کرتے۔ ان کی تبلیغ سے پورا گاؤں اہلِ حدیث ہوگیا۔

یہ تھا مولانا محی الدین کا اندازِ تبلیغ اور عملی تربیت کا سلسلہ۔ اس طرح انھوں نے متعدد مقامات کے لوگوں کو اسلام کی صاف ستھری راہ پر لگایا اور ان کے پاس بار بار جا کر انھیں دینی

احکام سکھائے۔ بہت سے مقامات پر ان کی تبلیغی کوشش سے مسجدیں بنائی گئیں، پھر ان مسجدوں میں دینی تعلیم دینے کا اہتمام کیا گیا، جس کے نہایت اچھے نتائج نکلے۔ وہ صحیح معنوں میں مبلغِ دین تھے اور کتاب وسنت کی پابندی کرنے والے عالم دین۔!

اس معمر شخص نے پروفیسر محمد حماد لکھوی کو بتایا کہ آج ہم نے پورے گاؤں کی گلیوں میں جھاڑو دے کر صفائی کی ہے۔ یہ سب اہتمام اس خوشی میں ہے کہ ہمارے مرشد (مولانا محی الدین) کے بھائی (مولانا معین الدین) تشریف لا رہے ہیں۔

مولانا محی الدین لکھوی کسی سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ وہ زمین جائداد کے مالک اور آسودہ حال تھے۔ لوگوں سے لینے کے بجائے وہ اپنی گرہ سے مستحقین کو دیتے تھے۔ خود بھی اور لوگوں کے بلانے پر بھی وہ مختلف مقامات میں جاتے اور انھیں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام پہنچاتے۔ وہ لوگوں کو بتاتے کہ کون سے اعمال نجات کا ذریعہ ہیں اور کون سے سزا کا موجب۔ یعنی وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر خود بھی عمل پیرا تھے اور لوگوں کو بھی ان کی ذہنی اور فکری استطاعت کے مطابق اس پر عمل کی تلقین فرماتے تھے۔

عادات واطوار

وہ بلند مرتبت خاندان کے فرد تھے اور اپنے اسلاف کی عادات واطوار کی جھلک ان میں نمایاں تھی۔ وہ کھانے پینے کی کسی چیز میں نقص نہیں نکالتے تھے۔ سالن میں نمک یا مرچ زیادہ ہے یا کم، وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ جو ملا کھالیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ لباس کے سلسلے میں سادگی پسند تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی صفائی پسند بھی۔ ان کی گفتگو عام فہم ہوتی تھی۔ ان پڑھ بھی ان کی بات آسانی سے سمجھ لیتے تھے اور کم تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی۔! کسی قسم کا تکلف ان کے ہاں نہیں تھا۔ وہ عربی کے عالم، فارسی کے ماہر اور انگریزی سے آشنا تھے۔ ان کے زمانے کی دس جماعتیں آج کل کی چودہ جماعتوں یعنی بی اے سے زیادہ قابلیت کا باعث ہوتی تھیں۔ اتنے تعلیم یافتہ ہونے کے باوصف وہ آسان زبان میں گفتگو کرتے۔ نہ خود کسی

نوع کا تکلف کرتے، نہ کسی کو تکلف کا موقع دیتے۔

تعلیم وتعلم کے وہ سخت حامی تھے۔ ان کے تمام بچے جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں، لیکن انھوں نے ان کو پورے اہتمام سے دینی تعلیم بھی دلائی اور ان کی بہترین تربیت کی۔

انھوں نے اپنے اسلاف کے عمل وکردار کو ہمیشہ پیش نگاہ رکھا اور لوگوں کے ساتھ ان کے اسلاف جو حسنِ اخلاق کا برتاؤ کرتے تھے، اس کو انھوں نے اپنے عمل سے زندہ رکھا بلکہ کہنا چاہیے کہ اس میں تازگی کا باعث بنے۔

مولانا محی الدین لکھوی خطبۂ جمعہ یا عام وعظ اور درس میں کسی قسم کے چندے وغیرہ کی اپیل نہیں کرتے تھے۔ مجھے ایک شخص نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ ایک مرتبہ انھوں نے جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں جمعہ پڑھایا۔ دوران خطبہ ایک طالب علم نے چٹ بھیجی کہ میں بخاری شریف لینا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کوئی صاحب مجھے بخاری شریف خریدنے کے لیے پیسے دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ مولانا نے چٹ پڑھی، لیکن اس کا اعلان نہیں کیا۔ جمعے کی نماز پڑھ چکے تو آواز دی: بخاری شریف کی کس کو ضرورت ہے؟ وہ طالب علم حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے ضرورت ہے!

فرمایا: کسی وقت میرے پاس الہ آباد آؤ، میں تمھیں بخاری شریف دے دوں گا۔ یہ تھی ان کی عادات واطوار کی ایک جھلک اور یہ تھا ان کی تبلیغ اور عملی تربیت کا خوب صورت انداز۔

بلاشبہ مولانا محی الدین لکھوی کا طریق تبلیغ خالص پیغمبرانہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو اسی طرح تبلیغ فرماتے اور عملی صورت میں احکام دین سمجھاتے تھے۔

مولانا محی الدین لکھوی خدا ترس عالم تھے۔ دوسرے کی ضرورت کو ہمیشہ پیش نگاہ رکھتے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا موٹر سائیکل پر کہیں جارہے تھے کہ ایک شخص نے ہاتھ

کے اشارے سے انھیں روکا اور کہا کہ ایک شخص ادھر گیا ہے، مجھے اس سے ایک کام ہے، آپ چند منٹ کے لیے موٹر سائیکل دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ نہ مولانا اسے جانتے ہیں، نہ وہ مولانا کو جانتا ہے۔ لیکن اسے موٹر سائیکل دے دیا اور خود وہاں کھڑے ہیں۔ اس شخص کے دل میں پتا نہیں کیا بات آئی، چند منٹ کے بعد وہ واپس لوٹا اور مولانا کو موٹر سائیکل دے دیا۔



اکیسواں باب

1951ء کے انتخابات اور مولانا لکھوی رحمہ اللہ کا خواب

تحصیل چونیاں ضلع قصور میں مولانا محمد علی لکھوی کے بے شمار عقیدت مند موجود تھے۔ قیامِ پاکستان کے تین سال بعد 1951ء میں پنجاب میں جب پہلے انتخابات کا اعلان ہوا، مولانا محمد علی اس وقت یہاں نہیں تھے، مدینہ منورہ میں مقیم تھے اور مسجد نبوی میں طلباء کو قرآن وحدیث کا درس دیتے تھے، لیکن مولانا محی الدین یہیں پاکستان میں تھے اور جو لوگ مولانا محمد علی لکھوی کے دامنِ عقیدت سے وابستہ تھے، ان کا مرکزِ عقیدت اب ان کے بڑے صاحب زادے یہی مولانا محی الدین لکھوی قرار پا گئے تھے۔ مولانا بھی ان لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے میل جول رکھتے تھے، وہ بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ان میں اہل حدیث اور احناف دونوں مسالک کے لوگ شامل تھے، لیکن اہل حدیث کی تعداد اس علاقے میں زیادہ ہے۔ ان سب لوگوں نے مولانا سے اصرار کیا کہ وہ اس حلقے سے انتخاب لڑیں۔ مولانا کو اس جھمیلے میں پڑنے کا کوئی خیال نہ تھا، لیکن لوگوں کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا نے اس سے کئی سال قبل یعنی قیامِ ہندوستان کے زمانے میں ایک خواب دیکھا تھا۔ اب خود مولانا کی زبانی وہ خواب بھی سنیے اور انتخاب میں کامیابی کے بارے میں بھی ان کے ارشادات ملاحظہ فرمایے۔ انھوں نے مجھے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ

"تقسیم ہند سے کچھ عرصہ پہلے میں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ ملکہ وکٹوریا کا جنازہ

رکھا ہوا ہے اور ملک کے نامور علمائے کرام اس کا جنازہ پڑھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ جنازہ پڑھنے کے لیے جو صف بنائی گئی ہے، وہ بجائے سیدھی ہونے کے گولائی میں ہے۔ درمیان میں ملکہ وکٹوریا کی میت پڑی ہے۔ میں اس صف سے باہر نکل کر پُر جوش انداز میں تمام علمائے کرام کو مخاطب کر کے کہتا ہوں: تمھیں کیا ہوگیا ہے، ایک کافر عورت کا جنازہ پڑھنے لگے ہو، کوئی خدا کا خوف کرو۔۔۔ بس یہیں میری آنکھ کھل گئی۔''

مولانا اس خط میں مزید فرماتے ہیں۔

''وقت گزرتا گیا لیکن یہ خواب مجھے یاد رہا۔ پاکستان بننے کے بعد جو پہلے الیکشن ہوئے، لوگوں نے کہہ کہلا کر مجھے اس الیکشن میں کھڑا کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی دی۔ اس وقت لیجسلیو اسمبلیاں تھیں۔ میں پنجاب کی لیجسلیو اسمبلی کا رکن (ایم ایل اے) منتخب ہوا تھا۔

''پنجاب اسمبلی کی عمارت میں اجلاس ہوا تو میں نے اس میں شرکت کی۔ حلف برداری کی تقریب میں ہر رکن حلف نامہ پڑھ کر دستخط کرتا اور سپیکر سے مصافحہ کر کے باہر نکل جاتا تھا۔ حلف نامے کی عبارت کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے کہ میں پاکستان کے آئین کا ہمیشہ پابند رہوں گا اور تمام آئینی حدود کا احترام اور پابندی کروں گا۔ میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہر شخص اس آئین کی پابندی کا حلف اٹھا رہا ہے جو ابھی بنا ہی نہیں۔ پتا نہیں کیسا آئین بنے گا۔ قرآن وسنت کا اس میں کتنا دخل ہوگا۔

''ان خیالات کے ساتھ میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا اور جب میری باری حلف اٹھانے کی آئی تو میں نے بڑے پر جوش انداز میں سپیکر کو مخاطب کر کے کہا:

''جناب سپیکر۔! اگر یہ حدود (جن کا حلف نامے میں ذکر ہے) کسی مقام پر اللہ

اور اس کے رسول (ﷺ) کی حدود سے ٹکرائیں تو پھر کیا صورت ہوگی؟ اس پر پورے ایوان میں سناٹا چھا گیا۔ سپیکر نے بھی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف مولانا عبدالستار نیازی نے اٹھ کر پرجوش آواز میں کہا کہ پھر ہم اس (حلف نامے کی حدود) کو چھوڑ دیں گے۔۔۔ اس کے بعد جھنگ کے ایک معمر رکن مولانا محمد ذاکر صاحب نے بڑی نحیف آواز میں فرمایا ”میں بھی مولانا کی تائید کرتا ہوں۔“

”میں نے اس پر جزاکم اللہ کہا اور دستخط کر کے سپیکر سے مصافحہ کیا اور باہر آ گیا۔

”دروازے سے باہر نکلتے ہی میں نے دیکھا کہ اس کے بالکل سامنے ایک چبوترے پر (جہاں آج کل قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھا ہے) ملکہ وکٹوریا کا بت (مجسمہ) نصب ہے۔ اس مجسمے پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنا خواب یاد آ گیا اور میں نے سمجھا کہ یہ اس کی تعبیر ہے۔“

مولانا محی الدین کی تحریر یہاں ختم ہوئی۔

بات یہ ہے کہ اس وقت 1935ء کا انگریزی حکومت کا بنایا ہوا ایکٹ چلتا تھا، اسی کے تحت انتخابات ہوئے تھے، وہی اس وقت پاکستان کا آئین تھا اور اسمبلی کے ارکان نے اس کی پابندی کرنے اور اس کی حدود میں رہنے کا حلف اٹھایا تھا۔ حلف اٹھانے والوں میں علمائے کرام بھی تھے، جو کافر حکومت کے بنائے ہوئے آئین کی پابندی کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔ اسمبلی کی نشستیں گولائی میں ہیں، جن پر بیٹھ کر پاکستان میں انگریز کے آئین کی وفاداری کا اقرار کیا جا رہا تھا۔

مولانا نے حلف اٹھانے سے قبل سپیکر سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا تھا، وہ اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ یہ 7۔مئی 1951ء کا واقعہ ہے، جس پر 65 برس گزر چکے ہیں۔ میں اس وقت اخبار ”الاعتصام“ سے وابستہ تھا اور میں نے مولانا محی الدین کے اس اعلان پر ”حسنِ آغاز“

کے عنوان سے 18۔ مئی 1951ء کے "الاعتصام" میں اداریہ شذرہ لکھا تھا۔ اس زمانے کی تاریخ کو تازہ کرنے اور مولانا محی الدین لکھوی کی اس عہد کی آواز کو آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لیے وہ اداریہ شذرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ پہلی آواز تھی جو اس مردِ حق آگاہ نے پنجاب اسمبلی میں بلند کی تھی۔

"ہمیں دلی مسرت ہے کہ اب کی پنجاب اسمبلی میں مختلف دروازوں سے ایسے لوگ بھی آئے ہیں جو خالص اسلامی ذہن وفکر کے حامل ہیں اور جن پر یہ احساس ہر آن طاری رہتا ہے کہ ہمارا ملک صحیح معنوں میں اسلامی روایات اور اسلامی ثقافت کا حامل ہو۔ ان میں ہمارے نوجوان دوست مولانا محی الدین لکھوی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے پنجاب کی مجلس دستور ساز کے پہلے ہی اجلاس میں جس اسلامیت کا ثبوت دیا ہے، اس پر ہر صحیح العقیدہ مسلمان کو خوش ہونا چاہیے۔

"7۔ مئی کو پنجاب کی نئی مجلس دستور ساز کا پہلا اجلاس ارکانِ مجلس سے حلفِ وفاداری لینے اور سپیکر منتخب کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ جب مولانا محی الدین لکھوی کو حلفِ وفاداری اٹھانے کے لیے بلایا گیا تو انھوں نے معزز سپیکر سے یہ تصریح طلب کی کہ اگر کسی وقت موجودہ آئین کے کتاب وسنت سے متصادم ہونے کی صورت پیدا ہو جائے تو کیا اس وقت کوئی مسلمان اس آئین کا پابند رہ سکتا ہے؟

"مولانا کی حلف وفاداری سے متعلق اس صراحت طلبی پر ایوان سے آوازیں بلند ہوئیں کہ "ہم ایسی صورت میں اسمبلی سے احتجاجاً نکل جائیں گے۔"

"ہم اس حسنِ آغاز سے بے حد مسرور ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مولانا محی الدین لکھوی اور دیگر اسلامی ذہن کے ارکان ہر موقعے پر اسلام کے تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور غیر اسلامی قوانین کو اسمبلی میں گھسنے نہیں دیں گے۔ ہمیں

اس سے بھی قلبی تسکین ہوئی ہے کہ اسمبلی کے ارکان نے ایسے موقعے پر مولانا کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا ہے۔''

مولانا محی الدین لکھوی کی عمر اس وقت 35۔36 سال کی تھی۔ انھوں نے اسمبلی کا انتخاب تو لڑا، اس میں کامیاب بھی ہوئے اور اسمبلی میں یہ اعلان بھی کیا۔لیکن یہ کام اور اسمبلی کا ماحول ان کے مزاج اور رجحان کے بالکل خلاف تھا، اس لیے جب تک وہ اس کے رکن رہے، ذہنی طور سے ان پر **لا یموت فیھا ولا یحیٰ** کی سی کیفیت طاری رہی۔

یہاں یاد رہے کہ مولانا محی الدین لکھوی نے یہ انتخاب کسی جماعت کی طرف سے نہیں لڑا تھا، انفرادی طور پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا اور اللہ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی تھی۔ اس وقت مولانا محی الدین لکھوی کے مدمقابل پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی کے والد مکرم سردار احمد علی تھے جو جدّی پشتی اسی علاقے کے رہنے والے تھے اور دور تک پھیلی ہوئی زمینوں کے مالک تھے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ مولانا محی الدین لکھوی کے بھائی مولانا معین الدین لکھوی اور ان کے رفقائے کار اپنے حلقے کے دیہات کا چکر بائیسکلوں پر لگاتے تھے۔خود مولانا محی الدین بھی بائیسکل کے ذریعے سے اپنے ووٹروں کے پاس جاتے تھے، جب کہ سردار احمد علی اور ان کے معاونین موٹر کاروں پر سوار ہوتے تھے اور وہ اس حلقے کے بڑے زمیندار اور مال دار آدمی تھے۔لیکن کامیابی اللہ تعالیٰ نے محی الدین لکھوی کے مقدر میں لکھی تھی اور وہ ووٹوں کی بہت بڑی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔

یہاں یہ بھی عرض کردیں کہ اس سے گیارہ سال بعد 1962ء میں ایوب خاں کے جاری کردہ آئین کے تحت بھی مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین نے اس حلقے سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لیا تھا، میں بھی دو تین روز ان کے ساتھ ان کے حلقے میں چکر لگاتا رہا تھا۔ ان انتخابات کے ووٹر بنیادی جمہوریتوں کے ارکان (یعنی بی ڈی ممبر) تھے جن کی تعداد بہت محدود تھی۔ اس زمانے میں ان ووٹروں اور بی ڈی ممبروں کی

بہت قیمت پڑی تھی، اسمبلیوں کے جن امیدواروں نے ان کو زیادہ پیسے دیے، انھوں نے ان کو ووٹ دیے۔ جنھوں نے پیسے نہیں خرچ کیے اور ووٹ نہیں خریدے، انھیں ووٹ نہیں ملے۔ بعض بی ڈی ممبروں نے امیدواروں کی نیکی اور شرافت کی بنا پر بھی ووٹ دیے اور دوسرے ممبروں کو بھی ان کی امداد کے لیے کہا، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔



بائیسواں باب

ایک اور خواب

مولانا محی الدین لکھوی کا ایک خواب جو انھوں نے تقسیمِ ملک سے پہلے دیکھا تھا، ہم نے گزشتہ باب میں پڑھا۔ یہ ایک دلچسپ خواب ہے، جس کی تعبیر تقسیمِ ہند کے بعد ظہور میں آئی۔ ملکہ برطانیہ کا جنازہ پڑھا گیا یعنی انگریز کا راج برصغیر سے ختم ہوا اور ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو آزاد مملکتیں نقشہ عالم پر ابھریں۔

اب مولانا ممدوح کا ایک اور خواب ہمارے علم میں آتا ہے۔ یہ بھی تقسیم ملک سے قبل کا ہے اور نہایت عجیب و غریب خواب ہے۔

خواب اور اس کی تعبیر

خواب بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خواب اور اس کی تعبیر سے متعلق مختصر الفاظ میں چند باتیں عرض کر دی جائیں۔

✿ خواب ایک انتہائی اہم معاملہ ہے اور اس کی تعبیر بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ خواب سے انسان پر آئندہ کے حالات کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے۔ لم یبق من النبوۃ الا المبشرات۔ قالوا وما المبشرات؟ قال الرؤیا الصادقۃ۔ (صحیح بخاری)

(یعنی نبوت میں سے مبشرات کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم

نے سوال کیا: مبشرات کیا ہیں؟ حضور ﷺ نے جواب دیا: سچا خواب)

اس حدیث پاک سے یہ پتا چلتا ہے کہ خواب کے سوا اب مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ باقی نہیں رہا، جس سے مستقبل کے بارے میں کسی چیز کا تھوڑا بہت علم ہو سکے۔ عہدِ نبوت میں تو نبی ﷺ کی بیان فرمودہ پیش گوئیوں سے آئندہ رونما ہونے والے واقعات سے مطلع ہوا جاسکتا تھا، لیکن جب حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو کسی صالح بزرگ کے اچھے خواب ہی سے مستقبل کے معاملات کا کسی حد تک اندازہ ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ منصب نبوت سے سرفراز ہونے سے قبل خود نبی ﷺ کو بھی بارگاہ الٰہی سے رؤیائے صادقہ (یعنی سچے خواب) دکھائے جاتے تھے، جن کی حیثیت مبشرات اور خوش خبریوں کی ہوتی تھی۔ جلد ہی ان خوابوں کی تعبیر سامنے آجاتی تھی۔ انہی ایام میں نبی ﷺ کا رجحان معاملاتِ دنیا سے منقطع ہوا اور آپ غار حرا میں اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔

سچے خواب کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ لسانِ رسالت سے اس کو جزوِ نبوت قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے

الرؤيا الصالحة جزء من ستة واربعين جزءاً من النبوة۔ (صحیح بخاری)

(سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے)

اچھا اور برا خواب

اس ارشاد پیغمبر ﷺ کا واضح مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ کی ذاتِ اقدس کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد نبوت ختم ہوئی۔ اب کسی شخص کو کبھی بھی یہ منصب نصیب نہیں ہوگا، لیکن علومِ نبوت باقی رہیں گے، جن میں سے ایک علم کا نام ''رؤیائے صالحہ یا رؤیائے صادقہ'' ہے۔ بہ الفاظِ دیگر خواب دیکھنے والا بے شک نبی نہیں ہے، ایک عام آدمی ہے، لیکن اس کا خواب علاماتِ نبوت میں سے ایک علامت ہے، جیسے خوش کلامی، اعتدال، اخلاق حسنہ،

صالحیت اور لوگوں کی خیر خواہی وغیرہ چیزیں اوصافِ نبوت میں سے ہیں، اسی طرح اچھا خواب بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

اچھے خواب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت سے تعبیر کرنا چاہیے اور بندے کو اللہ کے ساتھ ہر معاملے میں حسنِ ظن رکھنا چاہیے اور اس بشارت پر جو خواب کے ذریعے سے اسے حاصل ہوئی ہے اس پر اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس مکروہ اور جھوٹا خواب شیطانی القا ہے جس سے بندۂ مومن کا دل پریشانی اور غم واندوہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان دونوں قسم کے خواب یعنی اچھے اور برے کے بارے میں نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ملاحظہ ہو۔

الرؤيا الصالحة من الله والحلم من الشيطان فاذا رأى احد كم مايحب فلا يحدث به الامن يحب واذا رأى مايكره فليتعوذ بالله من شرها ومن شر الشيطان و ليتفل ثلاثاً ولا يحدث بها احداً فانها لن تضره (بخاری ومسلم)

یعنی اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا شیطان کی طرف سے۔ جو شخص اچھا خواب دیکھے، اسے صرف اس شخص سے بیان کرے، جس سے وہ (دینی) محبت رکھتا ہے اور جب برا خواب دیکھے تو اللہ تعالیٰ سے اس خواب کے شر اور شیطان کے فتنے سے پناہ مانگے اور چاہیے کہ تین مرتبہ تھوکے اور اس (مکروہ خواب) کو کسی سے بیان نہ کرے۔ ایسا کرنے سے (یہ خواب) اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے گا۔

اچھا خواب یہ ہے کہ انسان دیکھے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے، قرآن کی تلاوت کر رہا ہے، وعظ و نصیحت میں مصروف ہے، اس نے درس و تدریس کو اپنے مشغلہ بنا رکھا ہے، سب سے حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے اور اسی کارِ خیر میں اس کے شب و روز بسر ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف برا خواب یہ ہے کہ اس نے کسی کو قتل کر دیا ہے، چوری اور ڈاکے میں مشغول ہے، لوگوں سے بداخلاقی سے پیش آتا اور ان کو سب و شتم کرتا ہے، نماز کا تارک اور احکامِ الٰہی کا منکر ہے۔

مولانا لکھوی کا خواب

اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا محی الدین لکھوی کا خواب کس قسم کا ہے، جس کا اس باب میں ''ایک اور خواب'' عنوان قائم کیا گیا ہے۔ یہ نہایت تعجب انگیز خواب ہے جو مولانا نے اپنے صاحب زادۂ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی سے بیان فرمایا۔ قارئین کرام ڈاکٹر صاحب کی زبانی اس کا مندرجہ ذیل سطور میں مطالعہ فرمائیں۔ مولانا بیان کرتے ہیں:

> تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب میرا معمول یہ تھا کہ میں مصلّٰی اور پانی سے بھرا ایک لوٹا لے کر گاؤں سے باہر چلا جاتا اور وہاں اللہ کی حمد وثنا میں مشغول ہوجاتا، اور مختلف قسم کے مسنون اذکار میرے معمولات میں شامل تھے۔ ایک دن دورانِ مطالعہ مجھے ایک حدیث نظر آئی جو یہ تھی ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے''۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے جنت کا خزانہ مل جائے تو باقی چیزوں کی کیا ضرورت ہے، چنانچہ اس دن سے لے کر شب وروز میرا معمول رہا کہ میں نے دیگر اوراد ووظائف بہت کم کر دیئے اور ہمہ وقت ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' کا بکثرت ذکر سوچ سمجھ کر کرنے لگا۔ صبح وشام میری زبان پر یہی ذکر رہتا۔ میں اتنا خوش تھا کہ اور کوئی بات ہی نہ کرتا۔ اسی اثنا میں ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے جسم کا آدھا حصہ لمبائی کے رخ کٹ کر علیحدہ ہوگیا ہے اور میں اس کے باوجود مکمل تھا۔ خواب ہی میں یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ علیحدہ ہونے والا یہ حصہ دنیا ہے، یعنی مجھ سے دنیا علیحدہ کردی گئی ہے اور باقی صرف دین رہ گیا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ممدوح مولانا موصوف کا یہ فرمان بیان کرتے ہیں کہ

"اس خواب کے بعد مجھے دنیا کی کبھی کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی اور میں دنیا کے تفکرات اور فکرِ معاش سے بالکل آزاد ہو گیا۔"

علم تعبیر رؤیا اور اس کی فضیلت

علم تعبیر رؤیا سے تعلق رکھنے والے حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس عظیم الشان علم میں جو مہارت رکھتے تھے، اس میں انھیں انفرادیت حاصل تھی۔ سورہ یوسف کا غور سے مطالعہ کیا جائے اور اس کے تمام پہلوؤں کو زاویۂ فکر میں لایا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس علم کی فضیلت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خود اس کی تعلیم دی۔ ارشاد ہے:

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

(سورہ یوسف: 6)

(اے یوسف: تیرا رب اسی طرح تجھے برگزیدہ بنائے گا اور تجھے تعبیر خواب کا علم عطا فرمائے گا)

تعبیر رؤیا کی چھے مشہور شخصیتیں

حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ تعبیرِ رؤیا کے سلسلے میں چھے شخصیتوں کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(1) حضرت دانیال علیہ السلام (2) حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ (3) حضرت امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ (4) حضرت امام جابر مغربی رحمۃ اللہ علیہ (5) حضرت امام ابراہیم کرمانی رحمۃ اللہ علیہ اور (6) حضرت امام اسماعیل بن اشعث رحمۃ اللہ علیہ۔

امام محمد بن سیرین

امام محمد بن سیرین کا زمانہ صحابہ اور تابعین کا زمانہ تھا۔ ان کے بارے میں منقول ہے کہ خواب کی تعبیر دیتے وقت خواب دیکھنے والے کی عادات واطوار اور اس کے چہرے مہرے کا بھی

جائزہ لینا چاہیے۔ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے نماز کی اذان کہی ہے۔امام محمد بن سیرین نے فرمایا تو اسلام کے مطابق پورا حج کرے گا۔

ایک اور شخص آیا اس نے بھی یہی سوال کیا اور کہا کہ میں نے اپنے آپ کو خواب میں نماز کی اذان کہتے ہوئے دیکھا۔ جواب دیا لوگ تم پر چوری کا الزام لگائیں گے۔

اس پر ان کے شاگردوں نے ان سے عرض کیا کہ دونوں کے خواب ایک ہی قسم کے ہیں، لیکن آپ نے دونوں کو مختلف تعبیر دی ہے۔

فرمایا: پہلے شخص کی شکل وصورت میں مجھے صالحیت کی روشنی دکھائی دی۔ اس لیے میں نے قرآن کی آیت کریمہ **واذن فی الناس بالحج یا توك رجالا**...(الحج:27)

(اور اعلان کردو لوگوں میں حج کا ، آئے گے تیرے پاس پیدل چل کر۔۔۔) سے استدلال کرتے ہوئے یہ تعبیر دے دی۔ دوسرے شخص میں مجھے آثارِ صالحیت نظر نہیں آئے۔

لہٰذا میں نے **ثم اذن مؤذن ایتها العیر انکم لسٰرقون** (یوسف:70)

(ایک منادی کرنے والے نے یہ منادی کی کہ اے قافلے والو تم ضرور چور ہو) کی رو سے میں نے اسے چوری کا ملزم ٹھہرادیا۔

علمائے دین کا خواب

بعض لوگوں نے خواب دیکھنے والے مختلف طبقوں کے نام تحریر کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ان میں سے کس طبقے کے خواب کو فضیلت حاصل ہے۔ ان میں ایک طبقہ علمائے دین کا ہے۔علمائے دین میں سے کوئی شخص خواب دیکھے تو وہ ''رؤیاے صالحہ اور رؤیائے صادقہ'' ہوگا اور اس کی تعبیر صحیح ہوگی، کیوں کہ یہ لوگ اللہ کے دین کی تبلیغ فرماتے اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر گام زن رہنے کی تلقین کرتے ہیں، چنانچہ ہم نے گزشتہ صفحات میں بیان کردہ مولانا محی الدین لکھوی کے خوابوں کے بارے میں دیکھا کہ ان کی صحیح ترین تعبیر سامنے آئی۔

خواب میں سورۃ الناس اور لاحول ولاقوۃ پڑھنے والا

یہاں امام محمد بن سیرین کا ہی کا ایک قول ملاحظہ فرمایے۔ ان کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ وہ سورہ الناس پڑھ رہا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے گا اور اس پر رزق کی فراخی ہوگی۔

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر خواب میں **لاحول ولا قوۃ الاباللہ العلی العظیم** پڑھے (یعنی یہ کہے کہ گناہوں سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق اللہ بزرگ وبلندتر ہی عطا کرنے والا ہے) تو وہ شخص مال اور مراد پائے گا۔

مولانا محی الدین لکھوی کی زبان پر خواب اور بے داری میں کلمہ **لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** طاری رہا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کی ہر مراد پوری کی اور انھوں نے نہایت اطمینان کی زندگی گزاری۔ کارگاہِ حیات میں ہر تکلیف سے محفوظ رہے۔ پیدائش سے لے کر تادمِ آخریں ہر نوع کا سکون انھیں حاصل رہا۔ انھوں نے جس قسم کے خواب دیکھے، اس قسم کے خواب موجودہ زمانے کے شاید کسی عالمِ دین نے نہیں دیکھے ہوں گے۔

خواب، اس کی تعبیر اور اس موضوع سے متعلق تفصیلات جو بڑی دلچسپ ہیں امام ابن سیرین کی تعبیر الرؤیا کے ابتدا میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا ابوالقاسم دلاوری مرحوم نے کیا ہے۔

بہر کیف خواب کی تعبیر ایک بہت بڑا علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو بہرہ مند کرتا ہے۔ سورہ یوسف میں اسے "تاویل الاحادیث" بھی قرار دیا گیا ہے اور "تاویل رویا" بھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے خاندان کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر تشریف لے گئے تو حضرت یوسف نے فرمایا تھا:

يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا

(سورہ یوسف:100)

(اے میرے باپ: یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر جو میں نے (بہت سال) پہلے دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچا ثابت کردیا۔)

مولانا محی الدین لکھوی کے دونوں خواب عجیب وغریب قسم کے ہیں جن کی تعبیر ظہور میں آئی۔



تیئیسواں باب

دعا اور اس کی فضیلت

بارگاہِ الٰہی میں اپنی جائز ضرورتوں کے لیے دست سوال دراز کرنے کا نام دعا ہے۔ ہر معاملے میں اللہ سے التجا کرنا، اپنے گناہوں کی معافی مانگنا، امورِ خیر سرانجام دینے کے لیے عرض گزار ہونا، اپنے علاوہ عام لوگوں کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے دربارِ خداوندی میں ملتجی ہونا، دعا کہلاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی دعا کا ذکر فرمایا گیا ہے اور نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ میں بھی تفصیل سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا عام اعلان ہے، جسے حکم کا درجہ حاصل ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن: 60)

(اور تمھارے پروردگار کا فرمان ہے کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا)

جو لوگ از راہِ تکبر اللہ کو پکارنے اور اس کی عبادت کرنے اور اس کے حضور عجز و عاجزی سے دعا مانگنے سے انکار کرتے ہیں، ان کے لیے قرآن میں دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔ اسی آیت کے اگلے الفاظ ہیں:

ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین

(بے شک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں، وہ ضرور ذلیل ہو کر جہنم میں جائیں گے)

اس سے آگے فرمایا:

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (المؤمن:65)

(وہ اللہ زندہ ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تم خالص اسی کو پکارو)

اگر کسی کو اللہ سے مانگنے اور اس کی بارگاہِ قدس میں دعا کرنے کا طریقہ آتا ہے تو وہ ضرور اس سے انتہائی اخلاص اور خشوع و خضوع سے دعا کرے گا اور اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کی دعا قبول ہوگی۔ واضح الفاظ میں ارشاد ہے:

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ (البقرۃ:186)

(جب کوئی دعا کرنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ لوگوں کو چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں)

انسان کو قرآن کے ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ:20)

(اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی خیر و عافیت عطا فرما اور آخرت میں بھی خیر و برکت عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا)

(مشکوۃ شریف، باب جامع الدعاء)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ زیادہ تر انہی الفاظ میں دعا فرمایا کرتے تھے۔

اس طرح قرآن میں بہت سی آیات ہیں جو دعاء سے تعلق رکھتی ہیں۔

کتب احادیث میں تو دعا کے متعلق نبی ﷺ کے ارشادات گرامی بڑی تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے۔

الدعاء مخ العبادۃ (جامع ترمذی)

(دعا عبادت کا مغز ہے)

یعنی جس طرح انسانی جسم میں مغز کو اصل حیثیت حاصل ہے، اسی طرح عبادت میں دعا کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ کسی جان دار کے سر سے مغز نکال لیا جائے تو اس کی زندگی ختم ہوجاتی ہے، ٹھیک اسی طرح اگر عبادات سے دعا کا حصہ خارج کر دیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

مولانا محی الدین لکھوی اللہ تعالیٰ سے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے۔ ان کی دعا کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ اللہ سے مانگ رہے ہیں، وہ اللہ سے لے کر ہی رہیں گے اور واقعہ یہ ہے کہ اللہ ان کی دعا قبول فرماتا تھا۔ رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ انسان اللہ سے مانگتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ خالی نہیں لٹاتا۔ لا یردھما صفرا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے ہمیشہ ان کی دعا قبول فرمائی اور جو کچھ انھوں نے اپنے لیے اور لوگوں کے لیے مانگا، اللہ نے عطا فرمایا۔

انھوں نے ذی الحجہ 1390ھ (فروری 1971ء) میں چھوٹے سائز کے چار صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جو مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ اس کا موضوع دعا کی ''فضیلت وترغیب'' ہے۔ قارئین کرام کے لیے یہ پمفلٹ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ پہلے انھوں نے مختصر الفاظ میں دعا کی فضیلت تحریر فرمائی ہے، اس کے بعد ایک نہایت اہم دعا درج کی ہے۔ یہ دعا زبانی یاد کرنی چاہیے اور ہمیشہ پڑھنی چاہیے۔

مولانا لکھتے ہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فضیلت وترغیب

1۔ حضرت نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا

الدعاء هو العبادة

دعا ہی عبادت ہے

پھر آپ ﷺ نے یہ آیۂ مبارکہ پڑھی

وقال ربكم ادعونى استجب لكم

اور تمھارے رب نے فرمایا مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔

2۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ليس شيئ اكرم على الله من الدعاء

اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی چیز دعا سے بڑھ کر قابلِ قدر نہیں

3۔ نیز فرمایا

لا يرد القضاء الا الدعاء

سوائے دعا کے کوئی چیز تقدیر کو پلٹ نہیں سکتی

4۔ فرمایا

من لم يسأل الله يغضب عليه

جو شخص اللہ سے نہ مانگے تو اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے

5۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يستحب الجوامع من الدعاء (الحديث)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جامع دعاؤں کو پسند فرماتے تھے۔

دعا یہ ہے

اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمة امری و اصلح لی دنیای التی فیھا معاشی و اصلح لی آخرتی التی فیھا معادی واجعل الحیوة زیادة لی فی کل خیر واجعل الموت راحة لی من کل شر

ترجمہ:

اے اللہ درست کردے میرے لیے میرا دین جو میرے کام کا بچاؤ ہے اور درست کردے میرے لیے میری دنیا جس میں میری زندگی ہے اور درست کردے میرے لیے میری آخرت جہاں میری واپسی ہے اور زندگی کو میرے لیے ہر نیکی میں اضافے کا سبب بنادے اور موت کو میرے لیے ہر برائی سے باعث راحت بنادے۔

دعا کی قبولیت کے اوقات ومقامات

مولانا محی الدین لکھوی احادیث پاک کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ حسب ذیل سات اوقات ومقامات میں دعا قبول ہوتی ہے۔

1۔ سحری کے وقت

2۔ فرض نماز کے بعد

3۔ نفلی نماز کے بعد

4۔ سجدہ میں

5۔ التحیات میں درود شریف کے بعد

6۔ اذان کے بعد

7۔ جب بارش ہورہی ہو

(الحدیث)

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خلوص قلب کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی جائے تو وہ خوش ہوتا اور دعا کرنے والے کی دعا قبول فرماتا ہے۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ اس سے کچھ مانگا جائے تو ناگواری کا اظہار کرتا اور مانگنے والے کو جھڑک دیتا ہے، لیکن اس کے بالکل برعکس اللہ سے جتنا زیادہ مانگا جائے اور جتنی دفعہ مانگا جائے وہ اتنا ہی خوش ہوتا اور مانگنے والے کو دیتا ہے۔ جو شخص اس سے نہیں مانگتا، اس پر خفگی کا اظہار فرماتا ہے۔

مولانا لکھوی کے بہت سے عقیدت مند اکثر وبیشتر ان سے دعا کی درخواست کرتے تو مولانا موصوف کی عادت تھی کہ بالعموم فوراً ہاتھ اٹھاتے اور دعا فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مستجاب الدعوات بنایا تھا، اور ان کی دعائیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتا تھا۔ اس بات کے گواہ ان کے اکثر عقیدت مند ہیں۔ بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

✪ حاجی محمد ادریس بھٹی صاحب (جو کہ اوکاڑہ شہر کے رہنے والے ہیں اور وہاں کے ایک معروف کاروباری ادارے پاک ٹینٹ سروس / میرج ہال کے مالک ہیں) نے ڈاکٹر محمد حماد لکھوی سے بیان کیا کہ میری جوانی کے ایام میں میرے والد صاحب کا ہمارے محلے کے ایک شخص سے جھگڑا ہوگیا۔ میرے والد صاحب نے بھینسوں کا گوبر اکٹھا کرنے والا لکڑی کا ''پھوڑا'' اس کے سر پر دے مارا، جس پر وہ وہیں ڈھیر ہوگیا اور میرے والد صاحب کے ساتھ مجھ پر بھی قتل کا مقدمہ درج کرادیا گیا اور ہم دونوں باپ بیٹے کو ساہیوال جیل بھیج دیا گیا۔ ہمارے مقدمے کی پیروی کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

ایک دن میں نے خواب میں مولانا محی الدین لکھوی کو دیکھا کہ وہ جیل میں آئے ہیں اور مجھے بازو سے پکڑ کر کہا کہ ادریس چلو باہر تم یہاں جیل میں کیوں بیٹھے ہو؟ اگلے دن ہماری تاریخ تھی۔ میں نے صبح اٹھ کر خواب کا ذکر اپنے والد صاحب سے کیا، انھوں نے کہا

لگتا ہے تمھاری ضمانت ہو جائے گی۔ وہی بات ہوئی، جب عدالت لگی تو میری ضمانت پر رہائی ہوگئی۔ گھر آنے پر میری والدہ صاحبہ نے بتایا کہ وہ کل قلعہ تارا سنگھ گئی تھیں اور مولانا محی الدین لکھوی سے تمھاری رہائی کے لیے دعا کرائی تھی۔

✪ یہی حاجی محمد ادریس بھٹی بیان کرتے ہیں کہ ہم ہر معاملے میں مولانا لکھوی سے یا ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی سے رہنمائی لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ رہنمائی خالصتاً روحانی نوعیت کی ہوتی۔ ایک دن میں اوکاڑہ سے لاہور جانے کے لیے بس پر سوار ہوا۔ بس ابھی اوکاڑہ کے جنرل بس سٹینڈ پر کھڑی تھی اور بہت رش تھا۔ میں بس میں کھڑکی والی سائیڈ پر بیٹھا تھا۔ اچانک کھڑکی سے باہر میں نے مولانا محی الدین لکھوی کو کھڑے دیکھا اور انھوں نے مجھے کھڑکی سے السلام علیکم کہا۔ میں نے وعلیکم السلام کہا اور احتراماً جلدی سے اپنی سیٹ سے اٹھا اور رش میں سے ہوتا ہوا بڑی مشکل سے بس سے نیچے اترا۔ دروازہ بس کے بائیں جانب ہوتا ہے اور مولانا موصوف بس کے دائیں جانب نظر آئے تھے۔ میں جلدی سے بس کے گرد چکر کاٹتا ہوا دائیں طرف آیا لیکن وہاں مولانا صاحب موجود نہیں تھے۔ میں بہت حیران اور پریشان ہوا کہ یہ کیا ہوا؟ میں نے خود ان کو دیکھا، ان کا سلام سنا اور جواب بھی دیا۔ لیکن اب اتنی جلدی وہ کدھر غائب ہو گئے؟ میرے اس تحیر و پریشانی کے دوران بس روانہ ہوگئی اور میں اسی حیرانی میں پچھلی بس پر سوار ہوگیا۔ بس چلی اور راستے میں ایک جگہ سڑک پر رش کی وجہ سے رک گئی۔ دیکھا کہ پہلے والی بس کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے اور میں نے خود دیکھا کہ جس سیٹ پر میں سوار تھا عین اس سیٹ پر بیٹھنے والا شخص فوت ہو چکا ہے۔

✪ مولانا سیف الرحمان الفلاح (مرحوم) نے ڈاکٹر محمد حماد لکھوی سے بیان کیا اور اپنے ایک مضمون میں بھی ذکر کیا کہ میرے لیے سکول میں معلّمی کا مسئلہ تھا اور کسی طور پر حل نہ ہو رہا تھا۔ میں مولانا محی الدین لکھوی کو سفارش کے لیے ساتھ لے کر سکول گیا۔ (ان

دنوں اوکاڑہ ضلع ساہیوال میں ہوتا تھا)۔ میرا خیال تھا مولانا اور ان کے خاندان کا بڑا نام ہے وہ ضلع کے بڑے افسر سے بات کر کے ملازمت دلا دیں گے۔ لیکن مولانا صاحب نے محکمہ تعلیم کے ضلعی افسر کے دفتر کے سامنے پہنچ کر مجھے کہا کہ آپ دفتر کے اندر جائیں اور افسر سے اپنی ملازمت کی بات کریں۔ میں دفتر کے باہر ہی ٹھہرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں، ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس پر بڑا تعجب ہوا کہ میں اب کیا کروں، لیکن حسب الحکم میں اندر چلا گیا اور مولانا دعا میں مصروف ہو گئے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور میری ملازمت کے آرڈر مجھے مل گئے۔



چوبیسواں باب

قبولیتِ دعا، ایفائے عہد، کرامات

مولانا محی الدین لکھوی کے علم وعمل اور تقویٰ وصالحیت کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے کیا جاچکا ہے۔ ان کے آباؤاجداد کے حالات بھی خوانندگانِ محترم کے علم میں آچکے ہیں۔ ان میں سے ہر بزرگ پیکرِ حسنات اور مجسمۂ خیر تھے۔ درس وتدریس ان کا شب وروز کا مشغلہ اور وعظ وتبلیغ ان کا وتیرۂ زندگی تھا۔ دنیوی حرص وآز سے ان کا ذہن خالی اور فکر آخرت ان کا پیمانۂ سوچ تھا۔ خلوص ان کا سرمایۂ حیات اور یادِ الٰہی ان کا مقصد زیست۔ لوگ ان کو اللہ کے اولیا گردانتے اور انھیں مستجاب الدعوات سمجھ کر ان سے دعا کراتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے ان کی دعاؤں کو شرفِ قبول حاصل ہوتا تھا۔ ان کے اخلاف میں سے مولانا محی الدین لکھوی کو اللہ تعالیٰ نے علم سے بھی نوازا، عمل کی دولت بھی انھیں عطا فرمائی اور قبولیت دعا کا اعزاز بھی ان کے حصے میں آیا۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

✪ قیام پاکستان سے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کوٹ رادھا کشن (ضلع قصور) سے ان کے گھر (الہ آباد) آیا اور اپنی بیوی کی الم ناک داستان سنائی۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ مولانا اسی وقت اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو واقعی اس کی بیوی درد سے تڑپ رہی تھی۔ مولانا نے اللہ سے دعا کی اور ایک زبردست چیخ کے ساتھ اس کے پیٹ سے کتے کی

سری جیسی کوئی چیز باہر آئی اور اسے سکون ہوگیا۔ مولانا نے اس کے شوہر کو حقِ زوجیت کی ادائیگی کے وقت کی وہ دعا بتائی جس کے پڑھنے کی نبی ﷺ نے تلقین فرمائی ہے اور واپس تشریف لے آئے۔ ❶

✪ صوبہ سندھ کے ایک شخص نے بیان کیا کہ ہمارے علاقے میں چاروں طرف کڑوا پانی تھا۔ میٹھے پانی کے لیے لوگوں کو دور دراز جانا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا محی الدین لکھوی ہمارے گوٹھ (گاؤں) تشریف لے گئے۔ وعظ کے بعد جانے لگے تو ہم نے درخواست کی کہ کسی جگہ کسی سے تھوڑی سی مٹی نکال دیں تاکہ ہم وہاں میٹھے پانی کے حصول کے لیے نلکا لگوائیں۔ آپ نے اللہ کا نام لے کر گاؤں کے قریب ایک جگہ پر کسی سے تھوڑی سی مٹی نکالی اور ہم نے وہاں نلکا لگوالیا۔ اس پر طویل عرصہ گزر چکا ہے، الحمد للہ وہاں سے میٹھا پانی نکل رہا ہے اور پورا علاقہ اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ❷

✪ ایک شخص مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کی بیوی شدید دردِ زہ میں مبتلا تھی اور گھر کے سب لوگ سخت پریشان تھے۔ مولانا نے اس کی بات سن کر دو رکعت نفل ادا کیے اور اللہ سے دعا کی۔ فرمایا: گھبراؤ نہیں خاتون کو ہسپتال لے جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ان شاء اللہ گھر ہی میں ولادت ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی طرح ہوا، جس طرح کہ مولانا نے فرمایا تھا۔

✪ پنجابی کے ایک شاعر مولوی شہاب الدین ثاقب زیروی تھے جو تحصیل زیرہ ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب کے رہنے والے تھے۔ وہ اچھے واعظ بھی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ضلع قصور کے ایک قصبے "واں رادھا رام" آبسے تھے، جسے اب حبیب آباد کہا جاتا ہے۔ ان کے صاحب زادے مسعود احمد ثاقب (پیپلز کالونی نورانی روڈ، ثاقب شریعت منزل آباد) ملتان میں سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے 2۔ دسمبر 2000ء کو مولانا محی الدین لکھوی کے صاحب زادۂ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی کو خط لکھا کہ ایک مرتبہ مولانا ممدوح ان

---

❶ اخبار "الاعتصام" (لاہور) 27۔ مارچ 1998ء (صفحہ 26) مضمون مولانا عبدالجبار سلفی

❷ ایضاً

کے گھرواں رادھا رام تشریف لائے۔ میرے گلے میں تعویذ ڈالا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر فرمایا: یہ تعویذ کیوں ڈالا ہے؟ والد مرحوم (مولانا شہاب الدین ثاقب نے) کہا یہ لڑکا رات کو ڈرتا ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنے دست مبارک سے تعویذ اتارا اور فرمایا: اسے کسی جگہ چھپا دو۔ اس کے بعد دم کیا۔ مسعود احمد ثاقب کہتے ہیں کہ اس دم کے بعد انھیں کبھی ڈر نہیں لگا۔ اسے وہ مولانا مرحوم کی کرامت قرار دیتے ہیں۔

✪ سید محمد اسحاق شاہ بخاری (عربی مدرس گورنمنٹ ہائی سکول دیپال پور) کا مولانا کے صاحب زادے پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی کے نام تحریر کردہ ایک خط پیش نگاہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''مولانا محی الدین لکھوی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ جو میری حاضری میں پیش آیا، وہ یہ ہے کہ کنگن پور کے علاقے میں مولانا مرحوم تبلیغ کے لیے گئے۔ آپ کی تقریر سننے کے بعد ایک شخص نے کہا: حضرت! میرے گھر میں کیڑے مکوڑے بہت ہیں جو ہمیں تنگ کرتے ہیں۔ آپ نے اس شخص کے گھر جا کر ایک کیڑا پکڑا۔ نامعلوم آپ نے اس کو کیا کہا اور پھر چھوڑ دیا۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے، کیڑوں کا گروہ وہاں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ یہ تھی آپ کی کرامت جو کہ دیکھنے میں آئی۔ میرے نزدیک بلکہ دورِ حاضر کے لوگوں کے نزدیک وہ ایک کامل ولی اللہ تھے۔''

✪ مولانا ممدوح جہاں جانے کا وعدہ کر لیتے، وہاں ہر حالت میں پہنچتے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ کے لیے کہیں جانے کا وعدہ کیا۔ وہاں جانے کا وقت ہوا تو سخت آندھی آئی اور بارش بھی شروع ہو گئی۔ وہ لوگ ان کے استقبال کے لیے بس سٹینڈ پر آئے۔ کافی دیر انتظار کیا۔ پھر یہ خیال کر کے کہ وہ بارش اور آندھی کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے، واپس گھروں کو چلے گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد مولانا بارش سے بھیگتے ہوئے پیدل ہی وہاں پہنچے اور سیدھے مسجد میں گئے۔ لوگوں کو ان کی تشریف آوری کا پتا چلا تو ان کی مسجد میں آمد شروع ہو گئی۔ اس واقعہ کے راوی پروفیسر محمد حمود لکھوی ان کے ساتھ تھے۔ یہاں بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ مولانا جو وعدہ کرتے، اس پر پورا اترتے۔ بارش یا آندھی کوئی بھی چیز ان کے

ایفائے عہد میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ اس وصف کے علما اب کہاں ہوں گے۔

✪ دریا کے کٹاؤ کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ جو مولانا محی الدین لکھوی کا ایک خادم اعجاز احمد ساکن کنگن پور بیان کرتا ہے، اس طرح ہے۔ دریائے ستلج کے کنارے ہندوستان کی سرحد سے تین کلومیٹر دور اور کنگن پور سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں دایا سنگھ ہے۔ وہاں 1986ء میں دریا کا کٹاؤ شروع ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ دریا گاؤں سے صرف ایک کلومیٹر دور رہ گیا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کٹاؤ گاؤں کے بالکل قریب آ گیا۔ دریا کے پانی کی وجہ سے چند قبروں کے سوا سارا قبرستان ختم ہوگیا۔ گاؤں کے چند گھر بھی دریا نے گرا دیے۔ لوگوں نے گاؤں کی طرف آنے والے دریا کے پانی کو روکنے کے لیے بڑے بڑے پیروں اور فقیروں کو بلایا لیکن وہ سب دور کھڑے تماشہ دیکھتے رہے اور کسی کے کسی عمل کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اس گاؤں میں ایک شخص مولانا رحمت اللہ ڈوگر رہتے تھے جو مولانا محی الدین لکھوی کے مرید تھے۔ وہ مولانا کی خدمت میں گئے اور ان سے صورتِ حال بیان کی۔ اب مولانا ان کے ساتھ دایا سنگھ کو روانہ ہوئے اور نمازِ ظہر کے قریب وہاں پہنچے۔ ظہر کی نماز پڑھی اور پھر دریا کی طرف گئے۔ تمام گاؤں کے لوگ مولانا کے ساتھ جا رہے تھے۔ اس وقت دریا کے کٹاؤ والی دراڑ چار پانچ سوفٹ میں پھیلی ہوئی تھی۔ مولانا نے یہ دراڑ عبور کی اور دریا کی طرف گئے۔ جو لوگ وہاں کھڑے تھے اور مولانا کو اس حالت میں دیکھ رہے تھے، وہ سخت پریشان تھے اور صاف لفظوں میں کہہ رہے تھے کہ یہ ڈوب جائیں گے۔ کیا انھیں اپنی جان کی فکر نہیں ہے۔

مولانا نے دریا کے کنارے جہاں پانی چل رہا تھا، جا کر آرام سے دو رکعت نفل نماز پڑھی اور دعا کی۔ سب لوگ دور کھڑے ان کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ دعا کے بعد مولانا واپس آ گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ دعا کے کچھ دیر بعد کٹاؤ رک گیا۔ مولانا دو دن وہاں رہے۔ اللہ نے فضل کیا۔ اس کے بعد کسی کا دریا کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اعجاز احمد

کے بقول آج بھی وہ دراڑ موجود ہے اور دریاب ہندوستان کی طرف گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر چلا گیا ہے۔ ❶

✪ اب مولانا محی الدین لکھوی کی قبولیتِ دعا سے متعلق ایک اور واقعہ سنیے جو ہمارے ایک مرحوم دوست مولانا محمد اکبر سلیم (ناظم مرکز ابن الخطاب الہ آباد (ٹھینگ موڑ) ضلع قصور) نے سنایا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ پانچ سال کے بچے تھے اور اپنے گاؤں (ٹھینگ موڑ) میں (جسے اب الہ آباد کہا جاتا ہے) ناظرہ قرآن مجید پڑھتے تھے۔ اور بھی کئی بچے ان کے ساتھ قرآن پڑھتے تھے۔ ان بچوں کا امتحان لینے کے لیے مولانا محی الدین لکھوی کو بلایا گیا، مولانا سے کسی نے کہا اس بچے کے لیے دعا فرمایے کہ اللہ اسے عالم بنائے اور اس کا مستقبل بہتر ہو اور یہ کتاب وسنت کی خدمت کرے۔ مولانا نے دعا کی اور اکبر سلیم کی طرف دیکھ کر فرمایا: یہ بڑا ہو کر اللہ کے دین کی خدمت کرے گا۔ (اکبر سلیم تو اس وقت بچے تھے، انھیں تو اس واقعہ اور دعا کا علم نہیں۔ ان کو کچھ عرصہ پیشتر یہ واقعہ وہاں کے ایک بزرگ نے سنایا جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ یہی اکبر سلیم کچھ بڑے ہوئے تو انھوں نے دینیات کی مروّجہ کتابیں پڑھیں اور بی۔ اے تک عصری تعلیم حاصل کی۔ پھر ایک وقت آیا کہ انھوں ٹھینگ موڑ (موجودہ الہ آباد) کے باہر چونیاں روڈ پر اچھی خاصی جگہ خریدی اور وہاں مرکز ابن الخطاب کے نام سے درس گاہ قائم کی، جس میں طلبا کو دینیات کے ساتھ ساتھ پہلی جماعت سے بی اے تک عصری تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ آبادی سے باہر کھلی فضا میں یہ بہت اچھی جگہ ہے، جس میں خاصی تعداد میں طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں اور دس بارہ اساتذہ انھیں تعلیم دینے پر مامور ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے شہر الہ آباد میں لڑکیوں کے سکول بھی جاری کیے جن میں سیکڑوں لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اس

❶ مقالہ بہ سلسلہ مولانا محی الدین لکھوی۔ از مطیع اللہ باجوہ، صفحہ 48۔

خدمتِ علم اور خدمت دین کو مولانا محمد اکبر سلیم، مولانا محی الدین لکھوی کی اس دعا کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو انھوں نے ان کے بچپن کے زمانے میں ناظرہ قرآن کا امتحان لیتے وقت کی تھی۔

یہ وہ چند واقعات ہیں، جو ہمارے علم میں آئے۔ معلوم نہیں اور کتنے واقعات ہوں گے جن کا ہمیں پتا نہیں چلا۔ ان واقعات کو مولانا محی الدین لکھوی کی کرامتیں بھی کہا جا سکتا ہے اور قبولیتِ دعا سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے محدود علم کے مطابق وہ اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انھوں نے اپنے ہاتھ یا زبان سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ وہ ابتدائی زندگی سے ہی کتاب وسنت پر عامل تھے، اور بفضل خدا آخر زندگی تک عامل رہے۔



پچیسواں باب

مولانا لکھوی رحمہ اللہ کے مبایع عارف جاوید محمدی کی تحریر

مولانا عارف جاوید محمدی کا آبائی وطن قلعہ دیدار سنگھ (ضلع گوجرانوالا) ہے اور تاریخ ولادت ہے یکم اپریل 1953ء۔ تحصیل علم کے بعد 1978ء میں وہ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض چلے گئے تھے۔ ابتدائی زندگی سے ہی اصحابِ علم کی خدمت میں حاضر ہونے، ان کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کے مواعظ سننے کا شوق رکھتے تھے۔ یہی شوق انھیں قیام ریاض کے زمانے میں وہاں کی مختلف مسجدوں اور تعلیمی اداروں میں لے جاتا۔ پھر جلد ہی ان کا تعارف ان پاکستانی اور ہندوستانی علمائے کرام سے ہوگیا جو وہاں قیام پذیر تھے یا ہندوستان اور پاکستان سے کسی سلسلے میں وہاں ان کی آمدورفت رہتی تھی۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ دسمبر 1980ء میں کویت پہنچ گئے۔ وہاں برصغیر کے بہت سے بلادو امصار کے اصحابِ علم سکونت پذیر ہیں، جن میں مدینہ یونیورسٹی، جامعہ ام القری مکہ مکرمہ اور دیگر تدریسی اداروں کے فارغ التحصیل حضرات سکونت فرما ہیں اور دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان سب نے مل کر دسمبر 1981ء میں ''جمعیت احیاء التراث الاسلامی'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے ذریعے وہاں دینی خدمات سرانجام دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جولائی 2008ء میں مجھے ان حضرات کی دعوت پر کویت جانے اور ان پاکستانی اور ہندوستانی اصحابِ علم سے ملنے اور ان کی خدماتِ گوناگوں سے مطلع ہونے کا موقع ملا۔ نومبر 2011ء میں بھی مجھے ان کا دعوت نامہ آیا، ویزا اور ٹکٹ بھی موصول ہوگیا۔ لیکن میں ایک حادثے کی

زد میں آ گیا اور دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی، اس لیے نہ جا سکا۔ عرض دراصل یہ کرنا ہے کہ مولانا عارف جاوید محمدی علماء سے قلبی تعلق رکھتے ہیں اور مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ بیعت میں شامل ہیں۔ آئندہ سطور میں مولانا سے متعلق ان کی ایک تحریر پڑھیے جو انھوں نے میرے نام بھیجی۔ یہ تحریر بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بچپن میں ہی مخدومنا حضرت مولانا محی الدین لکھوی علیہ الرحمہ کا اسم گرامی بعض بزرگوں سے سنا۔ ان کے تقویٰ، پرہیزگاری، للّٰہیت، نماز میں خشوع اور وعظ میں تاثیر کے واقعات سنے تو دل میں مولانا کی زیارت کا شوق ابھرا۔ 1969ء کی گرمیوں میں پتا چلا کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ جامع مسجد شاد باغ لاہور میں خطبہ جمعہ کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ والدہ صاحبہ مرحومہ ومغفورہ کی اجازت سے میں لاہور گیا۔ مولانا کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی۔

مولانا کے دو چھوٹے بیٹے بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ میں نے ان کے نام پوچھے تو فرمایا ایک کا نام حمود اور دوسرے کا نام حماد ہے۔

نماز مغرب کے بعد احاطہ تھانیدار کی مسجد نجم میں مولانا نے درس دیا اور کھانا بھی جو کسی کے گھر سے آیا وہیں کھایا۔

وہاں سے مولانا چینیاں والی مسجد چلے گئے اور رات وہیں رہے، میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ فجر سے پہلے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مولانا تہجد کی نماز ادا کر رہے ہیں۔

نماز فجر کی جماعت مولانا نے کرائی اور دونوں رکعتوں میں سورہ طور پڑھی۔ آج بھی میرے کانوں میں ان کے پڑھنے کی آواز آ رہی ہے۔ جہاں عذاب کا ذکر آتا اللہ سے پناہ مانگتے اور جنت کے ذکر پر سوال کرتے۔ میں نے ایسی نماز زندگی میں پہلی مرتبہ پڑھی جس کا مجھ پر ایک عرصے تک اثر رہا۔

فجر کے بعد حضرت کا درس سنا اور وہیں علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا سے اجازت لے کر واپس اپنے گھر قلعہ دیدار سنگھ آ گیا۔ اس سے کچھ

عرصہ بعد مرکزی مسجد اہل حدیث قلعہ دیدار سنگھ کی انتظامیہ نے مولانا سے خطبہ جمعہ کا وقت لیا مگر جمعے سے قبل ہی مولانا کا خط آ گیا، جس میں انھوں نے کسی وجہ سے وہاں آنے سے معذرت کی تھی۔ حضرت کی عادت تھی کہ اگر کسی وجہ سے کسی جگہ وعدے پر نہ جا سکتے تو بذریعہ خط اطلاع دے دیا کرتے تھے۔

قلعہ دیدار سنگھ کے لوگوں کو مولانا کے نہ آنے کا بہت افسوس ہوا۔ چنانچہ راقم کے خالو حاجی بشیر احمد کو مولانا کے پاس ان کے گاؤں بھیجا گیا تا کہ مولانا سے خطبہ جمعہ کا وعدہ لائیں۔ مولانا کچھ دنوں کے بعد اکیلے ہی جمعرات کو تشریف لے آئے۔ ہم کئی نوجوان مولانا کے قریب بیٹھے تھے لیکن مولانا مجلس میں زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ کسی نے سوال کیا تو مختصر جواب دیتے۔ زیادہ تر ان کی زبان ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتی۔

ان کے ایک معتقد ہمارے ہاں رہتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک شخص نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ زیادہ گفتگو نہیں کرتے حالاں کہ علمائے کرام کی مجالس تو عموماً بڑی گرم ہوتی ہیں۔ جواب میں مولانا نے پنجابی کا شعر پڑھا۔

سرورِ عالم چُپاں وٹیاں حاجت باجھ نہ بولے

تھوڑے لفظ تے معنے بُہتے دانشمنداں تولے

یعنی نبی ﷺ زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ صرف ضرورت کی بات کرتے تھے۔ بات بھی ایسی جس کے الفاظ کم ہوتے اور ان میں جو معنے پوشیدہ ہیں وہ زیادہ ہوتے۔

اُس دور میں لمبے لمبے القاب والے اشتہارات نہیں ہوتے تھے۔ مسجد کے بلیک بورڈ پر خطیب کا نام اور خطبے کا موضوع چاک سے لکھ دیا جاتا تھا۔ مولانا کے نام کے ساتھ ''بقیۃ السلف'' لکھا ہوا تھا۔ مولانا نے جیب سے رومال نکال کر لفظ ''بقیۃ السلف'' مٹا دیا۔ سبحان اللہ ریا اور دکھاوے سے کتنی نفرت تھی۔ قلعہ دیدار سنگھ کے قریب اگو چک میں مولانا کے مرید رہتے ہیں۔ وہ مولانا کو رات اپنے پاس لے گئے۔ میں بھی وہاں گیا اور نماز فجر کے بعد درس قرآن میں شرکت کی۔

درس کے بعد بہت سے لوگوں نے مولانا لکھوی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ میں بھی ان کی بیعت سے مشرف ہوا۔ بیعت لیتے وقت مولانا نے مجھ سے پوچھا بیٹا، نماز کا ترجمہ آتا ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا نماز سوچ سمجھ کر پڑھا کرو اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اللہ کا ذکر کیا کرو۔ اس کے بعد میں کئی مرتبہ مولانا لکھوی سے ملنے ان کے گاؤں گیا، جس کا نام انھوں نے الہ آباد رکھا تھا اور وہ گاؤں دیپال پور کے قریب ہے۔ مولانا لکھوی سے میں بہت متاثر ہوا۔ ان کی عبادت گزاری اور نماز میں خشوع وخضوع کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔

ڈی کام کرنے کے بعد میں (1971ء کے آخر میں) دعا اور مشورے کے لیے مولانا لکھوی کی خدمت میں گیا۔ انھوں نے دعا بھی کی اور نصیحت بھی فرمائی کہ بینک کی ملازمت کے علاوہ جو ملازمت ملے کر لینا۔ ان شاء اللہ ملازمت مل جائے گی۔ میں جن صاحب کے ہاں ٹھہرا تھا، ان سے ملازمت کے بارے میں بات کی تو وہ مجھے ہائی وے کے محکمے کے ایک بڑے افیسر کے پاس لے گئے، جنھیں عاصمی صاحب کہا جاتا تھا۔ انھوں نے زور دار الفاظ میں ان سے کہا کہ اس نوجوان کے لیے ملازمت کا ہر صورت میں انتظام کیا جائے۔ عاصمی صاحب کا تعلق تبلیغی جماعت سے تھا۔ وہ بہت نیک اور ہمدرد آدمی تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا: آپ کل سے ملازم ہیں۔ ڈیوٹی پر آجائیں۔ یہ مولانا محی الدین لکھوی کی دعا کے فوراً بعد 1972ء کے شروع کی بات ہے۔ چناں چہ میں نے ہائی وے میں ملازمت کر لی۔

لاہور کے گردونواح میں اگر کہیں مولانا آتے اور مجھے پتا چل جاتا تو زیارت کے لیے پہنچ جاتا۔ مولانا کا خطبہ سننے اور ان کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا کتنی دیر تک طبیعت پر اثر رہتا۔

میں ان سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ ان کی وفات کے بعد میں نے حضرت حافظ محمد یحییٰ عزیز میرمحمدی کی بیعت کی اور اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور عبدالرحمٰن کی بھی حضرت حافظ محمد یحییٰ عزیز میرمحمدی علیہ الرحمہ سے بیعت کرائی، یہ ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے، جس پر ہم اللہ تعالیٰ کا انتہائی شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس قسم کے اہل اللہ کے ساتھ ہمیں تعلق

قائم کرنے کی توفیق بخشی۔

میں نے ایک دفعہ مخدومی حضرت حافظ محمد یحییٰ میر محمدی سے پوچھا کہ آپ نے کن بزرگ کی بیعت کی تو انھوں نے بتایا کہ میں نے مولانا محی الدین لکھوی کی بیعت کی تھی۔

حضرت حافظ صاحب مولانا محی الدین لکھوی علیہ الرحمۃ کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے اور مولانا بھی حافظ صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔

فروری 2006ء میں ہندوستان کے بزرگ عالم، مجاہدِ آزادی، مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم بستوی کویت تشریف لائے۔ انھوں نے دوران گفتگو بتایا کہ انھوں نے مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری مصنف تحفۃ الاحوذی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے چھوٹے بیٹوں محمد شفیع اور قاسم کو مولانا عبدالقیوم بستوی کے حلقۂ بیعت میں داخل کرادیا تاکہ ان کا تعلق بھی صاحبِ تحفۃ الاحوذی علیہ الرحمۃ سے ہو جائے۔ مولانا عبدالرؤف رحمانی نے مجھے بتایا کہ میں اور میرے والد صاحب اور ہمارے علاقے کے اکثر لوگ مولانا عبدالرحمان مبارک پوری سے بیعت تھے۔ مولانا مبارک پوری وقتاً فوقتاً ہمارے علاقے کا دورہ کرتے، تبلیغ بھی فرماتے اور لوگوں کے جھگڑوں کے فیصلے بھی کرتے۔

مولانا رحمانی نے بتایا کہ لوگ مولانا کا انتظار کرتے، یہاں تک کہ بعض اوقات قتل کے کیس کا فیصلہ بھی مولانا مبارک پوری سے کراتے۔ یہ تھے ہمارے اسلاف اور ان کا احترام!

ایک مرتبہ میں گرمیوں کے موسم میں مولانا محی الدین لکھوی کے گاؤں ''الہ آباد'' نماز ظہر سے کافی دیر بعد پہنچا۔ مسجد سے ملحق کمرہ تھا جس میں مہمانوں کے لیے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں ایک اور شخص بھی وہاں آ گیا۔ میں نے ان سے پوچھا آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کہا میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ سخت گرمی ہے۔ میں نے سوچا یہاں آرام بھی کرلیں گے اور کھانا بھی مل جائے گا۔

کچھ دیر کے بعد مولانا کا خادم آیا اور پوچھا کتنے مہمان ہیں؟ ہم نے کہا دو۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد تندور کی گرم گرم روٹیاں اور لسی وغیرہ آگئیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اور ان کے گھر والے مہمانوں کی کتنی خدمت کرتے تھے کہ بے وقت مہمانوں کو بھی کھانا مل جاتا۔ کافی دیر کے بعد مولانا تشریف لائے۔ سیدھے مسجد میں آئے۔ وضو کیا اور دو رکعت نفل ادا کیے۔

میں نے مولانا سے ملاقات کی تو بہت خوش ہوئے۔ مغرب کی نماز کے بعد مولانا خود میرے لیے گھر سے کھانا لائے۔

نمازِ فجر کے بعد میں نے پوچھا حضرت آپ نے کہاں جمعہ پڑھانا ہے؟ انھوں نے کنگن پور کے قریب ایک گاؤں کا نام لیا، میں بھی ناشتے کے بعد وہاں سے چل پڑا اور اذان جمعہ سے قبل ہی گاؤں پہنچ گیا۔ حضرت مولانا بھی وہاں پہنچ گئے۔

نماز کے بعد مولانا نے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ میں نے اجازت لی اور واپس آ گیا۔

اس طرح 1978ء سے پہلے کئی مرتبہ مولانا کے پاس گیا۔

مولانا کا خطبہ اور درس اگر کوئی لکھنا چاہتا تو لکھ سکتا تھا۔ میں نے مولانا کے کئی خطبے اور درس بڑی آسانی سے لکھے تھے۔ نہایت آرام سے بولتے تھے۔ غالباً 1980ء میں قلعہ دیدار سنگھ میں ایک جلسے میں خطاب کے لیے تشریف لائے۔ جلسے کے منتظمین نے مقامی علمائے کرام کی تقاریر کا سلسلہ شروع کرایا جو رات بارہ بجے تک جاری رہا۔ میں مولانا کے پاس سٹیج پر بیٹھا تھا۔

رات 12 بجے مولانا کو دعوت خطاب دی گئی۔ حضرت نے مختصر خطاب کے بعد فرمایا کہ بھائیو اب نصف رات ہو چکی ہے۔ یہ خطاب کا وقت نہیں، عبادت کا وقت ہے۔ چند مختصر باتیں کر کے خطاب ختم کیا، مگر ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے منتظمین کے اس رویے سے ازحد افسوس ہوا۔ میں مولانا کو اپنے ساتھ لے آیا اور مرکزی مسجد اہلِ حدیث میں نمازِ فجر مولانا نے پڑھائی اور ''سورۃ ق'' کا ترجمہ اور مختصر شرح نہایت پُر اثر انداز میں بیان کی۔

دورانِ درس مولانا نے پنجابی کا ایک شعر پڑھا جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔

کچھ خبر نہیں جو کتنی صدیاں گزرن اندر گوراں

پھر روز قیامت سر پر سہنا سال پنجاہ ہزاراں

یعنی کوئی پتا نہیں کہ قبروں میں کتنی صدیاں گزریں گی۔ پھر قیامت کا ایک دن جو پچاس ہزار سال کا ہوگا، وہ بھی گزارنا پڑے گا۔

اس کے بعد بھی مولانا سے ایک دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ان کے خطاب اور درس میں فکرِ آخرت اور نماز میں خشوع وخضوع کی تلقین کی جاتی تھی۔ مخدومی المکرّم مولانا محمد اسحاق بھٹی دامت برکاتہم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ حضرت مولانا کے حالات زندگی لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔

فون پر انھوں نے جب مجھے بتایا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اب ان شاء اللہ حضرت مولانا لکھوی کے حالات محفوظ ہو جائیں گے جو لوگوں کے لیے مشعل راہ ہوں گے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس اہم خدمت پر بھٹی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آمین

مولانا عارف جاوید محمدی کی اس تحریر سے پتا چلتا ہے کہ ضلع گوجراں والا کے مختلف مقامات (قلعہ دیدار سنگھ اور اگو چک وغیرہ) میں مولانا کے عقیدت مند کافی تعداد میں تھے۔ لوگ ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوتے اور ان سے دعا کراتے تھے۔ اپنے دور کے علمائے اہل حدیث میں مولانا محی الدین لکھوی کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان سے لوگ بے حد تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔

وہ شیریں کلام واعظ تھے اور قرآن کے فرمان ادع الیٰ سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة پر عمل پیرا تھے۔ یعنی لوگوں کو حکیمانہ اور ناصحانہ انداز میں نیکی کی تبلیغ فرماتے تھے۔ اگر کبھی کہیں کسی معاملے میں جھگڑے کی بات بھی ہوتی تو وہ اس ارشادِ خداوندی پر عمل کرتے کہ جادلهم بالتي هي احسن (ان سے خوب صورت انداز میں بحث کرو)

اصل مبلغِ دین وہی ہے جو نرمی اور تحمل سے لوگوں کو احکام اسلام سکھاتا اور برائی سے روکتا

ہے۔ جو شخص تفہیمِ دین اور تبلیغ اسلام کے سلسلے میں میٹھا بول نہیں بول سکتا، اسے صحیح مبلغ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مبلغ کو حالات کا جائزہ لینا چاہیے اور لوگوں کے مزاج کو دیکھنا چاہیے۔ مولانا محی الدین لکھوی اس صفت سے متصف تھے۔

مولانا عارف جاوید محمدی کی اس تحریر سے مولانا محی الدین لکھوی کی حیاتِ طیبہ کے بہت سے واقعات کا ہمیں علم ہو جاتا ہے اور ان کے طریقِ گفتگو اور اسلوبِ وعظ و تبلیغ کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ ان کا قرآن پڑھنے کا کیا انداز تھا۔



چھبیسواں باب

ایک اور عقیدت مند مبایع کا مکتوب گرامی

گزشتہ باب میں مولانا عارف جاوید محمدی (مقیم کویت) کی تحریر خوانندگان محترم نے پڑھی، جس میں انھوں نے نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ مولانا محی الدین لکھوی کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے ان کی بیعت کی، ان سے ملازمت کے لیے دعا کرائی جو اللہ نے جلد ہی قبول فرمائی اور انھیں ملازمت مل گئی۔ ان کے ساتھ وہ لاہور کی بعض مسجدوں میں گئے اور ضلع گوجرانوالا کے بعض مقامات میں بھی ان کے ہم رکاب رہے۔ ان کے درسِ قرآن سے اثر پذیر ہوئے۔ یہ تحریر انھوں نے اس فقیر کے نام یہ اطلاع پا کر بھیجی کہ میں ان کے حالات زندگی لکھ رہا ہوں۔

اب ایک خط مولوی قمر دین (ساکن چک نمبر 41 کھڈیاں ضلع قصور) کا ملاحظہ فرمایے۔ یہ خط بھی دلچسپ ہے اور مولانا محی الدین لکھوی کے کوائف حیات کے مختلف گوشوں کا وضاحت کناں ہے۔ انھوں نے مولانا موصوف کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کے مواعظِ حسنہ سنے اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوئے۔ یہ دونوں تحریریں چوں کہ مولانا کی بیعت سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے دو ابواب میں یہاں درج کی گئی ہیں۔ ان کی وفات کے بعد متعدد حضرات نے جو تعزیتی خطوط ان کے صاحب زادوں پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود اور پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی کے نام ارسال فرمائے وہ بھی ان شاء اللہ درجِ کتاب ہوں گے اور قارئینِ کرام کے مطالعہ میں آئیں گے۔ اب مولوی قمر الدین کا مکتوب پڑھیے۔

02-11-2000 بسم اللہ الرحمن الرحیم

''میری حضرت صاحب سے پہلی ملاقات بھوئے آصل (ضلع قصور) میں ہوئی۔ پھر میں نے ان سے جمعۃ المبارک کے خطبے کا وعدہ لیا۔ میں اس وقت 16 چک اختر آباد میں رہائش پذیر تھا۔ آپ نے حسبِ وعدہ جمعۃ المبارک کا خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں آپ نے پردے کے موضوع پر وعظ کیا۔ آپ کی تقریر کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ میں نے اسی دن گھر جا کر پردے کا حکم دیا۔ میرے سب گھر والے میری اس بات پر حیران ہو گئے۔ وہ کہنے لگے ہم بڑی مدت سے اس گاؤں میں رہ رہے ہیں، کبھی پردہ نہیں کیا۔ (اب کس طرح پردہ کریں) لیکن میں نے اپنی بات ماننے پر انھیں مجبور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت دیر تک میری بیوی میکے میں رہی۔ لیکن میں نے کہا کہ اگر پردے کی پابندی کی تو میں اسے لاؤں گا۔ آخر کار انھیں میری بات پر رضامند ہونا پڑا۔ اس دن کے بعد جہاں بھی حضرت کا خطبہ جمعہ یا جلسہ ہوتا میں وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا۔

ایک دفعہ میں نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا کہ حضرت صاحب کی زیارت کرنے چلیں۔ اس وقت آپ ''کھرلاں والا کھوہ'' پر مقیم تھے۔ ہم بڑی مشکل سے وہاں پہنچے۔ کیوں کہ سواری وغیرہ کی بہت دقت ہوتی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ مولانا صاحب اوکاڑہ چلے گئے ہیں۔ پھر ہم تینوں ساتھی حجرہ شاہ مقیم آئے۔ وہاں رات گزاری۔ وہاں میرے ساتھیوں نے کہا کہ اب کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کہ میں تو حضرت سے مل کر ہی جاؤں گا۔ کیوں کہ میں نے آپ کی بیعت کرنا ہے۔ پھر ہم اوکاڑہ گئے۔ وہاں سے پتا چلا کہ آپ اپنے گاؤں قلعہ تارا سنگھ چلے گئے ہیں۔ ہم تارا سنگھ گئے۔ وہاں مولانا صاحب سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ ہم نے کہا کہ ہم نے آپ کی بیعت کرنا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے سعودی عرب جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہاں کبھی آپ آئیں گے تو بیعت کر لیں گے۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا آپ چلے جائیں، میں تو بیعت کر کے آؤں گا۔

میں وہاں بیٹھ گیا۔ جب مولوی صاحب کو پتا چلا کہ وہ نہیں جا رہا تو وہ مجھے قلعہ تارا سنگھ گنبد والی مسجد میں لے گئے اور میں نے ان کی بیعت کی۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں جلسہ تھا۔ جلسے والے دن مجھے بہت ضروری کام پڑ گیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ مولوی صاحب کی تقریر نہیں سن سکوں گا۔ مجھے ''جہانیاں منڈی'' جانا تھا۔ میں نے وہاں ایک مسجد میں جمعۃ المبارک کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد اعلان کیا گیا کہ کل یہاں حضرت مولانا محی الدین لکھوی تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے جلسے میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ جب میں صبح مسجد پہنچا تو حضرت صاحب پہلے ہی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کہ کہنے لگے کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ جب آپ بعد نماز عشاء خطاب فرما رہے تھے تو دوران خطاب مولوی حکیم عبداللہ روڑی والے کھڑے ہو گئے اور آپ کا کُرتا پکڑ کر کہنے لگے کہ لوگو! ہم چاہتے ہیں کہ اس قسم کے علماء حضرات کو اقتدار میں آنا چاہیے۔ وہاں لوگوں پر ان کے وعظ کا بہت اثر ہوا۔ اس کے بعد میں نے آپ کو سولہ چک اختر آباد آنے کی دعوت دی۔ آپ وہاں تشریف لائے اور تقریر کی۔ گاؤں کے لوگ آپ کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد لوگ آپ کو ایک اور گاؤں میں لے گئے۔ بہت سے لوگوں نے وہاں آپ کی بیعت کی۔ جب آپ رات کو جانے لگے تو ہم نے کہا کہ کچھ تعاون وغیرہ کر دیتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہاں کے غریب لوگوں سے تعاون کرو، مجھ سے تعاون کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد میں نے چک 41 ضلع قصور میں رہائش اختیار کر لی۔ میں نے آپ کو وہاں آنے پر آمادہ کیا۔ آپ تشریف لائے۔ آپ نے بعد نماز عشاء خطاب فرمایا۔ رات کو مولوی صاحب نے مسجد ہی میں قیام کیا۔ وہاں ان کے ساتھ میرا بیٹا عبدالرحمٰن اور ایک دوسرے ساتھی خوشی محمد آپ کے ہمراہ رات مسجد میں رہے۔ رات کو آندھی آئی اور بارش بھی ہوئی۔ اچانک مسجد کے کنوئیں میں کتا گر گیا۔ آپ خود اٹھے اور کنوئیں میں دیکھا کہ کتا گرا ہوا ہے۔ آپ نے میرے بیٹے عبدالرحمٰن سے کہا کہ گھر سے چوکی وغیرہ لاؤ۔ وہ چوکی لایا۔ آپ نے اپنے

ہاتھ سے اس میں رسہ ڈالا اور کتے کو باہر نکالا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔

ایک دفعہ اتفاقاً کھڈیاں خاص جلسہ تھا۔ میں اور مولوی صاحب بھی وہاں گئے۔ وہاں مولوی محمد یوسف راجووال والے تقریر کر رہے تھے۔ ہم وہاں عام آدمیوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہ تقریر میں کہہ رہے تھے کہ میں حیران ہوں کہ لکھوی خاندان مدینہ منورہ تک کیسے پہنچ گیا ہے۔ انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں نے ایک دن مولانا محمد علی صاحب اور مولانا محی الدین صاحب دونوں باپ بیٹے کی دعوت کی۔ ان حضرات کے آنے کی خوشی میں میرے گھر والے سالن میں مرچیں ڈالنا بھول گئے۔ جب کھانا پیش کیا گیا تو آپ نے بڑے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ سالن میں مرچیں نہیں ڈالی گئیں۔ ہمیں بہت افسوس ہوا اور مولانا صاحب کے پاس جا کر معافی مانگی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے کوئی اعتراض کیا تھا؟ اس بات سے پتا چلا کہ ان حضرات کا مقام بہت بلند ہے۔

ایک دفعہ ڈھولن ہٹھاڑ جلسہ تھا۔ جلسے کے بعد وہاں کے میزبان نے اعلان کیا کہ جو لوگ موٹے چاول کھانا چاہتے ہیں وہ ایک طرف ہو جائیں اور جو روٹی کھانا چاہتے ہیں وہ دوسری طرف ہو جائیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں بھی چاول کھا لیتا ہوں۔ آپ نے عوام کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ آپ کے لیے حلوہ اور اچھا سا کھانا لایا گیا جو آپ نے دوسرے لوگوں کو دے دیا اور خود چاولوں پر ہی اکتفا کیا۔

بُگّی ہٹھاڑ جہاں میری بیٹی کی شادی ہوئی ہے، وہاں کے لوگ آپ کے متعلق مجھے بتا رہے تھے کہ ایک دفعہ مولوی صاحب یہاں آئے۔ واپسی پر ان کا گزر ایک ایسے راستے سے ہوا جہاں پہلوان کشتی لڑنے کے لیے نیم عریاں کھڑے تھے۔ مولوی صاحب انھیں دیکھ کر دور جانے لگے۔ یہاں تک کہ آپ دوڑنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ اتنا تیز کیوں چل رہے ہیں تو جواب دیا کہ یہاں اللہ کا عذاب آنے والا ہے، اس لیے میں دور بھاگ رہا ہوں۔ اس سے تھوڑی دیر بعد کشتی میں ایک پہلوان کی گھٹنے کے اوپر کیٹا ٹنگ ٹوٹ گئی۔

اللہ تعالیٰ مولوی صاحب پر کروڑوں رحمتیں نازل کرے اور ان کی قبر نور سے بھر دے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کے لیے صرف کردی۔ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ ان کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین۔

دعا گو

مولوی قمر دین

کھڈیاں چک 41 ضلع قصور



ستائیسواں باب

مولانا کے چند تلامذہ

تقسیمِ ملک سے قبل مولانا محی الدین لکھوی اپنے مسکن مرکز الاسلام میں طلباء کو پڑھاتے رہے۔ یہ طلباء دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو اردگرد کے دیہات سے صبح کو آتے، مولانا سے ترجمۂ قرآن یا حدیث کی کوئی کتاب یا صرف ونحو کی چھوٹی موٹی کتابیں پڑھتے اور شام کو واپس اپنے اپنے گاؤں چلے جاتے۔ دوسرے وہ جو دن رات مرکز الاسلام ہی رہتے اور مولانا سے استفادہ کرتے

تقسیمِ ملک کے بعد جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں بھی کچھ عرصہ وہ خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے۔

ان کا سلسلۂ تدریس ان دونوں مقامات تک ہی محدود رہا۔ انھوں نے اس طرح باقاعدگی سے ایک جگہ جم کر نہیں پڑھایا، جس طرح عام مدرسین پڑھاتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر مساعی وعظ وتقریر کی صورت میں لوگوں کی دینی اور عملی اصلاح تک محدود رہیں۔ اس سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا اور وہ ان سے بے حد فیض یاب ہوئے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو انھیں دیکھ کر اور یادِ الٰہی میں مشغول پا کر ہی صراطِ مستقیم پر قدم زن ہو گئے۔ بہر حال ان سے جن حضرات نے تعلیم حاصل کی، ان سب کا سراغ لگانا تو مشکل ہے، البتہ جن کا پتا چل سکا ہے، مولانا معین الدین لکھوی کے بقول وہ مندرجہ ذیل حضرات ہیں۔

1۔ قاری ریاض الحق

ان کا تعلق منڈی عثمان والا (ضلع قصور) سے تھا۔ وہاں ان کا مدرسہ بھی ہے، جس کے یہ مہتمم اور مدرس تھے۔ انھوں نے مولانا سے تعلیم حاصل کی، لیکن یہ پتا نہیں چلا کہ انھوں نے ان سے کیا پڑھا اور کس زمانے میں پڑھا اور کہاں پڑھا۔

2۔ میاں غلام رسول وٹو

یہ ایک زمیندار گھرانے کے زمیندار فرد تھے۔ نرم گفتار اور شیریں کلام۔ مرکز الاسلام کے قریب ان کا گاؤں تھا ٹاہلی والا۔ والد کا نام میاں محمد حیات تھا۔

روزانہ صبح کو اپنے گاؤں سے مرکز الاسلام آتے اور شام کو چلے جاتے۔ زمیندار خاندانوں میں عام طور سے جو بڑائی کا عنصر پایا جاتا ہے اور جو رسوم و عادات ان کے ذہنوں میں رچی بسی ہوتی ہیں، ان سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں میں اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ قیام مرکز الاسلام کے زمانے میں میرا ان سے، ان کے بھائیوں سے، ان کے والد اور خاندان کے دیگر افراد سے میل جول اور تعلق رہا تھا۔

تقسیمِ ہند کے بعد یہ لوگ اوکاڑہ کے قریب ایک گاؤں میں آ گئے تھے اور وہیں زمینیں الاٹ کرالی تھیں۔ میاں غلام رسول نے اوکاڑہ منڈی میں کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مولانا محی الدین لکھوی سے یہ عقیدت مندانہ اور شاگردانہ مراسم رکھتے تھے۔ ضلع اوکاڑہ کے ایک گاؤں (دیپال پور روڈ کے قریب) اپنی زمینوں میں ان کی رہائش تھی۔

بہت سال ہوئے ایک مرتبہ میں کسی کام سے مرکز الدعوۃ مرید کے گیا تو یہ بھی وہاں موجود تھے۔ نہایت احترام سے پیش آئے۔ پوچھا: آپ کہاں؟ بولے: میں الدعوۃ سے منسلک ہوں، اسی سلسلے میں اوکاڑہ سے یہاں آیا ہوں افسوس ہے مئی 2012ء میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

3۔ مولانا سیف الرحمٰن الفلاح

یہ بھی وٹو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور میاں غلام رسول کے قریبی رشتے دار تھے۔ تقسیم ملک سے قبل مرکز الاسلام سے قریب کے گاؤں ''ٹاہلی والا'' کے رہنے والے تھے۔ 1930ء میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ضلع اوکاڑہ کے ایک گاؤں چک نمبر 34۔ 2۔ایل میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ ان کا تذکرہ مولانا کی قبولیتِ دعا کے باب میں ہو چکا ہے۔ سرکاری ہائی سکول میں ملازمت کے لیے یہ مولانا کو ڈی۔ای۔او ساہی وال کے دفتر لے کر گئے تھے اور مولانا نے ان سے فرمایا تھا کہ تم اندر جا کر ڈی۔ای۔او سے بات کرو۔ میں تمھارے لیے باہر کھڑا دعا کرتا ہوں۔ فکر نہ کرو، تمھیں ملازمت مل جائے گی۔ چنانچہ ملازمت مل گئی۔

مولانا سے حصولِ علم کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''مولانا ومحترمنا میرے سب سے پہلے استاذ تھے، جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھایا اور دین سے لگاؤ پیدا کیا۔ اس دوران انھوں نے نہ مجھے مارا، نہ کبھی ڈانٹا اور نہ ناراض ہوئے۔ ہمیشہ محبت اور شفقت کا رویہ اختیار کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ مجھ سے محبت اور شفقت نہ کرتے تو شاید میں جہالت اور گم راہی کے گڑھے سے باہر نہ نکل پاتا۔''

مولانا سیف الرحمٰن الفلاح اچھے مقالہ نگار اور مصنف ومترجم بھی تھے۔ ان کے رشحاتِ قلم ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور دیگر جماعتی اخباروں میں چھپتے رہے۔ وہ ایک صالح اور نرم خو عالم دین تھے۔ انھوں نے 2000ء کے قریب چک نمبر 34۔ 2۔ایل ضلع اوکاڑہ میں وفات پائی۔

4۔ مولانا جمال الدین

مولانا محی الدین لکھوی کے تلامذہ کی فہرست میں مولانا جمال الدین کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ وہ 1926ء میں (سابق) ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں بیگووالا میں پیدا

ہوئے۔ اس کے بعد ایسے حالات ظہور میں آئے کہ ان کے والد جو دین سے محبت رکھنے والے بزرگ تھے، ضلع فیروز پور کی تحصیل فیروز پور کے ایک گاؤں ٹاہلی والا چلے گئے۔ وہاں سے غلام رسول، سیف الرحمٰن اور جمال الدین اکٹھے صبح کو مرکز الاسلام آتے اور مولانا محی الدین لکھوی سے تعلیم حاصل کرتے۔ شام کو واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔ اس طرح تین سال میں انھوں نے مولانا لکھوی سے قرآن مجید کا ترجمہ اور صرف ونحو کی چند کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں جمال الدین حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمت میں فیروز پور چلے گئے جن کا اس وقت مسجد گنبداں والی میں سلسلۂ درس جاری تھا۔ فیروز پور سے یہ امرتسر گئے اور مدرسہ غزنویہ میں داخلہ لیا۔ تقسیم ملک کے وقت اگست 1947ء میں وہ امرتسر میں تھے۔ مدرسے میں چھٹیاں ہوئیں تو اپنے گاؤں ٹاہلی والا گئے اور وہاں سے ایک قافلے کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوئے اور ضلع اوکاڑہ کے چک نمبر 34۔ 2۔ایل میں سکونت اختیار کی۔

پاکستان آنے کے کچھ عرصہ بعد تعلیم کا سلسلہ بند رہا۔ پھر اوکاڑہ میں اچانک مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے ملاقات ہوئی تو ان کے فرمان کے مطابق دوبارہ طالب علمی کی زندگی اختیار کر لی۔ پنجاب یونیورسٹی میں فاضل عربی کا امتحان دیا اور اچھے نمبروں میں کامیاب ہوئے۔ گکھڑ جا کر او۔ ٹی کیا اور سرکاری سکول میں ملازم ہو گئے۔

مولانا جمال الدین کا اچھا خاصا کتب خانہ تھا اور انھیں مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا۔ وہ نرم مزاج، ملنسار اور مہمان نواز عالم تھے۔ ساہی وال کے ایک ہائی سکول میں معلم تھے۔ ریٹائرمنٹ میں کچھ عرصہ باقی تھا کہ وہیں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ مجبوراً قبل ازوقت ریٹائرمنٹ لینا پڑی۔ چوں کہ یہ سکول ٹیچر تھے، اس لیے انھیں ماسٹر جمال الدین بھی کہا جاتا تھا۔

تحریرونگارش سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔ 23۔ستمبر 1994ء کو وفات پائی۔ مولانا معین الدین لکھوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بے شمار لوگ جنازے میں شریک تھے۔

بعدازاں میت کو ان کے گاؤں چک نمبر 34۔ 2۔ایل لایا گیا تو وہاں ان کے بچپن کے دوست مولانا سیف الرحمٰن الفلاح نے دوبارہ جنازہ پڑھایا۔ اس میں بھی لاتعداد لوگ شریک تھے۔ اس عالم دین کو ان کے گاؤں میں دفن کیا گیا۔ مولانا محی الدین لکھوی کے یہ شاگرد بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ استاذِ محترم کا ان پر خاص اثر تھا۔

5۔نور احمد (فوجی) ولد حاجی محمد رمضان

قلعہ تارا سنگھ کے رہائشی تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی مولانا سے پڑھا اور ابتدائی دینی تعلیم بھی انہی سے حاصل کی۔ ان کی تربیت سے ان میں پختہ دینی شعور پیدا ہوا۔ بعدازاں فوج میں بطور لانس نائیک بھرتی ہوگئے۔ آرمی ایجوکیشن کور سے ریٹائر ہوئے۔ سادہ مزاج، نیک طینت، کم گو اور صاحب تقویٰ شخص تھے۔ مولانا کی زندگی میں ان سے ملاقات کے لیے فوج کی نوکری کے دوران بھی باقاعدہ حاضر ہوتے رہے۔ بعدازاں قلعہ تارا سنگھ سے ترک سکونت کر گئے تھے۔ آج کل ضلع اوکاڑہ ہی کے کسی گاؤں میں سکونت پذیر ہیں۔

6۔ مولانا بشیر احمد

یہ تلونڈی ضلع قصور کے رہنے والے ہیں اور مولانا کے دعوتی کام میں ان کے مخلص ترین معاون رہے ہیں۔ مولانا کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے استاذ ومرشد کے مشن کو جاری رکھا۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ مولانا کے بچوں اور بچیوں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ کسی نے قرآن مجید ناظرہ پڑھا، کسی نے اس کا ترجمہ پڑھا۔ کسی نے حدیث کی کسی کتاب کا درس لیا، پھر دوسرے لوگوں نے بھی ان سے فیض حاصل کیا۔ اس طرح ان سے بے شمار لوگوں نے اللہ کے دین کے احکام سیکھے اور پھر آگے تدریس وتعلیم کا سلسلہ چلایا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مولانا محی الدین لکھوی اپنے دور کی جماعت علماء میں تنہا عالم تھے، جنھوں نے دیہات میں جا کر لوگوں کو دین کی تعلیم دی اور انھیں اللہ ورسول (ﷺ) کے ارشادات سے باخبر کرنے کی مہم شروع کی اور پھر تمام عمر اسی راہِ صفا میں صرف

کردی۔ انھوں نے وعظ وتلقین ہی کو کافی نہیں سمجھا، لوگوں کی عملی تربیت بھی کی۔ اس طرح لا تعداد لوگوں نے ان سے احکام دین سیکھے اور ان پر عمل کیا۔ وہ بار بار لوگوں کے پاس جاتے اور انھیں کتاب وسنت کی صاف ستھری تعلیم دیتے اور اس پر عمل کراتے۔ وہ علم برائے علم نہیں، بلکہ علم برائے عمل کے قائل تھے۔ ان کے شاگرد اور فیض یافتگان بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل ہوئے۔

مولانا محی الدین لکھوی اچھے خاصے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور صاحبِ ثروت بزرگ تھے، لیکن نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ تبلیغ دین کا بے پناہ جذبہ ان میں پایا جاتا تھا اور ہر موسم میں گاؤں گاؤں جا کر یہ فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ ان کے لیے یہ صدقہ جاریہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اس سعیِ مبارک کا یقیناً انھیں بہتر اجر عطا فرمائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔



اٹھائیسواں باب

مرکزی جمعیت اہل حدیث کی نائب امارت

24۔ جولائی 1948ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے جماعتِ اہل حدیث کی تنظیم کا قیام عمل میں آیا تو اس کے صدر بالاتفاق مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا تھا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اس نظم میں وسعت پیدا ہوئی تو مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق اس کے نائب صدر (بعد ازاں نائب امیر) مولانا خان مہدی زمان خاں رئیس کھلابٹ کو بنایا گیا۔ وہ صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) سے تعلق رکھتے تھے اور اس علاقے میں ان کا بہت اثر تھا۔ لیکن وہ کچھ مدت کے بعد اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس منصب سے علیحدہ ہوگئے تھے، تاہم وہ مجلس عاملہ کے رکن باقاعدہ رہے اور اپنے علاقے میں جماعت کی خدمت کو اپنا معمول بنائے رکھا۔

اس کے بعد 1959ء میں جب مرکزی جمعیت کے منصبِ صدارت کو امارت میں بدل دینے کی گفتگو شروع ہوئی تو اس کے متعلق آخری فیصلے کے لیے مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا گیا، جس میں طے پایا کہ آئندہ مرکزی جمعیت کے قائد کو "صدر" کے بجائے "امیر" کہا جائے گا اور ذیلی جمعیتوں کے صدروں پر بھی امیر کا اطلاق ہوگا۔ اسی اجلاس میں مولانا محی الدین لکھوی کو مرکزی جمعیتِ اہل حدیث مغربی پاکستان کا نائب امیر منتخب کیا گیا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ اسی مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کو 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور اسے بنگلہ دیش کی صورت میں الگ ملک بن جانے کے بعد "مرکزی جمعیت اہل

حدیث پاکستان'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات (16۔دسمبر 1963ء) سے ایک مہینا تین دن بعد (19۔جنوری 1964ء کو) نئے امیر کے انتخاب کے لیے مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تو اس کی امارت کی ذمہ داری متفقہ طور سے مولانا محمد اسماعیل سلفی کے سپرد ہوئی جو مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے عہد میں اس کے ناظم اعلیٰ تھے اور ان کی جگہ ناظم اعلیٰ مولانا غزنوی کے فرزند گرامی سید ابوبکر غزنوی کو بنایا گیا۔

اس وقت مرکزی جمعیت کے آئین میں دو نائب صدروں (یا نائب امیروں) کی گنجائش تھی، لیکن نائب امیر ایک ہی تھے اور وہ تھے مولانا محی الدین لکھوی۔ حاجی محمد اسحاق حنیف نے اسی مجلس شوریٰ (منعقدہ 19۔جنوری 1964ء) میں دوسرے نائب امیر کے لیے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے پوتے مولانا رضاء اللہ ثنائی کا نام پیش کیا، جسے بالاتفاق منظور کر لیا گیا۔ آئندہ سطور میں پہلے خان مہدی زمان خاں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ (مولانا محی الدین کے کوائف حیات تو اس کتاب میں بالتفصیل بیان کیے ہی جا رہے ہیں) اس کے بعد مولانا رضاء اللہ ثنائی کا تعارف کرایا جائے گا۔

مولانا خان مہدی زمان کی زیارت کا شرف مجھے 1948ء کے آخر میں حاصل ہوا، جب میں مرکزی جمعیت کا آفس سیکرٹری تھا، لمبا قد، بدن کی ساخت بہت اچھی نہ موٹے نہ دبلے پتلے، سرخی مائل گندمی رنگ، کچھ ابھری ہوئی تیکھی ناک، موٹی آنکھیں، کھلی پیشانی، سر پر قراقلی ٹوپی، سفید شلوار اور قمیص پر گرم کوٹ پہنے ہوئے۔ نہایت متحمل مزاج، سب سے گرم جوشی سے ملتے۔ پہلی ملاقات کے بعد جلد ہی مجھ سے مشفقانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ میں نے کبھی انھیں کسی بات پر قہقہہ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کوئی ہنسنے کی بات ہوتی تو مسکرانے پر اکتفا کرتے۔ نماز خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ جب بھی دفتر تشریف لاتے خوش کلامی سے پیش آتے۔ زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہ تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ خاموش بیٹھے رہتے تھے، ضرورت کے وقت بڑی وضاحت سے بات کرتے، پنجابی بھی صفائی سے

بولتے اور اردو بھی۔!

ان کا تعلق سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت مجاہدین سے تھا۔ جماعت مجاہدین کا پہلا قافلہ انھی کے علاقے سے گزرا تھا اور وہاں سکھوں کی فوج سے مجاہدین کا مقابلہ بھی ہوا تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک دفعہ بتایا کہ وہ 1930ء میں سخت بیمار ہوگئے تھے اور ہر وقت بخار میں مبتلا رہتے تھے۔ ڈاکٹروں نے چندروز کے لیے کسی ٹھنڈے مقام پر جانے کا مشورہ دیا تو استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی انھیں خان مہدی زمان کے ہاں کھلابٹ لے گئے۔ وہاں ایک ڈاکٹر سے علاج ہونے لگا، لیکن بخار نہیں اترا۔ ایک دن مولانا مہدی زمان خاں انھیں اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کو سیر کے لیے ایک ایسے مقام میں لے گئے جو پہاڑ سے بہت نشیب میں تھا۔ انھوں نے بتایا کہ مجاہدین کا اولیں قافلہ یہاں سے گزرا تھا اور یہیں ان کی سکھ فوج سے پہلی جنگ ہوئی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی فرماتے ہیں کہ خاں صاحب موصوف کی یہ بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھا کر اپنی صحت یابی کے لیے دعا مانگی۔ دعا کے بعد مجھے احساس ہوا کہ بخار اتر گیا ہے۔ اب ڈاکٹر کے پاس آئے تو انھوں نے نبض دیکھی اور کہا بخار نہیں اترا۔ میں نے کہا میں پہاڑ پر سے آیا ہوں، اس لیے سانس کچھ پھولا ہوا ہے، لیکن مجھے بخار نہیں ہے۔ چند منٹ کے بعد آپ دوبارہ نبض دیکھیں۔ چنانچہ پانچ چھے منٹ کے بعد نبض دیکھی تو بخار واقعی اتر گیا تھا اور میں تندرست تھا۔

مولانا مہدی زمان خاں دینیات کے عالم تھے اور گریجویشن انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کی تھی۔ آزادیِ ملک کے سلسلے میں کانگرس، تحریکِ خلافت اور جمعیت علمائے ہند سے منسلک رہے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ 1932ء میں مجلسِ احرار میں شرکت کی۔ پہلی سیاسی جماعتوں کی طرح مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے بھی جیل جانا ضروری تھا، چنانچہ وہ احرار رہنماؤں کے ساتھ جیل گئے اور قید کاٹی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید محمد داؤد

غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی سے نہایت قریبی تعلقات تھے اور آزادیِ وطن کے سلسلے میں انہی کے ہم رکاب رہے تھے۔

کسی زمانے میں لارنس گارڈن میں ہر سال پھلوں کی نمائش کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ خان مہدی زمان خاں اس نمائش میں اپنے باغ کے سنگترے اور سیب وغیرہ لایا کرتے تھے۔ شام کے وقت کسی دن ہم بھی اپنے بعض دوستوں کے ساتھ نمائش دیکھنے جاتے تو خاں صاحب ہمیں اپنے باغ کے سنگترے کھلاتے۔ چار پانچ ملازم ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

ایک دن وہ دوپہر کے وقت دفتر ''الاعتصام'' شیش محل روڈ تشریف لائے۔ یہ کھانے کا وقت تھا، میں نے پوچھا: خاں صاحب کیا کھانا پسند فرمائیں گے؟ ارشاد ہوا: سب سے اچھا بھینس کا گوشت ہے۔ دوسرے نمبر پر گائے کا، پھر دنبے کا اور اس کے بعد بکرے کا۔ ان میں سے جو مرضی منگوا لو۔ مرغ کا گوشت سب سے ردی ہے۔ وہ بالکل نہ منگوانا۔

وہ قریبی رشتے داری میں جنرل ایوب خاں کے ہم زلف تھے۔ ایک دفعہ بتایا کہ ایوب خاں کی بیگم ان پڑھ ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ ایوب خاں مختلف ملکوں کے دورے پر جاتا ہے، تم اس کے ساتھ ہوتی ہو، کسی کی کوئی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ تم وہاں کیا کرتی ہو؟

خان صاحب کی دور تک پھیلی ہوئی زمینیں تھیں۔ انھیں رئیس کھلابٹ کہا جاتا تھا۔ تربیلا ڈیم کی تباہی کے وقت ان کا قصبہ کھلابٹ بہت بڑے سیلاب کی زد میں آ گیا اور ان کی زمین، جائداد، گھر کا سامان سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اور وہ اپنے قریبی شہر ہری پور آ گئے اور وہاں کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ اس نقصان عظیم سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ بالآخر تقریباً پچاسی (85) برس کی عمر پا کر 13۔ ذیقعدہ 1394ھ (27۔ نومبر 1974ء) کو وفات پا گئے۔

وفات کے وقت ان کی اولاد میں ایک لڑکا عبدالعزیز خاں تھا جو فوج میں میجر تھا۔ دوسرے صاحب زادے عبدالحمید خاں تھے، جن کا شمار کراچی کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔

جماعت کے اس بہت بڑے خادم کا یہ مختصر سا تذکرہ ہے۔ ان سے متعلق بعض اور واقعات کا بھی مجھے علم ہے، لیکن میں اس سلسلے کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان (یعنی موجودہ پاکستان) کے دوسرے نائب امیر مولانا محی الدین لکھوی تھے، جنھیں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے دورِ امارت میں انہی کی تجویز سے مجلسِ شوریٰ نے منتخب کیا۔ یہاں ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ یہ پوری کتاب انہی کے آباواجداد اور ان کے ذاتی احوال وکوائف کی وضاحت کرتی ہے۔ لیکن افسوس ہے یہ بات حافظے نے محفوظ نہیں رکھی کہ وہ کتنا عرصہ اس منصب پر فائز رہے اور کب اور کیوں اس منصب سے الگ ہوئے۔ یہ البتہ حقیقت ہے کہ وہ مولانا غزنوی کی وفات (16۔دسمبر 1963ء) کے بعد مرکزی جمعیت کے نائب امیر تھے۔

مرکزی جمعیت کی ساتویں سالانہ کانفرنس 2۔3۔4 نومبر 1962ء کو مولوی عبدالعزیز سابق چیف جسٹس ریاست فرید کوٹ کے زیرِ صدارت لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس کے صدرِ استقبالیہ حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم تھے۔ مولوی عبدالعزیز کے علاوہ بعض دیگر حضرات نے بھی مختلف اجلاسوں کی صدارت کی تھی، جن میں مولانا عبدالرحمٰن ناظم جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان، میاں محمود علی قصوری بیرسٹرایٹ لا، شیخ رشید احمد اس وقت کے وزیر قانون واطلاعات مغربی پاکستان، میاں فضل حق اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی شامل تھے۔ ایک اجلاس کی صدارت مولانا محی الدین لکھوی نے فرمائی تھی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی، لکھوی اصحابِ علم سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس خاندان کے چھوٹوں پر شفقت فرماتے، معاصرین کا احترام کرتے اور ان کے بزرگوں کا نہایت تکریم سے تذکرہ فرماتے۔ مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین پر بالخصوص ان کی نگاہِ شفقت رہتی تھی۔ چنانچہ مولانا معین الدین لکھوی مرکزی جمعیت کی مجلس شوریٰ اور عاملہ کی رکنیت سے لے کر جمعیت کی ہر کمیٹی اور سب کمیٹی کے رکن تھے۔

مرکزی جمعیت کے آئین کی رو سے دو نائب امیروں کی گنجائش تھی، اس لیے 19۔جنوری 1964ء کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں جو مولانا داؤد غزنوی کی وفات سے ایک ماہ

مہینے بعد نئے امیر کے انتخاب کے لیے منعقد ہوا تھا، اس میں مولانا محی الدین لکھوی کے ساتھ مولانا رضاء اللہ ثنائی کو دوسرے نائب امیر کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا، جس پر وہ تاحینِ حیات متمکن رہے۔

مولانا رضاء اللہ ثنائی حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے بڑے پوتے تھے۔ مولانا امرتسری کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا اسم گرامی مولانا عطاء اللہ ثنائی تھا۔ اگست 1947ء کے فسادات کے زمانے میں وہ اپنے محلے کی امن کمیٹی کے ممبر تھے جو وہاں کے سرکردہ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ وہ امن کمیٹی کی طرف سے اپنے محلے کی ایک گلی میں پہرہ دے رہے تھے کہ کسی نے بم مار کر انھیں شہید کر دیا۔ سارا کاروبار اور ثنائی برقی پریس انھی کے سپرد تھا۔ بیٹے کی شہادت کے بعد مولانا ثناء اللہ صاحب اپنے اہل وعیال سمیت امرتسر سے مولانا داؤد غزنوی کے پاس چینیاں والی مسجد میں لاہور آ گئے تھے۔ لاہور سے مولانا محمد اسماعیل سلفی اور گوجراں والا کے لوگ انھیں گوجرانوالا لے گئے۔ گوجراں والا سے وہ سرگودھا چلے گئے۔ وہاں وہ ثنائی برقی پریس بھی لگانا چاہتے تھے اور اخبار ''اہل حدیث'' جاری کرنے کا منصوبہ بھی بنا رہے تھے، لیکن اس اثنا میں ان پر فالج کا حملہ ہو گیا، اور وہ 15۔ مارچ 1948ء کو وفات پا گئے۔

اپنے پوتے رضاء اللہ ثنائی کی انھوں نے بہتر انداز سے تربیت کی۔ دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ سے انھیں تعلیم دلائی۔ امرتسر میں اخبار ''اہل حدیث'' کی ترتیب اور مضامین کی اشاعت کے بارے میں ان کی رہنمائی فرمائی۔ فتوے لکھنے اور مختلف مسائل کے جواب دینے کا طریقہ سمجھایا۔

یہ چار بھائی تھے۔ رضاء اللہ، ذکاء اللہ، بہاء اللہ اور ضیاء اللہ۔ درمیان کے دو بھائیوں (ذکاء اللہ اور بہاء اللہ) کو ایک شقی القلب تھانیدار نے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ لوگوں نے اسے گھیرے میں لے کر پکڑا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس پر عدالت میں قتل کا مقدمہ چلنے لگا۔ اس اثنا میں مقدمے کے سلسلے میں پولیس اسے پشاور لے گئی۔ سرگودھا کا ایس پی اس کا

قریبی رشتے دار تھا۔ اس نے پولیس کو ہتھکڑی لگانے سے روک دیا اور وہ پشاور سے بھاگ کر قبائلی علاقے میں چلا گیا۔ کئی سال بعد گرفتار ہوا اور پھانسی کی سزا پائی۔

مولانا ثناء اللہ صاحب کا بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ اس زمانے میں سنا تھا کہ اس کتب خانے کی حفاظت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے چند سرکاری آدمیوں کو امرتسر بھیجا، لیکن ان کے آنے سے پہلے کتب خانہ ضائع ہو چکا تھا۔ اس کا مولانا ثناء اللہ صاحب کو بے حد افسوس تھا۔

بات مولانا کے پوتے مولانا رضاء اللہ ثنائی کی ہو رہی تھی، جنھیں مولانا محی الدین لکھوی کے ساتھ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب امیر بنایا گیا تھا۔ یہ سرگودھا میں کسی بیماری میں مبتلا ہوئے اور انھیں لاہور کے میو ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ وہیں 9۔ ربیع الثانی 1395ھ (21۔ اپریل 1975ء) کو فوت ہو گئے۔

اب مولانا امرتسری کے پڑپوتے مولانا عرفان اللہ ثنائی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے سرگرم رکن ہیں اور سرگودھا میں ثنائی کتب خانہ بھی انھوں نے قائم کر رکھا ہے اور حضرت مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

یہاں یہ بتاتے چلیں کہ مولانا محی الدین لکھوی کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے عہد امارت میں نائب امیر منتخب کیا گیا تھا اور مولانا رضاء اللہ ثنائی کو مولانا محمد اسماعیل کے دورِ امارت میں اس منصب پر فائز کیا گیا۔

مولانا رضاء اللہ ثنائی ملنسار اور خوش کلام عالم تھے۔ پورا قد، گداز جسم، سرخی مائل گورا رنگ، چوڑا چہرہ، موٹی آنکھیں۔ خوش لباس، سر پر قراقلی ٹوپی۔ اپنے جدِ امجد کی طرح سب سے خندہ پیشانی سے ملتے اور خیر و عافیت پوچھتے۔ میری جب بھی ان سے ملاقات ہوئی نہایت تپاک سے ملے۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف میں سے مولانا عرفان اللہ ثنائی کی ذات گرامی کو اس فقیر کے نزدیک بڑے احترام کا مقام حاصل ہے۔ ان سے ملاقات کا

موقع بہت کم ملتا ہے، لیکن جب بھی کہیں ان سے ملاقات ہوئی وہ گرم جوشی سے ملے۔ وہ حضرت مولانا امرتسری کی قابل قدر اولاد ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس گھرانے کے فوت شدگان کی مغفرت فرمائے اور زندوں کو دین و دنیا کی کامرانی سے نوازے۔



انتیسواں باب

حج بیت اللہ

اسلام پانچ ارکان پر مشتمل ہے۔ پہلا رکن کلمہ شہادت (یا توحید) ہے۔ دوسرا رکن نماز، تیسرا رکن زکوٰۃ، چوتھا روزہ اور پانچواں حج بیت اللہ ہے۔ حج کے لفظی معنے قصد اور ارادے کے ہیں، لیکن اصطلاح شریعت میں مکہ مکرمہ جانے، بیت اللہ شریف کا طواف کرنے، بیت اللہ کے ساتھ کی دو پہاڑیوں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے اور وہاں کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر ان چند اعمال و آداب بجا لانے کا نام ہے جن کا قرآن و حدیث میں حکم دیا گیا ہے۔

آج جہاں مکہ مکرمہ آباد ہے کم و بیش ساڑھے تین ہزار سال پہلے یہ دور تک پھیلا ہوا ایک بے آباد جنگل تھا، جہاں نہ پینے کو پانی میسر تھا۔ نہ کھانے کے لیے کوئی شے، یعنی وادیِ غیر ذی زرع اور بے آب و گیاہ صحرا۔ سب سے پہلے یہاں ایک کم سِن بچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اس کی والدہ حضرت ہاجرہ آئے۔ پھر حضرت اسماعیل کے پاؤں مارنے کی وجہ سے زمین سے پانی کا چشمہ ابلا، جو دنیا میں آبِ زم زم کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں ایک جھونپڑی بنی۔ جھونپڑی نے آہستہ آہستہ گاؤں کی شکل اختیار کی۔ پھر یہ مکہ مکرمہ کے نام سے ایک شہر بنا اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکزِ عبادت قرار پایا۔ اس طرح سرزمینِ حجاز میں

مدنیت و مذہبیت اس شکل میں جلوہ گر ہوئی کہ دنیا کے کسی خطے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

چودہ سو سال سے لے کر اب تک مکہ شہر کئی انقلابات سے گزرا۔ عارضی طور پر ایسے حالات بھی پیدا ہوئے کہ وہاں لوگوں کا حج کے لیے جانا مشکل ہوگیا۔ یورپ کی دوسری عالم گیر جنگ ستمبر 1939ء سے جون 1945ء تک چھے سال جاری، اس جنگ کے زمانے میں بھی حجاج کرام کو بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ہمارے ممدوح مولانا محی الدین لکھوی دیگر مسلمانوں کی طرح حجِ بیت اللہ کا دل میں بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ لوگ سمندری راستے سے سفر کرنے سے خوف محسوس کرتے تھے۔ عام تاثر یہ تھا کہ سمندر میں تارپیڈو یعنی سمندری مائنز بہ کثرت پھیلی ہوئی ہیں، جن کی وجہ سے جہاز کے خطرناک مراحل سے گزرنے کا ہر وقت خدشہ رہتا ہے۔ علاوہ ازیں بحری قزاق جگہ جگہ پھر رہے ہیں جو مسافروں کو لوٹتے اور ان سے ناروا سلوک کرتے ہیں۔

یہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ اس نے حاجیوں کے جہاز کی حفاظت کے لیے نہایت اچھا انتظام کیا۔ ایک جنگی جہاز سمندر میں اتارا جو مسافر بردار جہاز کے آگے آگے چلتا تھا اور دو اور جہاز مسافر بردار جہاز کے اردگرد چلتے تھے۔ یوں پوری حفاظت کے ساتھ حاجیوں کا یہ جہاز جدہ کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہوا۔ مولانا محی الدین لکھوی نے اس طرح یہ سفرِ حج طے کیا۔ ان کی والدہ محترمہ بھی اس بابرکت سفر میں ان کے ساتھ تھیں۔

یہ حج انھوں نے تقسیمِ ملک سے تقریباً ایک سال قبل 1946ء میں کیا۔ ظاہر ہے ان کے لیے یہ نہایت مسرت انگیز وقت تھا۔ ان دنوں ان کے والد مکرم حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدینہ منورہ میں سکونت فرما تھے۔ مولانا محی الدین اور ان کی والدہ کے لیے مدینہ شریف کا قیام اپنے گھر کے قیام کی مانند تھا۔

دوسرا حج

مولانا محی الدین لکھوی نے دوسرا حج اس سے پچاس سال بعد یعنی وفات سے دو سال قبل 1996ء میں کیا۔ اس وقت حجاج کے لیے سمندری سفر تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ہوائی جہاز پر سفر کیا جاتا تھا۔ اس مبارک سفر میں ان کی دوسری بیوی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ علاوہ ازیں مولانا کی چھوٹی بہن اور بہنوئی مولانا زین العابدین لکھوی اور ان کی بیٹی بھی ان کے ہم رکاب تھیں۔ اس طرح یہ پانچ افراد کا قافلہ تھا۔

اس وقت مولانا کی عرب والدہ کے بیٹے حسن اور حسین بہ سلسلۂ ملازمت جدہ میں مقیم تھے۔ اس قافلے کا اوّلیں قیام انھی کے گھر میں ہوا۔ اس سفر حج میں مولانا چھ مہینے ارضِ حجاز میں مقیم رہے۔ اور عبادت کے ساتھ ساتھ درس قرآن اور وعظ و نصیحت کا فریضہ بہ دستور انجام دیتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے جو لوگ وہاں سکونت پذیر ہیں وہ مولانا ممدوح کا درس بے حد غور اور انہماک سے سنتے تھے۔

مولانا کی پوری زندگی صالحیت کی فضاؤں اور نیکی کے ماحول میں گزری۔ ان کا سب سے اہم اور بنیادی کام درس قرآن اور لوگوں کی صحیح دینی تربیت کرنا تھا۔ وہ جہاں جاتے اس کام میں مصروف ہو جاتے۔ انھیں اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ کتنے لوگ ان کی بات سن رہے ہیں، دس آدمی ہوتے یا دس ہزار، وہ لوگوں کی تعداد سے بے نیاز ہو کر ہر جگہ اپنا سلسلۂ وعظ جاری رکھتے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

کتنے ہی مبلغوں کو ہم نے دیکھا کہ وہ حاضرین کی تعداد پر نگاہ رکھتے ہیں۔ تھوڑے مجمع میں تقریر کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ بعض حضرات صاف لفظوں میں کہہ بھی دیتے ہیں کہ مختصر مجمعے میں وہ تقریر کر ہی نہیں سکتے۔ انھیں اس وقت تقریر کرنے کا لطف آتا ہے، جب تاحدِ نگاہ لوگ ان کے سامنے بیٹھے ہوں اور دورانِ تقریر میں تحسینی نعرے گونج رہے ہوں۔

اس قسم کے لوگوں کو مقرر اور خطیب تو بے شک کہا جا سکتا ہے لیکن انھیں صحیح مبلغ اسلام کہنا مشکل ہے۔ مولانا محی الدین لکھوی کا ذہن اس زاویۂ فکر کے لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ہر موقعے پر اور ہر قسم کے مجمعے میں، وہ مختصر ہو یا زیادہ، اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام بیان کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ غفرہ اللہ تعالیٰ



تیسواں باب

تصنیفی خدمات

لکھوی خاندان میں حافظ بارک اللہ لکھوی اولیں بزرگ ہیں جنھوں نے ''لکھوی'' کی نسبت سے شہرت پائی اور روزانہ پیش آنے والے فقہی مسائل پر پنجابی اشعار میں ''انواع بارک اللہ'' کے نام سے کتاب لکھی جسے "نصاب الفقہ" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب ان کے دور میں بہت پڑھی گئی۔ اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔

ان کے فرزند گرامی حضرت حافظ محمد لکھوی جلیل القدر عالم اور عظیم المرتبت مفسر تھے۔ ان کے زمانے میں پنجابی شاعری کو بے حد اہمیت حاصل تھی، لہٰذا حالات کے مطابق انھوں نے پنجابی شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اور بہت سی اہم کتابیں تصنیف کیں جو پنجاب کے تقریباً ہر مسلمان گھر میں موجود تھیں اور نہایت شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ مساجد کے امام وخطیب وہ کتابیں اپنے شاگردوں کو باقاعدہ پڑھاتے تھے۔ حضرت حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ صحیح معنوں میں مصلح پنجاب تھے۔ ان کے حالات اور ان کی تصنیفی خدمات سے خوانندگان کرام اس کتاب کے تیسرے باب میں آگاہ ہو چکے ہیں۔

حضرت حافظ صاحب ممدوح کے صاحب زادۂ ذی مرتبت حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی تھے، وہ بھی صاحبِ تصنیف عالم تھے۔

ان کے بیٹے حضرت مولانا محمد علی لکھوی تھے، جن کے علم وعمل کی شہرت لکھو کی کے چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر مدینہ منورہ تک پہنچی اور انھیں 45 سال مسجد نبوی میں قرآن و

حدیث کا درس دینے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مسجد نبوی میں جن لوگوں نے حضرت مرحوم سے استفادہ کیا، ان کی وساطت سے اس عالم جلیل کی صدائے حق افریقہ اور عرب کے متعدد ممالک میں سنی گئی۔ حضرت مرحوم نے تحریری کام بھی کیا، لیکن بہت کم۔ ان کی سرگرمیوں کا اصل محور درس وتدریس ہی رہا۔

اب آیئے مولانا محی الدین لکھوی کی طرف! حافظ بارک اللہ سے لے کر لکھوی خاندان کی یہ پانچویں پشت میں آتے ہیں۔ ان کا مزاج وعظ وتذکیر کا تھا۔ ان کے سامعین زیادہ تر دیہات کے لوگ تھے جو ان کے مواعظِ حسنہ سے انتہائی متاثر ہوتے تھے۔ تحریر وکتابت سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اگر لکھتے تھے تو بہت اچھا لکھتے تھے اور اپنی بات کی خوب صورت اسلوب میں وضاحت فرماتے تھے۔ ان کی اردو نثر کی طبع شدہ چند صفحات کی جو تحریریں ہمارے علم میں آتی ہیں، ان میں سے ایک فضیلت دعاء ہے، جس کا باب نمبر 23 میں ''دعا اور اس کی فضیلت'' کے عنوان سے وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

1۔ نماز مترجم

پنجابی نثر میں بھی ان کی ایک کتاب ہمارے سامنے ہے۔ یہ چھوٹے سائز کے سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ہے نماز مترجم (پنجابی بولی وچ) یہ سورہ فاتحہ اور سورہ قل ھو اللہ سمیت ان دعاؤں کا پنجابی میں ترجمہ ہے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ ترجمہ عربی الفاظ کے نیچے لکھا گیا ہے۔ صفحہ اول یعنی ٹائیٹل پیج پر یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ [الروم:٣١]

نماز مترجم

(پنجابی بولی وچ)

ترجمہ

محی الدین بن محمد علی ساکن مرکز الاسلام لکھوکی ضلع فیروز پور۔

باہتمام منشی برکت علی مینجر انتخاب پریس واقع گنپت روڈ۔ لاہور۔
محی الدین پبلشر نے مرکز الاسلام لکھو کے۔۔۔ (آگے پڑھا نہیں جاتا)
19۔۔۔ (یہ بھی صرف اتنا ہی پڑھا جاتا ہے)

یہ ''نماز مترجم'' مجھے مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری (حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ) نے ارسال کی ہے جو تقسیم ملک سے پہلے کی چھپی ہے۔ لیکن کب چھپی؟ اس کا پتا نہیں چلتا۔ اس کے متعدد صفحات کے بہت سے الفاظ مٹ گئے ہیں۔

میں 1937ء میں (ایک سال) طالب علم کے طور پر مرکز الاسلام رہا۔ اس سال انھوں نے یہ کتاب نہیں لکھی۔ پھر 1938ء سے مارچ 1943ء تک پانچ سال میں وہاں سے غائب رہا لیکن اس اثنا میں میرا ان سے میل جول رہا۔ ممکن ہے اس زمانے میں یہ نماز مترجم لکھی اور چھاپی گئی ہو، پھر اپریل 1943ء سے تقسیمِ ملک تک تقریباً ساڑھے چار سال میرا قیام بہ طور مدرس مرکز الاسلام میں رہا۔ اس عرصے میں انھوں نے (میرے خیال کے مطابق) اردو یا پنجابی میں کوئی تحریری کام نہیں کیا۔ اس دور میں میرے دوست اور ساتھی معلم چودھری غلام حسین تہاڑیا بھی وہیں تھے۔ اگر ساڑھے چار سال کی اس مدت میں انھوں نے کوئی کتاب لکھی اور چھپوائی ہوتی تو ہمیں اس کا ضرور علم ہوتا۔ ہمارا سب کا ہر وقت کا ساتھ تھا اور ہم اکٹھے ہی وہاں رہتے تھے۔ مولانا معین الدین بھی وہیں تھے۔ ہم میں سے کوئی کہیں خط بھی لکھتا تو سب کو پتا چل جاتا۔ آٹھ دن کے بعد وہاں پوسٹ مین آتا تھا جو کہیں سے کسی کو بذریعہ ڈاک کچھ آتا وہ دے جاتا اور جو کچھ کسی نے بھیجنا ہوتا وہ لے جاتا۔

اب ان کی چند مختصر سی اردو تحریریں ملاحظہ ہوں جو مختلف مواقع پر شائع ہوئیں۔

1۔ دعوتِ عمل (سرورِ کائنات ﷺ کی ایک تنبیہ)

مشکوٰۃ شریف باب الامر بالمعروف ص 438 پر بروایت ترمذی: وابوداؤد مرفوع حدیث ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے انھیں روکا لیکن وہ باز نہ آئے۔ پھر وہی علماء ان کی مجالس میں

بیٹھنے لگے اور ان سے مل جل کر کھاتے پیتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل آپس میں ملا دیے، پھر ان پر لعنت کر دی حضرت داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان پر (علیٰ نبینا و علیهم السلام) **ذلك بما عصوا و كانوا يعتدون** (یہ لعنت ان کی نافرمانی اور زیادتی کی وجہ سے ہوئی) راوی نے کہا کہ حضور ﷺ تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، امر بالمعروف کرو یہاں تک کہ انھیں حق کی جانب موڑ دو۔ اور ایک روایت میں ہے، ہرگز نہیں! اللہ کی قسم تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور ظالم کے ہاتھ پکڑ لو اور حق قبول کرنے پر انھیں مجبور کر دو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے دل ایک جیسے کر دے گا، پھر تم پر لعنت کر دے گا جس طرح ان پر لعنت کی۔

شارح لکھتا ہے اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو تم ان کے ساتھ میل جول، گفتگو، کھانا پینا اور مجلس ترک کرو۔

اس حدیث شریف کی رو سے ہر مسلمان یگانہ و بیگانہ صاحبِ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی گناہ کے مرتکب کے ساتھ اگر وہ باز نہ آئے میل جول نہ رکھے، ورنہ عین ممکن ہے کہ اس کا دل بھی متاثر ہوگا اور آہستہ آہستہ دل سے گناہ کی نفرت نکل جائے گی جو بالآخر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا موجب ہوگی۔ معاذ اللہ۔

تمام خواص و عوام مطلع رہیں کہ میں آیندہ اس حدیث شریف پر عمل کی کوشش کروں گا۔ کسی ایسی مجلس، تقریب اور دعوت میں شریک نہ ہوں گا جس میں کوئی ایک شخص بھی منکر شرعی کا مرتکب ہو۔ نیز لڑکیوں کی دعوتِ نکاح اور ایسی دعوتِ ولیمہ جس میں مطبوعہ مزخرفہ مروّجہ دعوت نامے بھیجے گئے ہوں، شریک نہ ہوں گا۔ **و اللّٰه المستعان و عليه التكلان**۔

2۔ تعزیت یا تأذیت (پنجاب کی ایک ہمہ گیر بدعت)

مپندار سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت جز بر پےِ مصطفٰی

جوں جوں زمانۂ نبوت دور ہوتا گیا، جاہلی رسومات جنم لینے لگیں، اور لوگ وہ کام کرنے لگے، جن کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اسی قبیل سے رسمِ تعزیت ہے۔ اور حیرت انگیز حد تک نوبت

پہنچ چکی ہے۔غور کیجیے! (ایک دن) عین دوپہر کا وقت تھا۔گرمی اپنے شباب پر تھی کہ ایک بچہ دوڑا ہوا آیا کہ چند کارسوار آپ کو باہر بلا رہے ہیں اور جلدی مچا رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے قمیص پہنی باہر آیا۔ایک نوجوان کار سے باہر کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔''بزرگ آپ کی زیارت کے لیے تشریف لائے ہیں۔'' میں نے کہا! آئیے بزرگوں کو نیچے اتاریے۔کار سایہ میں کھڑی کرتے ہیں۔ بزرگوں کو ٹھنڈا پانی پلاتے ہیں۔سخت گرمی ہے۔نوجوان کہنے لگا۔ پانی وانی ہم پی کر آئے ہیں۔ بزرگ نیچے نہیں اتر سکتے، کیوں کہ وہ بہت کمزور ہیں۔ پیشاب کی تکلیف ہے۔ڈاکٹروں نے نالی لگائی ہے۔آپ کار کے اندر ہی ملاقات کرلیں۔ میں نے کھڑکی کے قریب ہوکر سلام کیا اور دریافت کیا کہ اس شدت کی گرمی اور علالت میں آپ نے کیوں تکلیف اٹھائی۔فرمایا: وفات کا سن کر آیا ہوں۔''اللہ دا حکم''۔ میں نے کہا ''الحمد للہ۔ ہم اللہ کے فیصلوں پر راضی ہیں۔لیکن آپ نے اس بیماری کی حالت میں کیوں تکلیف اٹھائی۔آپ گھر پر ہی متوفیہ کے لیے بخشش کی دعا کردیتے جس سے آپ کو فائدہ پہنچتا۔'' فرمانے لگے ''کوئی بات نہیں، اب میں اجازت لیتا ہوں۔'' چنانچہ غالباً دو منٹ کی ملاقات کے بعد بزرگ کار میں بیٹھے بیٹھے واپس ہوگئے۔ میں حیران ہوکر سوچتا رہا کہ یا الٰہی کیا یہ ضروری کام ہے کہ بمع ڈرائیور پانچ آدمی گرم دوپہر میں ایک بیمار نحیف ونزار بزرگ کو جو اٹھنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا صرف یہ کہنے کے لیے لائے ہیں کہ'' اللہ دا حکم''۔ اور مجھے معلوم ہے کہ ان کے پاس کار نہیں، وہ لازماً یا کرایہ پر لائے ہوں گے یا کسی دوست سے مانگ کر لائے ہوں گے۔کیا یہ کہنا واجب ہے یا سنت یا مستحب۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ جاہلیت کی رسم کیوں جو سراسر بدعت ہے،جس کا اسوۂ حسنہ میں کوئی نام نشان نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ممکن ہے کہ مدینہ شریف میں مقامی طور پر آپ ﷺ کسی کے گھر تعزیت کے لیے چلے گئے ہوں یا آپ کی موجودگی میں کسی صحابی کا انتقال ہوا ہوتو آپ نے انھیں صبر کی تلقین کی ہو، جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہے،لیکن تجہیز وتکفین اور نماز جنازہ کے بعد اہل میت کے گھر جمع ہونا اور کھانے کا اس طرح اہتمام کرنا کہ اس کو دیکھنے والا شادی کا سماں محسوس کرتا ہے، دور

دراز سے لوگ ''اللہ دا حکم'' کہنے کے لیے آتے ہیں، اور یہ سلسلہ تین دن کے لیے نہیں بلکہ ہفتوں تک جاری رہتا ہے اور اہلِ میت تنگ آ جاتے ہیں۔ البتہ یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ مہمانوں کی جبری مہمان نوازی کی مصیبت سے وہ پہلی مصیبت کو بھول جاتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن دل میں ضرور کہتے ہوں گے کہ یہ کیا مصیبت ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ بیاہ شادی بھی ہو تو ایک دو دن ہوتی ہے، پھر حالات معمول پر آ جاتے ہیں۔ لیکن یہ ''تعزیت'' ایسی ہے کہ شادی کو مات دیتی ہے۔ ایں چہ ابوالعجبی ست۔

3۔ صبح کی پہچان اور اذان:

فرمانِ باری تعالیٰ:

وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَ.
مِنَ الْفَجْرِ

[البقرۃ:۱۸۷]

ترجمہ: اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری سفید جُدی دھاری سیاہ سے فجر کے۔ (احسن التفاسیر)

تشریح: ایک اجالا آسمان پر صبح کاذب کا بہت رات سے ہو جاتا ہے۔ اس پر سحری کھانا بند نہیں ہوتا۔ یہ اجالا آسمان کے طول میں ایک لمبے ستون کی طرح ہوتا ہے۔ سحری کا کھانا صبح صادق پر بند ہوتا ہے جو آسمان کے کنارے پر آسمان کے عرض کی طرف پیدا ہوتی ہے۔ پھیلتی جاتی ہے، اور اونچی جگہ پر اس کی روشنی کا عکس پڑتا ہے اور اس میں کسی قدر سرخی بھی ہوتی ہے۔ (احسن التفاسیر)

مسند احمد: (حدیث نمبر۱۶۲۹۱) میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ فجر نہیں جو آسمانوں کے کناروں میں پھیلتی ہے بلکہ وہ سرخی والی اور کنارے کنارے ظاہر ہونے والی ہوتی ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔ ترمذی میں بھی یہ روایت ہے، اس میں ہے کہ اس پہلی فجر کو جو طلوع ہو کر اوپر کو چڑھتی ہے، دیکھ کر کھانے پینے سے نہ رکو بلکہ کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سرخ دھاری پیش ہو جائے۔ (حدیث حسن صحیح نمبر۷۰۵) ترمذی کی ایک اور صحیح حدیث

نمبر۲۰۶ میں صبح کاذب اور اذانِ بلال کو ایک ساتھ بھی بیان فرمایا گیا ہے۔(تفسیر محمدی اردو از مولانا محمد دہلوی جونا گڑھی)

حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح دو قسم کی ہے۔صبح صادق اور صبح کاذب۔صبح کاذب میں روزہ دار کے لیے کھانا حلال اور نمازی کے لیے نماز حرام۔اور جب صبح صادق ہوجائے تو روزہ دار کو کھانا حرام اور نمازی کے لیے نماز حلال۔اسی لیے رمضان المبارک میں آپ نے دو موذن مقرر فرمائے تھے۔سیدنا بلالؓ اور سیدنا عبداللہؓ بن ام مکتوم۔بلالؓ صبح کاذب میں اذان کہتے تھے اور اذان میں حی علی الصلاۃ بھی کہتے تھے۔فرمایا بلالؓ کی اذان تمھیں کھانے پینے سے نہ روکے، کیوں کہ اس وقت تھوڑی سی رات باقی ہوتی ہے اور جب عبداللہؓ اذان کہیں تو کھانے پینے سے رک جاؤ کیوں کہ وہ اذان اس وقت کہتے ہیں جب ان سے کہا جائے کہ اصبحت ،اصبحت۔صبح ہوگئی صبح ہوگئی۔نیز فرمایا صبح صادق کی اذان شروع ہوجائے اور تمھارے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا یا پانی کا پیالہ ہو تو اپنا کام کرلو۔

سبحان الذی جعل فی الامر سعة و الحمدللّٰہ

فرمان باری تعالیٰ ہے کہ لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ۔

اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو۔لیکن افسوس کہ امت مرحومہ افراط وتفریط کا شکار ہوگئی۔انا للہ۔۔۔۔۔

آج دیکھا دیکھی سحری کے وقت میں یعنی صبح کاذب میں بھی سحری بند کردی جاتی ہے اور اسے پرہیز گاری سمجھا جاتا ہے۔

صبح کے متعلق احادیث اور ان کا مفہوم

(1) قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم وقت صلوٰۃ الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس۔(مسلم:حدیث نمبر۱۳۸۸)

صبح کی نماز کا وقت طلوع فجر سے لے کر اس وقت تک ہے جب تک سورج نہ نکلے۔(مشکوہ شریف ص 59)

(2) فاقام الفجر حين طلع الفجر (مسلم:نمبر ۱۳۹۱)
صبح کی نماز کھڑی کی جب فجر طلوع ہوئی۔

(3) وصلّى الفجر فاسفر بها (مسلم: نمبر ۱۳۹۱)
اور صبح پڑھی تو اسے روشن کردیا۔

(4) وصلى بى الفجر حين حرم الطعام والشراب على الصائم (ابو داود: نمبر ۳۹۳) شیخ البانی نے صحیح کہا ہے۔
اور مجھے صبح پڑھائی جب کہ روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے۔

(5) وصلى بى الفجر فاسفر (ابوداود:۳۹۳) شیخ البانی نے صحیح کہا ہے۔
اور مجھے صبح پڑھائی تو روشنی کردی۔

(6) عمر فاروقؓ نے فرمایا: والصبح والنجوم بادية مشتكبة (مشكوة: نمبر ۵۸۵)
صبح کی نماز پڑھو جب ستارے چمک رہے ہوں۔

(7) وكان ينتفل من صلوٰة الغداة حين يعرف الرجل جليسه
صبح کی نماز سے پھرتے تھے جب کہ آدمی اپنے ساتھی کو پہچان لیتا تھا۔(بخاری:نمبر ۵۴۷، مسلم: نمبر ۱۴۶۲۰)

(8) والصبح بغلس (بخاری: نمبر ۵٦٥ ، مسلم:نمبر ۱٤٦۰)
صبح کی نماز غلس میں پڑھتے تھے۔
غلس کے غین اور لام پر زبر ہے،اس کے معنی ظلمة آخر الليل اذااختلطت بضوء الصباح
جب آخری رات کا اندھیرا صبح کی روشنی سے مل جائے۔(مشکوۃ شریف: ص 60)

(9) كان رسول اللّٰه صلى الله وعليه واله وسلم ليصلى الصبح فتنصرف النساء متلفات مايعرفن من الغلس (مسلم: ۱٤٥۹ ، بخاری:نمبر ۸۷٦)

رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھتے تھے، پھر عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی چلی جاتی تھیں، غلس کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

(10) فرمایا رسول اللہ ﷺ نے **من ادرك ركعة من الصبح قبل ان تطلع الشمس فقد ادرك الصبح** (بخاری:نمبر ۵۷۹، مسلم:نمبر ۱۳۷۷)

جس شخص نے ایک رکعت صبح کی سورج نکلنے سے پہلے پالی تو اس نے صبح کی نماز پالی۔ (خ۔م)

(11) **واذا ادرك سجدة من صلاة الصبح قبل ان تطلع الشمس فليتم صلوته** (بخاری:نمبر ۵۵۶)

اور جب ایک رکعت صبح کی نماز سے سورج نکلنے سے پہلے پالے تو چاہیے کہ اپنی نماز پوری کرے۔

(12) فرمایا: **اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر** (ترمذی:نمبر ۱۵۴۔ صحیح)

یہ ظاہر بات ہے کہ وقت سے پہلے نماز نہیں ہوتی اور اذان کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے، نماز کے لیے آجاؤ اور ہر اذان نماز کے وقت میں ہوتی ہے۔ ظہر کی اذان اس وقت ہوگی جب ظہر کی نماز کا وقت ہو جائے۔ کوئی موذن دوپہر کو اذان نہیں دے گا۔ عصر کی اذان اس وقت ہم کہتے ہیں، جب نماز عصر کا وقت ہو جاتا ہے، کوئی موذن ظہر کے آخری وقت میں عصر کی اذان نہیں دے گا۔ علیٰ ھذا القیاس مغرب کی اذان غروب آفتاب کے بعد ہوگی جب کہ نماز کا وقت شروع ہوگا۔ کوئی موذن غروب آفتاب سے پہلے اذان نہیں دے گا، تاکہ نمازی جلدی تیاری کر کے نماز میں شامل ہو سکیں۔ اسی طرح عشاء کی اذان عشاء کے وقت ہوگی تو صبح کی اذان کا صبح سے پہلے کیا جواز ہے؟ اور وجہ جواز یہی بتائی جاتی ہے کہ لوگ سوئے ہوتے ہیں، ہر ایک کو ضروری حاجات سے فارغ ہونا ہوتا ہے، اس لیے آدھ گھنٹہ پہلے اذان کہہ دی جائے تو نمازی جاگ اٹھتے ہیں اور نماز سے پہلے پہلے ضروری حاجات سے

فراغت حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر عین وقت پر اذان کہی جائے تو بہت سے نمازی نماز سے پیچھے رہ جائیں گے۔ کیا دورِ نبوت میں صحابہ کرام انسانی حاجات نہیں رکھتے تھے؟ اس وقت کیوں اذانیں صبح کے وقت میں ہوتی تھیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگوں نے جھوٹے، مضحکہ خیز اور خودساختہ قیاسات قائم کر رکھے ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ اندھیرے میں نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد باپردہ عورتیں پہچانی نہ جاتی تھیں۔ نمازی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ حالاں کہ صبح صادق ہونے کے بعد اندھیرے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صبح کی روشنی جب پھیلتی ہے تو لازماً رات کا اندھیرا باقی نہیں رہ سکتا اسی لیے اسے عربی میں غلس بولتے اور پنجابی میں (رول بولا) کہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ یا دس منٹ کے لیے غلس اندھیرے کی شکل میں ہوسکتا ہے لیکن صبح پھوٹنے کے بعد ہر لحظہ غلس میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ جب اسفار ہوجاتا ہے یعنی غلس کا پہلا حصہ جو اندھیرے کی شکل میں ہوتا ہے وہ آخری شکل اختیار کر لیتا ہے، اس میں روشنی زیادہ اور اندھیرا کم ہوتا ہے جب کہ پہلے حصے میں اندھیرا زیادہ اور روشنی کم ہوتی ہے، وہ بھی غلس کہلائے گا اور وہ بھی کامل نماز کا وقت ہے۔ اسی لیے آپ کا فرمان ہے کہ **اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر** (ترمذی: نمبر ١٥٤) کیوں کہ جوں جوں نمازی زیادہ ہوں گے اجر بڑھتا جائے گا۔

صبح کی پہچان بہت مشکل ہے۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ چاندنی رات میں بالخصوص زیادہ مشکل ہے، جب کہ صبح اور چاند کی روشنی مل جاتی ہے۔

میرا ایک اندازہ ہے کہ جتنے عرصے میں غروب آفتاب کے بعد شفق غائب ہوتی ہے اتنا عرصہ طلوع آفتاب سے پہلے صبح کی اذان ہونی چاہیے، جس کا اندازہ سوا گھنٹہ ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب والیہ الماٰب**

حافظ محمد لکھوی نے اس مضمون کو تفسیر محمدی کی پہلی جلد (ص: 16) میں ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

دھا گا چٹا صبح سفیدی کالا رات سیاہی
معالم وچہ طریق بخاریوں دیندا اہل گواہی

ہوروچہ معالم مالک راہوں ابن عمر تھیں لیاوے
جو آکھیا نبی اذان بلالوں صائم پیوے کھاوے

جو بانگ بلال کہے کجہ راتوں صبح کہے عبداللہ
اوہ مردنابینا بانگ نہ آکھے جاں جاں صبح تسلا

اس دی بانگوں بعد نہ کھاؤ حضرت ایہ فرمایا
اوہ ام مکتوم دا بیٹا جس دا ذکر عبس (1) وچہ آیا

ہک صادق صبح تے پہلی کاذب ایہ وچہ رات گنیوے
جو چانن چڑھے اتاں اس وچہ صائم کھاوے پیوے

فراوہ چانن غائب تھیوے وت پھر صادق ہووے
آسمان کنارے چانن کھڈدے صائم ٹھہر کھلووے

نبی ﷺ کیہانا ہٹو سحوروں سن کر بانگ بلالوں
نہ صبح درازوں ہٹور ہوجد چوڑی ہووے حالوں

حضرت بلال کی اذان بھی صبح کی ہوتی تھی اور اس میں وہ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح بھی کہتے تھے لیکن وہ صبح کاذب ہوتی تھی۔ وہ اذان سن کر نوافل پڑھنے والے نوافل چھوڑ دیتے تھے اور سحری کھاتے تھے۔ آج کل ٹائم ٹیبلوں پر جو اذانیں ہوتی ہیں وہ صبح کاذب میں ہوتی ہیں، جس سے کئی روزے دار سحری سے محروم رہ جاتے ہیں اور کئی نمازی صبح کی سنت دو رکعت پڑھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس وقت نماز حرام ہوتی ہے اور نامعلوم کتنی مستورات گھروں میں فرض نماز بھی پڑھ لیتی ہوں گی، نماز کا ابھی وقت نہیں ہوتا، اور یہ گناہ سب موذن کے سر پر ہوگا۔ لہٰذا سب مسلمانوں کو صبح کی نماز میں سخت احتیاط کرنا چاہیے۔ کیوں کہ وقتیں معمولی

(1) یعنی تیسویں پارے کی سورہ عبس وتولی مراد ہے۔

تاخیر کا کوئی حرج نہیں، لیکن وقت سے پہلے تو نماز حرام ہے۔

مولانا محی الدین لکھوی کا تحریری کام اگرچہ بہت محدود ہے تاہم بہت اہم ہے۔ انھوں نے نمازوں کے اوقات کے بارے میں ایک کیلنڈر تیار کیا تھا جو کئی دفعہ چھپا اور مسجدوں میں آویزاں ہوا۔ اس میں باجماعت نماز کے متعلق چند احادیث درج کی گئی ہیں اور اس کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے۔ یہ بھی اس اعتبار سے بڑی اہم چیز ہے کہ لوگ اسے مسجدوں میں پڑھتے اور اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا وسعت پذیر سایہ ہمیشہ اس خاندان پر لہراتا رہا اور اس کے علماء حالات کے مطابق کام کرتے رہے۔ جب لوگوں کو پنجابی اور فارسی میں سمجھانے کی ضرورت تھی تو حافظ بارک اللہ لکھوی اور ان کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی اور بعض دیگر حضرات نے یہ خدمت سرانجام دی۔ اور اب زمانہ بدلا ہے اور اردو اور انگریزی کا دور آیا ہے تو ان کے پوتے اور پڑپوتے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فریضۂ تدریس ادا کرنے میں مصروف ہیں اور ماشاء اللہ ان میں سے متعدد پی۔ ایچ۔ ڈی ڈاکٹر ہیں۔ ان حضرات کا تحریری سلسلہ بھی کسی نہ کسی انداز میں جاری ہے۔ ان کے آباواجداد تبلیغ دین کے لیے اپنے علاقے کے دیہات وقصبات کے دورے کرتے تھے تو ان کے یہ اخلاف پاکستان کے بلاد وقصبات سے ہزاروں میل آگے نکل کر تبلیغ اسلام کے لیے یورپ تک کے ملکوں میں جاتے اور ان کی زبانوں میں انھیں اسلام کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے۔

بات مولانا محی الدین لکھوی سے متعلق ہو رہی تھی۔ گزارش یہ ہے کہ انھیں تصنیف وتالیف سے اتنا لگاؤ نہ تھا جتنا کہ بعض علماء کو ہوتا ہے۔ شخصیات کے موضوع پر اس فقیر نے تحریری طور پر جو خدمات انجام دی ہیں اور دے رہا ہے، اس سے بھی انھیں زیادہ اتفاق نہ تھا۔ بس دو چار دفعہ یہ فرمایا کہ ''جو کام تم کر رہے ہو، وہ لوگوں کے لیے فائدہ مند اور دلچسپی کا باعث ہے۔'' میرے نزدیک ان کا اتنا کہہ دینا بھی بہت تھا اور ان کے یہ الفاظ میرے لیے گراں قدر سوغات کی حیثیت رکھتے تھے۔

اب آیئے اگلے دو ابواب میں ان کی اردو اور پنجابی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں۔



اکتیسواں باب

مولانا لکھوی کی اردو شاعری

مولانا محی الدین لکھوی کی تصنیفی خدمت کا دائرہ اگرچہ بہت محدود ہے تاہم اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس طرف توجہ فرماتے تو بہت اچھے مصنف ہوتے، لیکن انھوں نے وعظ ونصیحت کو اپنا اصل مقصدِ حیات قرار دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مقصد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بے حد کامیابی عطا فرمائی اور بے شمار لوگوں نے ان کے مواعظِ حسنہ سے اثر پذیر ہوکر راہِ مستقیم اختیار کی۔ مصنف تو بے شمار ہیں، لیکن اس مادی دور میں مخلص ترین واعظین وناصحین کا ملنا بہت مشکل ہے۔ بہرکیف مولانا کی نثری مطبوعہ تحریر تو یہی ہے، البتہ ان کی شعری خدمات کافی حد تک ہمارے علم میں آتی ہیں جو اردو میں بھی ہیں اور پنجابی میں بھی۔ میں خود شاعر نہیں ہوں، نہ اردو کا نہ پنجابی کا، اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ فنی اعتبار سے ان کی شاعری کی کیا حیثیت ہے۔ مجھے فقط یہ معلوم ہے کہ ان کے اشعار ہم لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں ان کے اشعار کو دو ابواب میں تقسیم کر دیا ہے، ایک باب اردو شاعری پر مشتمل ہے اور ایک پنجابی شاعری پر۔ آیے پہلے ان کے اردو اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس سے اگلے باب میں پنجابی اشعار پیش خدمت کیے جائیں گے۔

حمد باری تعالیٰ

نام تیرا کان میں ڈالا گیا
بس یہی تھی زندگی کی ابتدا

دل ہی دل میں نام یہ پلتا رہا
اک دیا سا نور کا جلتا رہا

نام سے تیرے اجالا ہوگیا
نور ایمان کا دوبالا ہوگیا

نام تیرا سب کے ہے وردِ زباں
ہے اسی سے رونقِ بزمِ جہاں

چور کے لب پہ بھی تیرا نام ہے
نام تیرا وردِ خاص وعام ہے

گو کسی کو لاکھ ہو دولت پہ ناز
نام سے تیرے نہیں ہے بے نیاز

نام تیرا مشعلِ بزمِ جہاں
قلبِ انسان کے لیے نورِ جہاں

نام تیرا دل نشین ودل پذیر
نام تیرا بہرِ انساں نا گزیر

نور سے تیرے ہے روشن سب جہاں
نور سے روشن زمین وآسماں

چشمِ مومن طالب دیدار ہے
لن ترانی سے مگر لاچار ہے

کس قدر چہرے بھی وہ خوش بخت ہیں
اس میں دیدار کی جو مست ہیں

بے شمار شاعر حمد لکھتے ہیں لیکن مولانا کا حمد لکھنے کا اپنا اسلوب ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔

یہ بھی حمد ہے۔

اس حمد میں مولانا خالص توحید کو واضح کرتے ہیں اور اس مادہ پرستی سے نالاں ہیں جو ہمارے بچوں کے سلسلۂ تعلیم میں شامل ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اصل تعلیم اور اصل حکمت قرآن میں پوشیدہ ہے۔

آیاتِ الٰہی کے دیکھو ہر طرف نظارے ہوتے ہیں
کبھی سورج حاضر ہوتا ہے، کبھی چاند ستارے ہوتے ہیں

واں غوث، قطب، ابدال کجا، واں اور کسی کی مجال کیا
وہ در ہے خدا کا جس در پر نبیوں کے گزارے ہوتے ہیں

ایمان ہمارا چھین لیا تعلیم نے مادہ پرستی کی
مکتب کی فضا میں گمراہ اطفال ہمارے ہوتے ہیں

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
اس جنس کے حامل تو قرآں کے سپارے ہوتے ہیں

جہادی نظم

177ھ میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے میدانِ جہاد سے عابد حرمین فضیل بن عیاض کو ایک خط لکھا۔ اس خط کا ترجمہ یہ نظم ہے۔

ہمیں گر دیکھ لو اے عابد حرمین جنگ جو یا
بادت آپ کو معلوم ہوگی کھیل ہے گویا

کوئی چہروں کو اپنے اشک ہائے تر سے دھوتے ہیں
مگر سینے ہمارے خون سے رنگین ہوتے ہیں
کوئی لہو ولعب میں اپنے گھوڑوں کو بھگاتے ہیں
مگر گھوڑے ہمارے صبح دم دشمن کو جگاتے ہیں
ہمیں اپنے پیغمبر سے یقینی بات پہنچی ہے
نہیں ہے ذرہ بھر خامی صحیح ہے اور سچی ہے
کہ ہرگز ناک میں مومن کی دو چیزیں نہ ہوں یک جا
غبار اللہ کے لشکر کا، دھواں دوزخ کی آتش کا
کتاب اللہ ناطق ہے میاں اپنے سنو! مژدہ
جو راہِ حق میں مرتے ہیں وہ زندہ ہیں، نہیں مردہ
(مترجم: محی الدین لکھوی، 26۔جمادی الثانی 1416ھ)

بچوں کی دعا

مولانا نے علامہ اقبال کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا'' کی طرز پر یہ نظم لکھی اور لکھو کے میں بچے یہ نظم سکول میں پڑھتے رہے۔

نامِ اللہ سے میں آغازِ دعا کرتا ہوں
در پہ میں جس کے شب وروز جھکا کرتا ہوں
ہاتھ امیدِ اجابت سے اٹھا کر دونوں
دین ودنیا، یہ دعا ہے، عطا کر دونوں
عافیت سے اے خدا مجھ کو ہمیشہ رکھنا
طالبِ علمِ ھدیٰ مجھ کو ہمیشہ رکھنا
دور دنیا سے جہالت کا اندھیرا کردوں
ہر جگہ نورِ ہدایت سے اجالا کردوں

رغبتِ علم وعمل دہر میں پیدا کردوں
عبدِ دنیا کو تیرے دین پہ شیدا کردوں

اے خدا غازیٔ کردار بنانا مجھ کو
نہ فقط بازیٔ گفتار سکھانا مجھ کو

زندگی نیک عمل سے بنانا میری
عاقبت اجرِ حسن سے سجانا میری

یہ نظم مولانا نے لکھوکے (ہندوستان) میں لکھی۔ یہ وہ پہلی نظم ہے جو مولانا نے بائیس سال کی عمر میں لکھی اور علامہ اقبال کی دعا کو اسلامی رنگ دے کر لکھی۔ بچوں کے لیے یہ ایک موثر دعا ہے۔

تقسیم ملک سے بہت پہلے فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں مجلسِ احرار کی ایک کانفرنس (کشمیر کانفرنس) کے نام سے منعقد ہوئی تھی۔ مولانا محی الدین کا یہ جوانی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اس کانفرنس کے لیے یہ نظم لکھی اور کانفرنس میں پڑھی، جسے اس وقت بہت پسند کیا گیا تھا۔

لا الٰہ الا انت

تو ہے سارے جگ کا داتا
سوتا ہے نہ پیتا کھاتا

اک تو، تیرے پتا نہ ماتا
اور نہ ہی تو ہے کسی کو جنتا

لا الٰہ الا انت

توبہ توبہ کتنے دھندے
ہائے جگ میں کیسے پھندے

ہم دکھیارے تیرے بندے
کوئی کام نہیں ہے بنتا

لا الٰہ الا انت

کرتے ہیں سب دھن کی پوجا
تن کی پوجا من کی پوجا

جو ہے سب کچھ ہم کو دیتا
بھولے اس ساجن کی پوجا

لا الٰہ الا انت

جن کے ہاتھ میں قوم کی باگیں
تیری پوجا سے وہ بھاگیں

سو جائیں تو کیوں کر جاگیں
لٹ جائے جو کچھ ہے لٹتا

لا الٰہ الا انت

ایک قرآنی آیت اور اس کا مفہوم اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اشعار شاید مولانا کے اپنے تو نہیں لیکن وہ ایک قرآنی آیت اور اس کا مفہوم اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اشعار شاید مولانا کے اپنے تو نہیں لیکن وہ ان کو اکثر پڑھا کرتے تھے۔ انھیں پڑھا کرتے تھے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا
(الکہف:53)

ہزاروں سال کافر کو یہی منظر ستائے گا
جہنم سامنے ہوگی کلیجہ منہ کو آئے گا

عجب ہے سو رہے جو آگ سے ہو بھاگنے والا
جو طالب ہو کے جنت کا نہ ہو پھر جاگنے والا

یقیں کرلیں گے مجرم کہ وہ اس میں گر ہی جائیں گے
نہ اس سے بھاگ جانے کی کوئی وہ راہ پائیں گے

مولانا ممدوح کی اردو پنجابی تمام شاعری موت، قبر، قیامت اور جنت دوزخ کے تذکرے سے عبارت ہے۔ اس موضوع سے متعلق بعض دوسرے شاعروں کا کلام بھی انھیں یاد تھا اور وہ اسے پڑھتے رہتے تھے۔ درج ذیل نظم اسی میں شامل ہے جو مولانا کی نہیں ہے، لیکن بقول ڈاکٹر محمد حماد لکھوی وہ اسے بہت پڑھتے تھے۔

دنیا کے اے مسافر منزل تیری قبر ہے
طے کر رہا ہے جو تو دو دن کا یہ سفر ہے

جب سے بنی ہے دنیا لاکھوں کروڑوں آئے
باقی رہا نہ کوئی مٹی میں سب سمائے
اس بات کو نہ بھولو سب کا یہی حشر ہے

آنکھوں سے تونے اپنے کتنے جنازے دیکھے
ہاتھوں سے تو نے اپنے دفنائے کتنے مردے
انجام سے تو اپنے اتنا کیوں بے خبر ہے

مٹی کے پتلے تم کو مٹی میں ہے سمانا
اک دن یہاں تو آیا اک دن یہاں سے جانا
رہنا نہیں یہاں پر جاری تیرا سفر ہے

اے عزیز محسن تو اپنے مولا سے دل لگا لے
کر لے خدا کو راضی کچھ نیکیاں کما لے
سامان تیرا یہی ہے تو صاحب سفر ہے

دنیا کے اے مسافر منزل تیری قبر ہے
طے کر رہا ہے جو تو دو دن کا یہ سفر ہے

حمد باری تعالیٰ

ارض و سما میں دیکھی جلوہ نمائی تیری
تابع ہے تیرے مولا ساری خدائی تیری

سب سے قدیم تو ہے قادر کریم تو ہے
کون ومکاں پہ دیکھی فرماں روائی تیری
عالم کا خالق تو ہے بندوں کا رازق تو ہے
بھولا ہوا ہے جس نے نعمت بھلائی تیری
عصیاں کو دور کردے ظلمت کو نور کردے
دل رشکِ طور کردے عقدہ کشائی تیری
شمس وقمر کی ضو میں پھولوں کی رنگ وبو میں
تجھ کو نہ پایا لیکن قدرت ہے پائی تیری
دشت ودمن میں تو ہے باغ وچمن میں تو ہے
گل پہ ہے بلبل کرتی نغمہ سرائی تیری
(محی الدین لکھوی)

اسماعیل میرٹھی کی مندرجہ ذیل حمدیہ نظم مولانا اکثر پڑھا کرتے تھے۔

حمد باری تعالیٰ:

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمین بنائی کیا آسماں بنایا
پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ لاجوردی اک سائبان بنایا
مٹی تلے بیل بوٹے کیا خوشنما لگائے
پہنا کے سبز خلعت ان کو جواں بنایا
خو ش رنگ اور خوشبو گل پھول ہیں کھلائے
اس خاک کے کھنڈر کو اک گلستاں بنایا

میوے لگائے کیا کیا خوش ذائقہ رسیلے
چکھنے سے جن کے ہم کو شیریں دہاں بنایا

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا

سورج بنا کے تونے رونق جہاں کو بخشی
رہنے کو یہ ہمارے اچھا مکاں بنایا

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

ہر چیز سے ہے تیری کاریگری ٹپکتی
یہ کارخانہ تونے نہیں رائیگاں بنایا

رباعیات:

بفرمان رسولِ رب امجد
مگر ہے ذوقِ ایماں کی یہی حد
بجاں منظور رب ودین وہادی
مجھے اللہ واسلام ومحمد

چشم بد دور اب تو رہتے فکر ناؤو نوش میں
داد دیجیے عیش کی فردوس چشم وگوش میں
نشۂ صہباء اتر جائے گا شامِ زندگی
ہوش میں آئیں گے صاحب موت کی آغوش میں

بھلا مخلوق کا صانع نہیں ہے؟
جو معطی ہے وہ کیا مانع نہیں ہے؟
ملے کھانے کو غم پینے کو غصہ
ہنوز اے نفس! تو قانع نہیں ہے؟

گریجوایٹ کی ہستی عجب ہے
نئی تہذیب نے ڈھایا غضب ہے
نہ پاسِ دیں نہ احساسِ ضلالت
مگر بی۔اے کا معنیٰ بے ادب ہے

نیا گل کونسا شاید کھلے گا
خدا کا عرش شاید کب ہلے گا
نہ موئے ریش مسلم ساجہاں میں
کوئی مظلوم ڈھونڈے سے ملے گا

قطرۂ آبِ زبوں پر کس نے کی صورت گری
کس نے مشتِ خاک کو بخشا ہے حسنِ لاجواب
شیرِ شیریں خون وگوبر سے کیا کس نے کشید
شہد کی مکھی کو بخشا کس نے ذوقِ انتخاب

ہم کیسے کہیں اسے مشکل کشا
ہم کیسے کہیں اسے حاجت روا
ہم داتا کیوں اسے تسلیم کریں
جو موت سے خود کو بچا نہ سکا

ھل اتی علی الانسان حین من الدھر

تری امی بنی دلہن ترا ابا بنا دولہا
کہاں اس وقت تھا تو سچ بتا مجھ کو ذرا بیٹا
نہ تھا نام ونشاں تیرا نہ کچھ وہم وگماں تیرا
تجھے اللہ نے ناچیز سے اک چیز کر ڈالا

بلاغ حق کا مبلوغ ہوجا
دباغ دین سے مدبوغ ہوجا
بظاہر اور بباطن اے مسلمان
خدا کے رنگ میں مصبوغ ہوجا

مولانا غلام رسول قلعویؒ کی درج ذیل نظم (نصیحت نامہ) بھی مولانا عام طور پر پڑھا کرتے تھے۔

دلا غافل نہ ہو یک دم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے
باغیچے چھوڑ کر خالی زمیں اندر سمانا ہے
تیرا نازک بدن بھائی جو لیٹے سیج پھولوں پر
ہووے گا ایک دن مردار جو کرماں نے کھانا ہے
اجل کے روز کو کر یاد، کر سامان چلنے کا
زمین کے فرش پر سونا جو اینٹوں کا سرہانا ہے
نہ بیلی ہو سکے بھائی نہ بیٹا باپ تے مائی
کیا پھرتا ہے سودائی عمل نے کام آنا ہے
جہاں کے شغل میں شاغل خدا کی یاد سے غافل
کریں دعویٰ جو یہ دنیا میرا دائم ٹھکانا ہے
غلط فہمید ہے تیری نہیں آرام اس پل میں
مسافر بے وطن ہے تو کہاں تیرا ٹھکانا ہے
فرشتہ روز کرتا ہے منادی چار کوٹوں پر
محلاں اچیاں والے تیرا گوریں ٹھکانا ہے

کہاں وہ ماہِ کنعانی کہاں تختِ سلیمانی
گئے سب چھوڑ یہ فانی اگر نادان و دانا ہے

عزیزا یاد کر وہ دن جو ملک الموت آوے گا
نہ جاوے ساتھ تیرے کو، اکیلے تو نے جانا ہے

نظر کر دیکھ خویشوں میں جو ساتھی کون ہے تیرا
انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اکیلے کو دبانا ہے

نظر کر ماڑیاں خالی کہاں وہ ماڑیاں والے
سبھی جھوٹا پیارا ہے دغا بازی کا بانا ہے

غلامؔ اتنی نہ کر غفلت حیاتی پر نہ ہو غرہ
خدا کی یاد کر ہر دم جو آخر کام آنا ہے



بتیسواں باب

پنجابی شاعری

نہ صرف مولانا محی الدین لکھوی کو پنجابی زبان سے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اسلاف کو پنجابی ادب سے خاص شغف تھا۔ لوگ بالخصوص حضرت حافظ محمد لکھوی مرحوم ومغفور کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے اسلام قبول کرنے کا باعث حافظ محمد لکھوی کی کتاب احوال الآخرت بھی ہوئی۔ انہی کتابوں کے مطالعہ کی بنا پر مولانا محی الدین لکھوی مرحوم نے تھوڑی بہت پنجابی شاعری کی اور اس شاعری کے ذریعے سے اصل مدعا اور دردِ دل پیش کیا۔ وہ اگرچہ اپنا پورا پنجابی کلام طبع نہ کرا سکے تاہم ان کی شاعری سے بے شمار لوگ متاثر ہوئے۔

حمد باری تعالیٰ

تیتھوں میں قربان مولا دنیا بنا ون والیا
حسن دا بازار لا کے گاہک پھسا ون والیا

سب تیری تعریف مولا قدرت وکھا ون والیا
رحمتاں دے ہر طرف دریا چلاون والیا

ذات بس تیری ہی مولا لائقِ تعریف ہے
تاج نبیاں نوں نبوت دے پہناون والیا

نور ہو کے آپ توں اعزاز بخشیں خاک نوں
نوریاں توں خاکیاں لئی سجدہ کراون والیا

الست بربکم داوعدہ لے کے بھلن ہارتوں
بھیج کے نبیاں نوں پھر چیتا کراون والیا

کون جانے حکمتاں جو تیریاں دے راز نے
امتحاں وچ خاک دے پتلیاں نوں پاون والیا

معترف دنیا ہے ساری نعمتاں جو تیریاں
دوستاں تے دشمناں توں رب سداون والیا

سنگ ہے دل،دنگ نئیں، جو رنگ تیرے دیکھ کے
رنگارنگ مخلوق جگ دے وچ پھیلاون والیا

گرمیاں وچ لوتپش جدروزے داراں ساڑ دی
بدّلاں نوں حکم دے کے ٹھنڈپاون والیا

بدّلاں دی فوج لیا ویں بنھ کے توں بے شمار
قطرہ قطرہ کر کے پھر بارش وساون والیا

پیٹ مکھی دے توں اندر شہد دی لائی مشین
خون گوبرو چوں چٹا ددھ پلاون والیا

پانی مٹی ہک مزے رنگ بونے وکھرووکھرے
خاک تھیں لکھ پھول پھل میوے اگاون والیا

کر عطا توفیق ،کریئے شکر تیرا مالکا
ہورنعمت شکر دے بدلے ودھاون والیا

بجلیاں دے قمقمے ہیں یا ہیں دیوے چمک دے
وچ اندھیری رات تارے جگمگاون والیا

توں فقط داتا ہیں، خلقت ساری منگتی ہے تری
بے حسابا دے کے پھیر پچھونہ تاون والیا
کچھ بزرگاں دی بزرگی در تیرے نافع نہیں
بیوی بیٹا نوح دادوزخ پہچاون والیا
توں جو دیویں کون روکے، روک لئیں تاں کون دے
بردہ یوسفؑ کھوہ چوں کڈھ کے شاہ بناون والیا

پنجابی کی ایک اور حمد پڑھیے:

نت حمد اللہ دی کریے جیہندی خلقاں حمد پکاردیاں
نت شکر خدادا کریے لکھ نعمتاں پالن ہاردیاں
سچے رب نوں میں ہکا سوہراں جنھوں شرماں نے کل سنساردیاں
نت بخشش منگ گناہاں کر صفتاں رب غفاردیاں
کدی صفت نہ رب دی مکدی ایتھے وڈیاں وڈیاں ہاردیاں
بن جان سمندر سیاہی بھاویں قلماں ہون اشجاردیاں
تیرے گھاٹے پورے کرسی کرمتاں رب جبار دیاں
اوہ کجسی پردے تیرے، کر حمداں رب ستاردیاں
ہے دوزخ قہر الٰہی جتھے اگاں نے لاٹاں ماردیاں
جے توں چاہیں بخشش رب دی، پڑھ تسبیحاں استغفار دیاں
دکھ دنیا چ صبروں جریئے ایہہ تاں رحمتاں سرجن ہاردیاں
جنھاں دنیا چ صبر کمایا اونھاں خوشیاں نے باغ بہاردیاں

نغمۂ توحید

مولانا کی ایک پنجابی نظم "نغمہ توحید" پڑھیے ۔

اللہ ہے اکلا اونہدا کوئی اے شریک ناں
اللہ باہجوں غیراں تائیں پوجنا اے ٹھیک ناں

پیر تے فقیر ساڈے کم نہ سواردے
اللہ باہجوں رکھیں کائی آس تے اوڑیک ناں

وڈا شرک اللہ باہجوں غیرنوں پکارناں
اللہ باہجوں سندا کوئی دوروں تے نزدیک ناں

بول، تول، نیتاں نوں پاک صاف رکھیو
گل اس توں چھپی اے پوشیدہ تے باریک ناں

نبی ﷺ دا طریقہ چھڈ بدعت نہ قبولیں توں
چھڈ کے توحید لاویں دین نوں توں لیک ناں

نبی ﷺ نے سکھایاں سانوں عادتاں نیں سوہنیاں
ساہنی لے کے پانی پیویں لاویں ہکو ڈیک ناں

کھا کھا نعمتاں پُھل ناں، تے پاٹ ناں
آون جے مصیبتاں، کوک ناں تے چیک ناں

دوڑ کے بے صبراول جاناں ایں بزرگاں دے
کیہڑا کم بھلا کر سکدا ملیک ناں

اتریا قرآن ہوئیاں پندراں صدیاں پوریاں
پر سمجھیا توحید انسان اجے تیک ناں

زمیں آساناں والے سارے اللہ دے نیں منگتے
مومن بندا منگتیاں توں منگدا اے بھیک ناں

''نغمہ توحید'' کے عنوان سے اب ایک اور پنجابی نظم ملاحظہ ہو:

حضرت علی ہجویری کو لوگ داتا کہتے ہیں، اس پس منظر میں یہ اشعار لکھے گئے۔

من اللہ ہکو داتا ہور منگتی خلقت ساری اے
جیڑے داتا ہور بناون مت اونہاں شیطوں ماری اے
نہ سمجھن لکھ سمجھاؤ کجھ ایسی قسمت ہاری اے
بن اللہ شافی ناہیں جھناں لگی شرک بیماری اے
بس اللہ ہادی آپے ایہہ سنت رب دی جاری اے
جنھوں رب توحید سکھائی اس مل گئی نعمت بھاری اے
بن توبہ مشرک مریا بدقسمت ہویا ناری اے
جس لگی شرک بیماری وچہ دنیا ذلت خواری اے
ہے دنیا نری بیماری پر لگدی بہت پیاری اے
پچھ انھاں نوں رب کیہڑا سب آکھن اللہ باری اے

نعت

ذرا جھوٹ بولاں خدادی قسم ناں
محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیہا پیر جمیاں نہ جمناں
زبان نال حمدِ الٰہی دے کھولاں
پر عظمت جلالوں میں کنباں تے ڈولاں
نہ لا احصی بن ہور سمجھدا، جو بولاں
ثنا میرے مالک دی ہووے ختم ناں
ذرا جھوٹ بولاں خدادی قسم ناں
محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیہا پیر جمیاں نہ جمناں

محمد ﷺ دے اوپر پڑھاں پھر صلوٰتاں
سنے آل اصحاب عالی صفاتاں
سنو اج محمد ﷺ دیاں چند باتاں
کراں حق ادائی ہے طاقت قلم ناں
ذرا جھوٹ بولاں خدادی قسم ناں
محمد ﷺ جیہا پیر جمیاں نہ جمناں
محمد ﷺ نے توحید سانوں سکھائی
طہارت وضو غسل بدنی صفائی
نہ جانن یہودی نہ جانن عیسائی
نہ سکھ جاندے تے ہندودھرم ناں
ذرا جھوٹ بولاں خدادی قسم ناں
محمد ﷺ جیہا پیر جمیاں نہ جمناں
ضیانورِ حق دی گئی ہر مکان تے
سمندر تے خشکی تے ہر کوہستان تے
عرب داہے احسان سارے جہان تے
کدے وی سبک دوش ہووے عجم ناں
ذرا جھوٹ بولاں خدادی قسم ناں
محمد ﷺ جیہا پیر جمیاں نہ جمناں
مگر پاک وہند دے مسلماں کمینے
کراندے چراغاں تے میلے مدینے
دعا ایہ جے کیتی نہ ہوندی نبی نے
قبر میری یا رب بناویں صنم ناں

ذرا جھوٹ بولاں خدادی قسم ناں
محمد ﷺ جیہا پیر جمیاں نہ جمناں
سنو لوکو! کی لے کے جانا جے جگ توں
رہو ہو کے ہشیار شیطان ٹھگ توں
بچالواوئے جاناں تے ٹبراں نوں اگ توں
خوشی وچ رہو گے تو کھاؤ گے غم ناں
ذرا جھوٹ بولاں خدادی قسم ناں
محمد ﷺ جیہا پیر جمیاں نہ جمناں

ذکر الٰہی

دل اپنے دی کوٹھڑی ویران رکھ ناں
جہیڑی غافل ہووے ذکر تو زبان رکھ ناں
وچہ گودڑی دے لال چھپانے جان گے
تنبو انصاف والے تانے جان گے
وچہ دنیا دے ظلم دا دھیان رکھ ناں
دل اپنے دی کوٹھڑی ویران رکھ ناں
تسبیح ذکر دی تے فکر دا خیال چاہی دا
تینوں جوڑنا پیوند رب نال چاہی دا
جہیڑی رب نوں نہ بھاوے ایسی شان رکھ ناں
دل اپنے دی کوٹھڑی ویران رکھ ناں
رحمان رکھ لے تے قرآن رکھ لے
اک مدنی محمد سلطان رکھ لے
باقی کفر دے بازار دا سامان رکھ ناں
دل اپنے دی کوٹھڑی ویران رکھ ناں

تینوں فحش تے بکواس توں پرہیز چاہی دا
سینہ ذکر دے نال لبریز چاہی دا
مسلمان لئی حقے دا شان رکھ ناں
دل اپنے دی کوٹھڑی ویران رکھ ناں
کرعمل تے عمر نہ گنوا بندیا
کھٹ حق' تے حلال داتوں کھا بندیا
جھوٹا چکنے دے واسطے قرآن رکھ ناں
دل اپنے دی کوٹھڑی ویران رکھ ناں
کئی آئے تے سمائے وچہ خاک سوہنیا
کئی تیرے نالوں سوہنے چالاک سوہنیا
عمر ایس فانی تے توں مان رکھ ناں
خانے دل دے نوں اپنے ویران رکھ ناں
جے توں عمل قرآن تے کماوناں نئیں
سچے دین والا موتی گل پاوناں نئیں
دھوکا دین لئی توں ناں "مسلمان "رکھ ناں
دل اپنے دی کوٹھڑی ویران رکھ ناں
خانے دل دے نوں اپنے ویران رکھ ناں
جہیڑی غافل ہووے ذکر توں زبان رکھ ناں

علم دی شان

مولانا محی الدین لکھوی کسی زمانے میں اپنے نام کے ساتھ حسانؔ کا لاحقہ کرتے تھے۔ اسے ان کا تخلص بھی کہا جا سکتا ہے جو وہ اس نظم کے آخری شعر میں لائے ہیں۔

علم دی شان ہرگز ہووے بیان ناہیں
علم دے باہجوں رب دی ہووے پہچان ناہیں

دنیادی دولت فانی دنیا ہے آپ فانی
علم دی دولت تائیں ہرگز نقصان ناہیں

علم دے گہنے جیہا گہنا نہ ہور کوئی
علم دے باہجوں سجدا ہر گز انسان ناہیں

علم دے باہجوں لوکی دوزخ دا بالن بن دے
علم دے باہجوں حاصل جنت مکان ناہیں

جاہل ذلیل ہووے دولت بھی ہووے بھاویں
علم دے باہجوں عزت وچ جہان ناہیں

علم ہتھیار جانو اہل ایماناں کارن
علم دے باہجوں ڈردا مول شیطان ناہیں

ساریاں علماں کولوں دین دا علم چنگا
کیہڑا اے علم جیہڑا وچ قرآن ناہیں

علم نے آدم تائیں سجدے دے لائق کیتا
باجھ ثبوتوں بولے ہرگز حسان ناہیں

دعوتِ اسلام

ہمیشہ خدادا ثنا خوان ہو جا
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دے اوپر صلاخوان ہو جا

مسلمان ہو جا مسلمان ہو جا
نہ نادان ہو جا نہ نادان ہو جا

مسلمان ہونا جے چاہیں بھراوا
مسلمان دے نال اک جان ہوجا

جے ہے لوڑ اگ توں رہائی دی تینوں
طریقے نبی ﷺ دے تے قربان ہوجا

طریقہ نبی ﷺ دا شریفاں دا چالا
توں داڑھی منا کے نہ بے آن ہوجا

توں مسواک دی تھاں تے حقہ بنایا
حیا کر خطا تے پشیمان ہوجا

مسواک کرنا سی پیارا نبی ﷺ نوں
توں سنت نبی ﷺ دا قدردان ہوجا

اٹھا دونوں ہتھیں کتاب اور سنت
مجسم عدل دی توں میزان ہو جا

تو بدعت دے کوڑے لئی سیلاب بن جا
تے بیڑے کفر دے لئی طوفان ہوجا

مسافر رہو بن کے دنیا دے اندر
تے فردوس اعلیٰ دا مہمان ہوجا

قبر سامنے، موت سر تے کھڑی ہے
قیامت ہے نیڑے نہ بے دھیان ہوجا

نصیحت میری یا درکھ صرف اتنی
جو پہلاں مرن توں مسلمان ہوجا

مسلمان ہو جا مسلمان ہو جا

نہ نادان ہو جا نہ نادان ہو جا

مولانا نے اس نظم میں درد دل بیان کیا اور یہ وہی باتیں ہیں جو وہ مساجد میں، محافل میں، خلوت خانوں میں، ہمیشہ بیان کرتے رہے۔ اس نظم میں اطاعت رسول کی ترغیب ہے۔ اخوت ومحبت کا پیغام ہے۔ داڑھی، مسواک دیگر سنتوں پر عمل کی تلقین ہے۔ خصوصاً قبر اور موت کو یاد کرنے کی تاکید ہے۔ مولانا پورے خلوص سے یہ دعوت زندگی بھر سب کو دیتے رہے۔

سی حرفی

سی حرفی پنجابی شاعری کی ایک صنف ہے۔ کسی زمانے میں پنجاب میں سی حرفیاں لکھنے کا بہت رواج تھا۔ پہلا بند الف سے شروع ہوتا، پھر ب، پھر ت۔ اسی طرح حروف تہجی کی ترتیب سے ی تک سلسلہ چلتا تھا۔ یعنی تیس حروف میں شاعر بہت سی اہم باتیں بیان کر دیتا۔ مولوی عبدالستار، مولوی محمد دلپذیر، ہدایت اللہ وغیرہ شاعروں کی پنجابی زبان کی سی حرفیوں نے بڑی شہرت پائی۔ بعض ہندو شاعروں نے بھی سی حرفیاں لکھیں۔ ان سی حرفیوں میں جہاں نصیحت آمیز باتیں معرض بیان میں آتی تھیں، وہاں انھیں پنجابی ادب کے پھیلاؤ کا ذریعہ بھی قرار دیا جاتا تھا۔ چند لوگ بیٹھ جاتے۔ کوئی اچھی سی آواز والا کسی شاعر کی سی حرفی پڑھتا اور سننے والے بڑے غور سے سنتے اور محظوظ ہوتے۔ آخری بند میں شاعر اپنا نام یا تخلص لاتا۔

مولانا محی الدین لکھوی پنجابی کے شاعر تھے۔ انھوں نے بھی سی حرفی لکھی جو خالص تبلیغی نوعیت کی ہے اور آیاتِ قرآنی اور احادیث کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ ہر حرف کے تحت چار بند لائے گئے ہیں، لیکن شاعر نے کسی بند میں اپنا نام نہیں لکھا۔ یہ سی حرفی جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ صفحہ اول پر مصنفِ شہیر کا اسم گرامی اس طرح لکھا گیا ہے:

''بقیۃ السلف مولانا محی الدین صاحب لکھوی بن حضرت مولانا محمد علی صاحب لکھوی مدنی مرحوم، سابق ایم۔ ایل۔ اے''

مولانا محی الدین لکھوی کے حلقۂ ارادت میں یہ سی حرفی بہت مقبول ہوئی اور بہت پڑھی گئی۔

کسی اردو کتاب میں پنجابی نظم یا نثر لکھنے کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔لیکن یہ کتاب چوں کہ مولانا ممدوح کے حالات پر مشتمل ہے، اس لیے اس میں ان کا پنجابی کلام بھی آنا چاہیے جو خالص ناصحانہ انداز کا ہے۔اس طرح یہ کلام محفوظ بھی ہو جائے گا اور لوگ اس سے استفادہ بھی کریں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الف آکھے اللہ ہکا معبود ہے
اسلام بناں دین مردود ہے

کدے وی نہ رب نے قبول پاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ب آکھے بندیاتوں کر بندگی
بندگی دے باجھ او اگون زندگی

ویلا نہیوں فیر مڑ ہتھ آوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ت آکھے توبہ تیری بھاوے رب نوں
ہوون جے گناہ لکھ دھووے سب نوں

کر توبہ چنگا نہیوں چرلاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ث آکھے ثابتی توں منگ رب توں
ثابتی ہے دین وچ چنگی سب توں

ثابتی دے نال مولا بنے لاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ج آکھے جنتاں دا شوق رکھ توں
جاگ راتیں بندگی دا مزہ چکھ توں

ستیاں اوہ گھر نہیوں ہتھ آوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ح آکھے حکم سارے من رب دے
زندگی دے ساہ نہیوں مُل لبھدے

موتوں پچھے فیر ہے توں پچھوتا وناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

خ آکھے خوف رکھ نت رب دا
تقوے دے باجھ نہیوں راہ لبھدا

تقوے دے نال راہ دسیاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

د آکھے دین دی پچھان کر لے
موت کھلی سرتے دھیان کر لے

موتوں پچھے ویلا نہیوں ہتھ آوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ذ آکھے ذکر الٰہی خاص تے
منجن بنایا رب دلاں واسطے

ذکر الٰہی دل چمکاوناں۔۔
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

رنت رو رو آہیں ملدی
حاضری توں دینی سچی سرکار دی

رو رو گنا ہاں تائیں بخشاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ز آکھے زہد کما بندیا
دنیا وچ دل ناہیں لا بندیا

جنھیں دل لایا اس پچھتاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

س داسنیہاں سن کن لا کے
آکھیں توں سلام بہتا آ جا کے

آکھنا سلام جنہاں پیار پاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ش آکھے شرک ہے پلید بندیا
رکھ لے توحید ہو شہید بندیا

ہر حالے شکر بجا لیاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

صدق، صدقہ تے صبوری دسدا
صوم تے صلوٰتاں دی حضوری دسدا

انھاں کماں وچ مولا آزماوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ض آکھے نبی ﷺ پاک ضامن ہوگیا
جھ تے لنگوٹے دا جو مومن ہوگیا

جنتاں دے وچ اونہوں میں پہچاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ط آکھے کھواوناں طعام چنگا اے
سونہے تے اَن سونہے نوں سلام چنگا اے

طلب کریں علم توں جے نفع پاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ظ آکھے ظالماں نوں ٹھانہ ملسی
کہیڑی جگہ اونہاں نوں ٹھکانہ ملسی

ظالماں نے چھیتی سارا پتہ پاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ع آکھے عمل کماویں بندیا
ویہلی پنڈ علم دی نہ چاویں بندیا

ایسے علم تینوں ہے جے پکڑاونا
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

غ آکھے غصہ جانو ڈاکو جگ ہے
غفلت ہیگی چور تے غرور ٹھگ ہے

ٹھگاں چوراں ڈاکو آں توں بچ جاوناں
نیکیاں کمالے جنہاں نال جاوناں

ف آکھے تفسیر دساں کھول کے
فخر نہ کماویں مول مونہوں بول کے

فخر والا بول نہیوں رب بھاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ق آکھے قوت جے حلال کھاویں گا
عابداں دے وچ رتبہ اعلیٰ پاویں گا

حرام نہیوں رب نے قبول پاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ک ل م آکھن پڑھ کلمہ
کلمے دے نال رکھے رب شرماں

کلمے نے بندیاں نوں پار لاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ن آکھے نعمتاں دی پچھ ہووے گی
مہلت اوتھے سوچن دی نہ کچھ ہووے گی

ناشکریاں نے اوتھے ڈاہڈا پچھوتاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

وتاں کراوے یاد وعدہ رب دا
رب ہاں یا نہیں میں تساڈا سب دا

اقرار کر کے نہ بھل جاوناں
نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ہ آکھے تینوں ہے ہدایت چاہیدی
صحیح ہے حدیث تے روایت چاہیدی

نبی ﷺ دی حدیثوں سیدھا راہ
پاوناں نیکیاں کما لے جنہاں نال جاوناں

ء آکھے آساں تے امیداں کھوٹیاں
لمیاں وی ہون عمراں جانوں چھوٹیاں

اج یا سویرے موت پھیرا پاوناں
نیکیاں کمالے جہاں نال جاوناں

ی آکھے یادرکھیں متاں دتیاں
بازیاں توں نیکی دیاں کل جتیاں

بھل کے نصیحت بازی ہار جاوناں
نیکیاں کمالے جہاں نال جاوناں

ی حرفی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا کے ہم فکر اور مخالفین سبھی اس سی حرفی کو اپنی تقریروں میں پڑھتے ہیں۔ اس کی ہزاروں کاپیاں ہر سال لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔

سوہنی دھرتی

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایہہ دھرتی بھاگانوالی اے
پے وسدے نے سجن دشمن
ایہہ پیارورا گانوالی اے

پت رووے تے ددھ منگے
ایہہ ماتا ددھ چنگھاوی اے
پر جدوں چھڑاون لگے
اودوں نانی یاد کراندی اے

کی پچھدے اوہنی دھرتی
—— ایندے وچوں رب نے بنایا اے ——

وچہ ایندے ای لے جاسی
اس وچوں پھر اٹھایا اے

کی پچھدے اوسونی دھرتی
ایہہ کھا گئی شیر جواناں نوں
کئی وڈیاں، بڈھیاں، نڈھیاں
کئی شاہاں تے سلطاناں نوں

کی پچھدے اوسونی دھرتی
ایہنے پتر کئی کھڈائے نے
جیہڑے جیندے کھیڈن گودی
جیہڑے مرگئے پیٹ سمائے نے

ایہہ پیار کریندی نیکاں
نت تاہنگ ملن دی رکھدی اے
پنج واری یاد کریندی
نت بریاں نوں مندا تکدی اے

کی پچھدے اوسونی دھرتی
ایہدے پیٹ اندراساں جانا ایں
چھڈ باغ باغیچے دنیا
اساں کرنا گورٹھکانا ایں

کی پچھدے اوسونی دھرتی
سب گیت پے اسدے گاندے نے
جد آگیا سد الٰہی
پھرقبراں نوں روندے جاندے نے

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
سکھ ایتھے کسے نہ پایا اے
اساں اٹھتی (38) سال لنگھائے
قانون اسلام نہ آیا اے

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایتھے وڈھی چٹی جوان ہوئی
لئی چوہدر چور اچکیاں
رن گنڈی اے پردھان ہوئی

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
وچہ ریڈیو ملدیاں بانگاں نے
وچ وجن ساز تے واجے
وچ نقلاں نالے سانگاں نے

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایتھے ہر شے آکے پاک ہوئی
ایتھے رشوت ٹھگی چوری
ودھ اگے توں چالاک ہوئی

منہ پھر دے نے سادھ لوکائی
اتے گنڈے نے بے باک ہوئے
پامال ہوئیاں سب قدراں
سب ضابطے جل کے خاک ہوئے

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایتھے بدعت نہاتی دھوتی اے
ایتھے سنت پھر دی لُکدی
منہ اسپ چڑاوے کھوتی اے

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایتھے عورت ہے سردار بنی
ہر مجلس دااوہ گہنا
ہر مجمعے دا سنگھار بنی

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایہہ دھرتی ٹھگاں چوراں دی
ایتھے مُل وی عدل نہ لبھدا
ایہہ دھرتی رشوت خوراں دی

کی پچھدے اوسو ہنی دھرتی
اس دھرتی دی شان نرالی اے
ہر دھرتی دا کوئی والی اے
اس دھرتی دا اللہ والی اے

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایہہ دھرتی پاکستان بنی
ایتھے آیا ماہِ رمضان
کی عزت اسدی آن بنی

کئی لوک ذرا نہیں جھکدے نے
وچہ ڈیریاں حقے پخدے نے
پے سگریٹ پین مسافر
سگوں ہٹکیاں الٹا بکدے نے

کی پچھدے اوسو ہنی دھرتی
گل کیتیاں شرم پئی آندی اے
شرم آوے ویکھن والیاں
بے روزاں شرم نہ آندی اے

کی پچھدے اوسوہنی دھرتی
ایتھے سوہنیاں سوہنیاں شکلاں نے
منہ پوڈرنے چمکائے
سیاہ کیتے نے دل عملاں نے

ہے چنگی سوہنی دھرتی
سب لو کی ایہدے بیٹے نے
نہیں چھڈ دی بیٹا کوئی
سب وارووار سمیٹے نے

ہے دھرتی بے شک سوہنی
ودھ سوہنا دھرتی والا اے
جنھیں دھرتی پیدا کیتی
جیہڑا ساڈا رب تعالیٰ اے

دنیا دی بے ثباتی

ترجمہ فارسی اشعار:

چار ے کوٹاں پھر کے ڈٹھی دنیا فانی ساری
بندہ نئیں میں حاصل کیتی جے نہ عبرت بھاری

چادر چٹی سورج دے گھر لکھیا سخن عجیبا
سونے پانی نال لکھایا سن توں یار حبیبا

مغرور ہویوں توں چار دہاڑے دولت اُتے بھائی
تیتھوں کئی چنگیرے گزرے دولت جنہاں ہنڈائی

دیر نہ لگدی بادشاہاں دے ہوون کوچ چلانے
ڈٹھی تاج جڑاؤ سرتے شا میں اِٹ سرہانے



تینتیسواں باب

اہلِ خانہ کے نام دو اہم مکتوبات

کتاب کے گزشتہ ابواب میں ہم مولانا محی الدین لکھوی کی حیاتِ طیبہ کے تقریباً تمام اہم کوائف کا مطالعہ کر چکے ہیں۔کہیں قدرے اختصار کے ساتھ،کہیں کچھ تفصیل کے ساتھ۔ ان کی پوری زندگی خاص قسم کی دعوتی زندگی ہے۔ وہ عام لوگوں کو بھی احکام اسلام پر عمل کی دعوت دیتے ہیں، اولاد کے سلسلے میں بھی ان کا یہی معاملہ ہے، بہن بھائیوں کو بھی وہ اسلام کی تبلیغ فرماتے ہیں۔

اپنی اہلیہ محترمہ کو بھی وہ ایک خط میں اسلام کو مشعلِ راہ بنانے کی تاکید کرتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اسلام ان کی رگ رگ میں رچ بس گیا تھا۔ یہی ان کے اسلاف کا طرزِ عمل تھا۔کتاب کے ابتدائی ابواب میں ان کے آباواجداد کا وضاحت سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ اسلام کے صحیح ترین مبلغ تھے۔ان کی تصانیف بھی یہی تلقین کرتی ہیں، ان کے سلسلۂ تدریس کا بھی اصل مقصد یہی تھا اور ان کے مواعظ بھی اسی کی صراحت کرتے ہیں۔مولانا محی الدین لکھوی عمر بھر انہی کے نقش قدم پر چلتے رہے۔یہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اور یہی ان کا شب وروز کا معمول تھا۔سفر میں، حضر میں، انھوں نے اسلام کی اشاعت کی اور ہمیشہ اسی کو مقصدِ زیست قرار دیے رکھا۔

1963ء میں وہ بسلسلۂ تبلیغ ملتان کے بعض دیہات میں گئے۔ ان کے ایک بیٹے حامد

بھی ان کے ساتھ تھے جواب ماشاء اللہ ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ وہاں سے مولانا ممدوح اپنی اہلیہ محترمہ کو خط لکھتے ہیں جولائق ملاحظہ ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کس طرح دینی تربیت کرتے تھے اور اپنی اہلیہ کو بھی اس کی تاکید فرماتے تھے۔ پھر ان کی زندگی کس قدر سادہ تھی۔ سفر میں اپنے کپڑے وہ خود ہی دھو لیتے تھے۔ اتنے بڑے داعی وواعظ اور اچھے خاصے زمیندار ہونے کے باوجود اس قسم کے کاموں میں انھیں کوئی حجاب نہیں تھا۔ اس عمل کا تذکرہ بھی وہ بڑی بے تکلفی سے کرتے ہیں۔ اب ملاحظہ ہو مکتوب گرامی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اسے ایک مستقل باب کی حیثیت دے دی ہے۔

یکم شعبان المعظم 1383ھ

والدہ حامد سلمہ اللہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امابعد: الحمد للہ۔ میں اور حامد ابھی تک صحت وعافیت سے ہیں۔ کپڑے ہمارے سخت میلے ہو چکے ہیں۔ کل جمعرات ہے۔ ہم ان شاء اللہ نہائیں گے اور کپڑے صاف کریں گے۔

''ٹیٹو شاہ'' صرف ایک رات رویا تھا اور کبھی کبھی دن کو تھوڑی بہت ضد کرتا ہے۔ پھر ٹھیک ہو جاتا ہے۔ گنے اور مالٹے عام مل جاتے ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت کھیل بھی لیتا ہے۔ رات کو خوب لپٹ لپٹ کر سوتا ہے۔ صبح ہوتے ہی کہتا ہے کہ لاؤ کھانا۔ کھانے کے بعد پھر کہتا ہے۔ چلو چلیے! ابا جی چلیے! بس پھر ہم کوچ کر دیتے ہیں۔ رات کو میری چار پائی عموماً مسجد میں ہوتی ہے۔ صبح درس تک سوتا رہتا ہے۔ کبھی اٹھ کر میری گود میں آجاتا ہے۔ الحمد للہ سفر اطمینان سے طے ہو رہا ہے۔ اسی طرح ''ٹیٹو'' کا دل لگا رہا تو اور دس دن کے بعد ہم واپس آئیں گے ان شاء اللہ۔ آج ہمیں آٹھواں دن ہے۔

زکیہ۔ حفیہ۔ بریہ اور سلمٰی کی نگرانی تمھارے ذمے ہے۔ پیار سے، محبت سے، صبر وتحمل سے کام لے کر نماز اور قاعدہ پڑھایا کرو۔ زکیہ کو اسلام کی کتاب کا سبق بھی ضرور دیا کرو۔ سکول پڑھانے کا خیال مت کرو۔ گھر کی تھوڑی تعلیم ہی بہتر ہے۔ آج پوہ کی 3 ہے۔ حفیہ اور

زکیہ کے پاس کپاس فنڈ ہے تو ان کو جوتے خرید دو، یا خلیل سے لے لو۔ پھر ان شاء اللہ ادا کردیں گے۔ سفر میں خط لکھنے کو وقت نہیں ملتا۔ آج بڑی مشکل سے وقت ملا ہے۔ لیکن پھر بھی شام ہورہی ہے۔ نماز مغرب کا وقت قریب ہے۔ میں خط کو ختم کرتا ہوں۔ تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھو۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ نماز بروقت اور عاجزی سے پڑھا کرو۔ میرے لیے اور بچوں کے لیے دعا کیا کرو۔ میں بھی دعا کیا کرتا ہوں۔ صبر اور نماز کو اپنا شعار بناؤ۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے پیار کرو۔ کثرت سے استغفار پڑھا کرو۔ اللہ تعالیٰ ہماری آخرت نیک کرے۔ خلیل الرحمٰن کو السلام علیکم کہو۔ نماز باجماعت اور داڑھی کی تاکید کرو۔ اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی کو محبت اور اتفاق عنایت کریں۔ (آمین)

والسلام

محی الدین از چاہ مانے والا

کوٹ مول چند۔ 8 کسی

ضلع ملتان

بروز بدھ 18۔12۔63

خط خوانندگان محترم نے پڑھا۔ یہ 18۔دسمبر 1963ء کا مکتوبہ ہے۔ اس میں وہ اپنی اہلیہ کو تاکید فرماتے ہیں کہ وہ بچیوں کی تعلیم کا خاص طور سے خیال رکھیں اور سکول کے بجائے انھیں گھر میں خود تعلیم دیں۔ خلیل الرحمٰن ان کی اہلیہ کے بھائی ہیں۔ مولانا اہلیہ کی وساطت سے انھیں بھی احکام اسلام پر عمل کی تلقین فرماتے ہیں۔

اس قسم کے داعی اسلام اور مبلغ دین اب کہاں پیدا ہوں گے۔ اس نوع کے لوگوں کے ظہور کا بھی ایک خاص زمانہ اور خاص ماحول ہوتا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ بہت بڑے دینی خاندان میں پیدا ہوئے اور خالص دینی ماحول میں ان کی نشوونما ہوئی۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، اب پھر عرض کرتا ہوں کہ میں نے کئی سال مرکز الاسلام میں مولانا محی الدین لکھوی کے ساتھ گزارے ہیں۔ وہ صدقِ مقال اور خلوصِ قلب کے چلتے پھرتے پیکر تھے۔ اللہ کا خوف اور قبر و قیامت کا ذکر ان کی دعوتِ دین کا بنیادی محور تھا۔ بارگاہِ الٰہی سے یقین ہے کہ ان کی مغفرت فرما دی گئی ہوگی اور وہ جنت الفردوس میں مقیم ہوں گے۔

مکہ مکرمہ سے مکتوب گرامی

مولانا محی الدین لکھوی 1996ء کو حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے، جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں مستقل عنوان کے تحت کیا جا چکا ہے۔ اس موقعے پر مکہ مکرمہ سے انھوں نے اہل و عیال کو جو خط لکھا، اس میں بھی تبلیغی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایے

24۔رمضان المبارک 1416ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من محی الدین الیٰ ابناء ہ وبنا تہ واقرباء ہ کلھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امابعد

فاسل اللہ تعالیٰ لی ولکم العفو والعافیۃ فی الدنیا والاٰخرہ۔ اوصیکم بتقوی اللہ واتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الامور کلہ

1۔ نماز پنجگانہ مکمل خشوع وخضوع، مکمل وضوء اور با جماعت۔
2۔ پاجامے ایسے سلواؤ جو ٹخنوں سے اوپر رہیں نہ یہ کہ صرف نماز کے وقت اونچا کرو۔
3۔ ڈاڑھی کتروانا چھوڑ دو۔
4۔ ذکر الٰہی اور استغفار کی کثرت کرو۔
5۔ مہمانوں کی عزت اور خدمت کرو۔
6۔ تلاوتِ قرآن اور مطالعہ تفسیر کا التزام کرو۔

7۔ نمازِ صبح یا کسی نماز کے بعد باری باری درس یاد کرو۔

8۔ عزیزہ زہریٰ اور سمرہ کا خاص خیال رکھو، شفقت مدِّنظر رکھو۔

9۔ دین کو مقدم اور دنیا کو مؤخر کرو۔

10۔ عزیزہ زہریٰ سے گزارش ہے کہ غصہ آئے تو اعوذ پڑھا کرے۔ صبر و تحمل کی عادت ڈالے۔

بخدمت عزیزم حافظ احمد ❶۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

قرآن مجید کی حفاظت کرو۔ تفسیر کا مطالعہ کیا کرو۔ بہتر ہے کہ روزانہ ایک دو آیات کا درس دیا کرو۔ دین کو ذریعہ معاش نہ بناؤ بلکہ وسیلۂ معاد بناؤ۔

بخدمت عزیزم محمد حامد ❷۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ بے شمار الجھنوں میں مبتلا ہیں اور اوہام باطلہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ دعا کثرت سے اور عاجزی سے کیا کرو۔ **اللھم الھمنی رشدی و اعذنی من شر نفسی۔**

عامۃ المسلمین کو بھی مسلم شمار کرو اور ان کے ساتھ نماز کو جائز سمجھو۔ متضاد پالیسی چھوڑو۔ فاعتزل کا امر اس وقت ہے جب جماعۃ المسلمین نہ ہو۔ جب جماعۃ المسلمین موجود ہے تو اب اعتزال غلط ہے۔

بخدمت عزیزم مسعود الحسن۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نماز باجماعت پنجگانہ کی کوشش کرو۔ درس سنا کرو یا خود کسی تفسیر کا مطالعہ کیا کرو۔ عزیزہ زکیہ سلمھا اللہ کو سلام دو۔ اللہ تعالیٰ شفا دے۔ سب بچوں کو پیار اور خصوصاً عزیزہ نائلہ کو سلام و پیار۔

بخدمت عزیزم محمود الحسن۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نماز کے وقت دکان بند کر دیا کرو۔ کوئی نقصان نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔ اپنی اصلاح کرو۔ ڈاڑھی پوری رکھو۔ پاجامہ ٹخنوں سے اوپر رکھو۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ آپ کا

---

❶ یہ مولانا کے فرزند گرامی ہیں۔

❷ یہ بھی مولانا کے فرزند ہیں۔

پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا ہے۔ (اس سے) وضو ٹوٹ جاتا ہے اور نماز ضائع ہو جاتی ہے۔ رفع یدین اچھی طرح کیا کرو۔ گھر میں عزیزہ اور سب بچوں کو سلام و پیار۔ والسلام

الحمد للہ میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت و عافیت عنایت فرمائے۔

ہم 30 جنوری بروز منگل رات دو بجے جدہ پہنچ گئے تھے۔ لاہور ائیر پورٹ اور جدہ ائیر پورٹ پر سخت چیکنگ تھی، جس کی وجہ سے بہت دیر لگی اور بڑی پریشانی ہوئی۔ اس کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ عرب میں پہنچے تو محسوس ہوا کہ نئی دنیا میں آ گئے ہیں۔ پورا عرب بجلی سے روشن ہے، اور شہر تو شہر جنگل بھی جگمگا رہا ہے۔ اس قدر روشنی شاید دنیا میں کہیں نہیں۔ صاف شفاف سڑکیں۔ کاریں اور بسیں چلتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ کوئی تکلیف نہیں، کوئی دھڑکا نہیں۔ اللہ اکبر۔ عرب تو دنیا میں بہشت بنا ہوا ہے۔ فللہ الحمد۔ پیارے عازب سلمہ اللہ کو پیار۔ اور محلے کے نمازیوں کو میری طرف سے سلام۔

میں آپ سب کے لیے نام بنام اور تمام اہلِ اسلام کے لیے دعائیں کرتا ہوں۔ برخوردار شکیل اور عزیزم زید کو تاکید ہے کہ صبح کی نماز میں قنوت کیا کریں۔

برادرم حکیم احمد علی اور برادرم خلیل الرحمٰن کو خصوصی سلام۔

والحمد للہ رب العالمین۔

محی الدین از مکہ مکرمہ

13-2-96



چونتیسواں باب

میدانِ جہاد میں

کتاب کے پانچویں باب میں جو حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے حالات پر مشتمل ہے، بتایا گیا ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ ان کا عملی تعلق سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعتِ مجاہدین سے تھا۔ وہ سرحد پار جا کر جماعت مجاہدین کے مرکز کا دورہ بھی کر چکے تھے۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے مجاہدین بھی بھیجتے تھے اور مرکز کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کسی زمانے میں انھوں نے موضع لکھوکے میں اپنی ذاتی زمین میں پکی اینٹ کے چند کمرے تعمیر کر کے جماعت مجاہدین کی جہادی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کی تربیت کا انتظام بھی کیا تھا۔ یہ تربیت گاہ 1937ء میں میں نے دیکھی تھی۔ اس وقت جہادی تربیت دینے کا سلسلہ تو ختم ہو چکا تھا، البتہ ایک چار دیواری کے اندر وہ کمرے موجود تھے، جن میں حالات کے مطابق محدود سے پیمانے پر کئی سال پیشتر جہاد کی تربیت دی جاتی تھی۔ اس کا نام انھوں نے دارالاسلام رکھا تھا۔

پھر 1928ء کے لگ بھگ انھوں نے لکھوکے گاؤں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر مرکز الاسلام کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا، جس میں نوجوانوں کی جہادی تربیت اور ورزش وغیرہ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان نوجوانوں میں مولانا محمد علی لکھوی کے صاحب زادے مولانا محی الدین لکھوی بھی شامل تھے، جن کا گرم خون انھیں اس تربیت گاہ میں زیادہ سے

زیادہ سرگرم عمل رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ یہ اولین جگہ تھی جہاں مولانا محی الدین لکھوی نے ان حالات کی روشنی میں مجاہدانہ کرتب سیکھے۔ لیکن وہاں انھیں اس میدان میں اترنے کا موقع نہیں ملا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان آئے تو یہاں بھی ان کی یہ خواہش عملی رنگ اختیار نہ کرسکی۔ سالہا سال کے بعد افغانستان میں روس کے خلاف جہاد شروع ہوا تو اس وقت اگرچہ ان کی جوانی ختم ہوچکی تھی اور ان پر بڑھاپے کے آثار نے قبضہ جمالیا تھا، لیکن ان کا جذبہ جوان تھا جو انھیں کھینچ کر افغانستان کے پہاڑوں میں لے گیا اور وہ عملاً جہاد میں حصہ لینے لگے۔ ان کے صاحب زادے پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی بیان کرتے ہیں:

''مولانا چوں کہ ہمیشہ سے جہادی ذہن کے مالک تھے، اس لیے جب افغانستان کی صورتِ حال میں مرکز الدعوہ سامنے آیا تو انھیں بڑی خوشی ہوئی اور فرمایا مسلمانوں کو اب ایک پلیٹ فارم مل گیا ہے۔''

پروفیسر صاحب مزید فرماتے ہیں:

''مرکز الدعوہ سے آپ کی وابستگی عملی تھی۔ آپ مرکز کے لیے زبان سے جہاد کررہے تھے اور اس کے حق میں تقریریں بھی کرتے تھے۔ زندگی کے آخری لمحات تک ہر سال مرکز الدعوۃ والارشاد کے لیے اپنے ارادت مندوں اور عقیدت مندوں سے بے شمار فنڈ اکٹھے کرتے رہے۔''

پروفیسر صاحب کے بقول ''دوسری وابستگی آپ کی عملی جہاد سے متعلق ہے۔ آپ نے جہادِ افغانستان کے دنوں میں جولائی 1989ء میں پاراچنار بارڈر کراس کر کے صوبہ پکتیا میں جاجی ٹریننگ کیمپ میں دس روزہ تربیتی کورس میں حصہ لیا۔ اور پھر جلال آباد کے محاذ پر ''خیوا'' کے مقام پر مارٹر کا گولا فائر کیا، جس کے لیے ضروری ہے کہ فائر کرنے کے ساتھ ہی پیچھے کو ڈائیو کیا جائے، (یعنی الٹی قلابازی لگاتے ہوئے نیچے بیٹھنا) وگرنہ فائر کرنے والے کو خود اپنی جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ ان کے ساتھی مجاہدین نے بتایا کہ آپ نے فائر کر کے اس مہارت

سے پیچھے ڈائیو کیا کہ نوجوان مجاہد بھی حیران رہ گئے۔ مجاہدین کا بیان ہے کہ اگلے روز او۔ پی آیا اور بتایا کہ کل والا گولا (اس وقت کے صدر افغانستان) نجیب اللہ کے کیمپ پر گرا۔ وہاں تین فوجی مارے گئے اور کچھ زخمی بھی ہوئے۔ باقی سب بھاگ گئے۔ مرنے والوں کی لاشیں کئی دن وہیں پڑی رہیں، کسی نے نہیں اٹھائیں۔''

بہر حال مولانا ممدوح ابتدائے زندگی سے ہی مجاہدانہ سرشت کے مالک تھے۔ کچھ عرصہ وہ جہادِ افغانستان میں بھی مشغول رہے۔ وہ عام جہادی تنظیموں کے لیڈروں کی طرح، باہر بیٹھ کر بیان دینے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دینے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ میدان میں اتر کر عملی جہاد کے قائل تھے۔ افغانستان کے جہاد میں انھوں نے 75 برس کی عمر میں حصہ لیا اور خود محاذ پر جا کر اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر دشمن پر گولا باری کی۔ وہ ایک بہادر خاندان کے بہادر فرزند تھے۔ وہ جو کچھ قرآن و حدیث میں پڑھتے، اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اس خانوادۂ عالی قدر کے قابلِ تکریم ارکان نے جہاں درس و تدریس کی مسندیں آراستہ کیں اور بے شمار لوگوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دی، وہاں انھوں نے عمل کے میدان کو بھی رونق بخشی اور حالات کے مطابق جنگ و جہاد میں بھی حصہ لیا۔

افغانستان کے بعد عمر کے آخری دور میں انھوں نے جہادِ کشمیر کے لیے کمر ہمت باندھی اور مظفر آباد پہنچے۔ ان دنوں وہ بیمار تھے اور جگر کی تکلیف میں مبتلا۔ وہاں یہ تکلیف بڑھ گئی تو مجبوراً واپس آنا پڑا۔ کشمیر میں ان کے ساتھی مجاہدین کے بقول جذبے اور ہمت کا یہ عالم تھا کہ تیزی سے اس پہاڑ پر چڑھ جاتے جہاں نوجوان بھی ہمت ہار جاتے ہیں۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب افغانستان گئے، کتنا عرصہ وہاں رہے اور کن اہم شخصیتوں سے وہاں ان کی ملاقات رہی اور کب وہاں سے واپس آئے۔

کشمیر میں بھی ان کی آمد و رفت کی تاریخوں کا پتا نہ چل سکا اور ان کے ساتھیوں کے متعلق بھی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ بے شک ہم اس سلسلے کی تفصیلات سے محروم ہیں،

لیکن یہ ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، اس لیے اس کا ذکر ایک مستقل باب میں کیا گیا ہے۔

اس مجاہد عالم دین کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔



پینتیسواں باب

مرض اور وفات

چلتے چلتے ہم مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ کی زندگی کے آخری باب تک پہنچ گئے ہیں۔ چند لمحوں بعد یہ باب بھی ختم ہونے والا ہے اور پھر رہے نام اللہ کا۔!

یہ دنیا جسے ہم مستقل سمجھ رہے ہیں اور گمان کیے بیٹھے ہیں کہ یہ ہمیشہ رہنے والی ہے، بالکل عارضی ہے۔ ہم نے اپنے بے شمار ملنے والوں کو مردہ حالت میں دیکھا، ان کے جنازوں میں شریک ہوئے، ان کی صفِ ماتم پر بیٹھے اور ان کے دوستوں اور اہل وعیال سے ان کی وفات پر اظہارِ افسوس کیا۔ لیکن ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ جس طرح ہمارے یہ دوست احباب، ہمیں روزانہ ملنے والے اور ہمارے عزیز واقارب یہاں سے جارہے ہیں، اسی طرح ہم بھی کسی دن کوچ کر جائیں گے۔ ہم ہر میت کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ جس نے جانا تھا، وہ جارہا ہے، ہم تو یہیں کے رہنے والے ہیں اور نہایت آرام سے رہ رہے ہیں۔

مولانا محی الدین لکھوی ہر مجلس اور ہر وعظ میں موت کا ذکر کیا کرتے تھے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ قبل اس کے کہ موت تمھارے دروازے پر دستک دے اعمالِ خیر کو اپنا مشغلہ قرار دے لو۔ کیوں کہ نجات کا اصل ذریعہ اعمالِ خیر ہیں، اور مولانا ممدوح ہمیشہ اعمالِ خیر میں مشغول رہے۔

اب آیے دیکھتے ہیں مولانا کی دنیوی زندگی کا کس طرح خاتمہ ہوا اور وہ کس طرح بیماری کی منزل سے گزرتے ہوئے، موت کے دروازے تک پہنچے اور ہمیشہ کے لیے ہماری

نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

1997ء کی سردیوں کا موسم تھا اور رات کے نو بجے ہوں گے کہ اوکاڑہ سے مولانا معین الدین لکھوی کا ٹیلی فون آیا۔ فرمایا بھائی صاحب کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ معلوم نہیں تھوڑی دیر کے بعد کیا خبر سننا پڑے۔ آپ گھر میں رہیں اور ٹیلی فون اپنے قریب رکھیں۔ ممکن ہے اخبارات میں کوئی الم ناک خبر دینے کی ضرورت پیش آ جائے۔

مجھے یہ بات سن کر نہایت تشویش ہوئی اور 1937ء سے 1997ء تک کے ساٹھ برس کے لیل و نہار میں پھیلا ہوا طویل عرصہ ایک دم سمٹ کر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ان کا عالم شباب، ان کا دور کہولت، ان کا بڑھاپا، ان کا چلنا پھرنا، ان کا لباس، ان کا رہن سہن، ان کے وعظ و تبلیغ کا سلسلہ، ان کی اصلاحی کوششیں، سب باتیں ایک دم نظروں میں سما گئیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر مولانا معین الدین کی طرف سے اسی مضمون کا ٹیلی فون آیا جو تشویش میں مزید اضافے کا باعث بنا اور جس نے ذہن میں اور اضطراب پیدا کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا خاموشی رہی۔ پھر خود میں نے ان سے اوکاڑہ میں رابطہ پیدا کیا تو بتایا کہ اللہ کا شکر ہے، طبیعت سنبھل گئی ہے۔ یہ سن کر فوراً زبان سے نکلا! الحمدللہ علیٰ ذالك۔

مولانا محی الدین کو کچھ مدت سے جگر کی تکلیف تھی اور یہ تکلیف بڑی باعث تشویش تھی۔ مجھے اس کا علم اس وقت ہوا، جب میں نے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے حالات معلوم کرنے کے لیے ان کو خط لکھا اور اس خط کے جواب میں انھوں نے اس مرض کی اطلاع دی۔ یہ 1997ء کے اپریل کی بات ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ بہت کم زور ہو گیا ہوں۔ لکھنے پڑھنے کی بالکل سکت نہیں رہی۔

1998ء کے جنوری کا مہینا تھا اور اس کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ حافظ احمد شاکر نے رات کے وقت مجھے ٹیلی فون کیا کہ مولانا محی الدین لکھوی بیمار ہیں۔ کل فجر کی نماز کے بعد یہاں سے چلیں اور ان کے گاؤں جا کر ان کی عیادت کریں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ فجر سے پہلے ہم آپ کو گھر سے لے لیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن نماز فجر سے چند منٹ پہلے

حافظ احمد شاکر اور مرحوم قاری نعیم الحق میرے غریب خانے پر آئے۔ میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم اسی وقت چل پڑے، میرے گھر سے ایک کلومیٹر سے کچھ زیادہ فاصلے پر مسجد اہل حدیث ہے۔ اس مسجد میں فجر کی نماز ہم نے حافظ احمد شاکر کی اقتداء میں پڑھی اور دیپال پور کو روانہ ہوگئے۔ ناشتہ رائے ونڈ کے ایک ہوٹل میں کیا۔ وہاں سے اپنے دیرینہ دوست عبدالعلیم خاں مرحوم کے ہاں چونیاں پہنچے۔ انھوں نے ایک سکول جاری کر رکھا تھا اور وہ اس وقت سکول ہی میں تھے۔ اصرار کر کے چائے پلائی۔ اس کے بعد ہم راجووال کو روانہ ہوئے اور مولانا محمد یوسف سے ملے۔ ان کا ''دارالحدیث کمالیہ'' لبِ سڑک ہے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ میں وہاں پہلی دفعہ گیا تھا۔ ایک طویل قامت جوان کو انھوں نے آواز دی اور مسرت آمیز لہجے میں کہا: ''عنایت اللہ یہ دیکھو ''نقوشِ عظمت رفتہ'' والے اسحاق بھٹی ہمارے ہاں آئے ہیں۔''

مولانا عنایت اللہ امین وہاں مدرس ہیں اور ملنسار خوش مزاج عالم دین ہیں۔

مولانا محمد یوسف کا شمار ہمارے نہایت مخلص دوستوں میں ہوتا تھا۔ وہ لکھوی علمائے کرام کے عقیدت مند شاگرد تھے۔ ان سے ہم نے مقصدِ سفر بیان کیا تو وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوگئے۔ راستے میں ایک جگہ انھوں نے گاڑی رکوا کر پتا کیا کہ مولانا محی الدین اس وقت کہاں ہیں؟

بتایا گیا کہ اپنے گاؤں الہ آباد میں ہیں اور بیمار ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں پہنچے۔ وہ تکلیف کے باوجود ملاقات کے لیے باہر آئے۔ ان کے دو صاحب زادے انھیں لے کر آئے تھے۔ یوں تو وہ ابتدا ہی سے معتدل جسم کے مالک تھے، لیکن اب ہم نے دیکھا کہ وہ اس اعتدال کا بھی ایک خلاصہ ہو چکے ہیں۔ مولانا نے آتے ہی موت اور قبر و قیامت کی باتیں شروع کر دیں اور ان کی آنکھوں سے تیزی کے ساتھ آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ باتیں ہمارے نزدیک ''وصیت'' سے تعلق رکھتی تھیں اور یہ ان کی زندگی کی ہم سے آخری باتیں تھی جو ہم سن رہے تھے اور آخری ملاقات تھی۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا ہم ان کی خدمت میں

رہے۔ ان سے جانے کی اجازت طلب کی تو فرمایا چائے پی کر چلے جانا۔

آخری ملاقات اور آخری مصافحہ کر کے ہم وہاں سے چل پڑے۔ واپس آ کر راجووال مولانا محمد یوسف کے ہاں کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت مولانا محی الدین ہی کی باتیں ذہن میں گردش کرتی رہیں۔ اس کے بعد لاہور کو روانہ ہو گئے۔ آتے ہوئے مولانا یوسف نے ہمیں ایک ایک بوتل شہد کی عنایت کی اور پانچ چھ کلو بیب ہماری گاڑی میں رکھ دیے کہ راستے میں کھاتے جائیں۔ تمام راستہ مولانا محی الدین سے متعلق باتیں کرتے ہوئے طے ہوا۔

اس سے تقریباً ایک ماہ بعد 28۔فروری 1998ء کو رات کے آٹھ بجے کے لگ بھگ اوکاڑہ سے مولانا معین الدین نے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی کہ بھائی صاحب کی حالت بہت تشویش ناک ہے۔ پوچھا اگر اخبارات اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو کو کوئی اندوہناک خبر دینا پڑی تو اس کا انتظام ہو جائے گا؟

میں نے جواب دیا: اللہ سے دعا ہے کہ ایسا موقع نہ آئے، لیکن اگر خدانخواستہ کوئی حزن انگیز معاملہ پیش آ بھی گیا تو اس کے اعلان کا انتظام ہو جائے گا۔ اس سے تھوڑی دیر بعد پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مولانا معین الدین کی آواز آئی کہ بھائی صاحب کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ہے۔ چند منٹ گزرے تھے کہ تیسری گھنٹی ہوئی۔ تقریباً 9 بجے۔ اب انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں جو کچھ بتایا اس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی اور موت کے درمیان جو دو چار سانس کا فاصلہ تھا، وہ ختم ہو گیا ہے یعنی وقعت الواقعہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون بند ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد میں نے ان سے اوکاڑہ میں رابطہ پیدا کیا اور پوچھا: جنازہ کہاں ہو گا اور کس وقت ہو گا؟

مولانا کی وفات اوکاڑہ میں ہوئی تھی۔ دوسرے دن ٹرانسپورٹ کی ہڑتال تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے بیٹے کہتے ہیں جنازہ کل نماز ظہر کے بعد ان کے گاؤں (الہ آباد) میں ہو گا۔

میں نے عرض کیا: کل دس بجے ایک جنازہ آپ اوکاڑہ میں پڑھ لیجیے تاکہ اوکاڑہ اور اس کے اردگرد کے لوگ آسانی سے شامل ہوسکیں اور دوسرا جنازہ ظہر کے بعد گاؤں میں پڑھ لیں۔ کل بسوں کی ہڑتال ہے، اوکاڑہ میں جنازہ پڑھ لیا جائے تو اوکاڑہ اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں کو آنے جانے کی زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔

انھوں نے فرمایا: میں نے ان کے بیٹوں کو یہ مشورہ دیا تھا، وہ نہیں مانتے۔ اب تم ان سے بات کرلو۔

میں نے بات کی تو مجھے بھی وہی جواب دیا جو مولانا معین الدین کو دے چکے تھے۔ یعنی ہم میت کو ابھی گاؤں لے جائیں گے اور جنازہ اوکاڑہ میں نہیں پڑھا جائے گا، گاؤں ہی میں پڑھا جائے گا۔

اس کے بعد میں نے تمام اخبارات کے دفاتر میں یکے بعد دیگرے ٹیلی فون کیا اور وفات کی خبر لکھوائی جو صبح کو چھپی۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بھی اعلان ہوگیا۔ اخبارات پڑھ کر اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے اعلان سن کر ٹرانسپورٹ کی ہڑتال کے باوجود بے شمار لوگ دور دراز علاقوں اور شہروں سے الہ آباد پہنچے اور جنازے میں شریک ہوئے۔ لاہور سے بھی بہت لوگوں نے شرکت کی۔ حافظ احمد شاکر، مولوی ابوبکر صدیق، حافظ محمد اشرف سعید، قاری نعیم الحق نعیم اور ان سطور کا راقم اکھٹے لاہور سے روانہ ہوئے۔ ہم وہاں پہنچے تو ان کی میت چارپائی پر پڑی تھی اور روح جنت میں پہنچ گئی تھی۔ ان کے برادر صغیر مولانا معین الدین لکھوی نے جنازہ پڑھایا۔

جنازے سے قبل مولانا معین الدین نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے بھائی سے ہم نے کبھی کسی دنیوی کام کے لیے نہیں کہا۔ وہ ہمیشہ تبلیغ دین میں مصروف رہے اور اسی پر وہ خوش تھے۔ انھیں یکم مارچ 1998 کو ان کی زرعی زمین کے ایک کونے میں دفن کردیا گیا۔ دنیا کی 84 سالہ زندگی گزارنے کے بعد آخر میں یہی دو تین گز زمین ان کے حصے میں آئی۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جماعت اہلِ حدیث کے متعدد اکابر علماے کرام کی خبر وفات ان کے ضروری حالات کے ساتھ اخبارات میں اس فقیر نے شائع کرائی، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی اعلان کرائے گئے اور حتی الامکان میں نے ہر عالم دین کے جنازے میں بھی شرکت کی۔

فخر ومباہات کے طور پر نہیں، تحدیث نعمت کے طور پر یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ بعض اکابر علماے اہلِ حدیث پر ان کی زندگی میں (جن میں دو لکھوی بزرگ بھی شامل ہیں) اسی فقیر نے لکھا، اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھا تھا، حالاں کہ ان کے بے شمار عقیدت مند اور شاگرد موجود تھے جو نہایت فاضل اور سعادت مند حضرات تھے۔ مثلاً حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی رحمہ اللہ سے متعلق سب سے پہلے گزارشات اس گنہگار کی (3۔فروری 1950ء کے ''الاعتصام'' میں) شائع ہوئیں۔ پھر حضرت مولانا محمد علی لکھوی رحمہ اللہ کے بارے میں 24۔مارچ 1950 کے ''الاعتصام'' میں میرا مضمون چھپا۔ میری ایک کتاب ''بزم ارجمنداں'' پہلی مرتبہ مارچ 1999ء میں چھپی۔ اس سے تقریباً پچیس سال پہلے 19۔دسمبر 1973ء کو حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے وفات پائی۔ میں نے اس کتاب میں ان سے متعلق طویل مضمون لکھا جو 62 صفحات پر محیط ہے۔ اسی کتاب میں مولانا معین الدین لکھوی پر ان کی زندگی میں مضمون لکھا جو پنتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اور بھی بہت سے لکھوی علماے کرام پر مضامین لکھے جو میری کتابوں قافلہ حدیث، دبستانِ حدیث اور گلستانِ حدیث میں چھپے۔ معلوم نہیں اس فقیر پر بھی کوئی لکھے گا یا نہیں لکھے گا اور اس کے جنازے میں بھی کسی دوست کو شامل ہونے کے لیے وقت ملے گا یا نہیں ملے گا۔



چھتیسواں باب

مولانا کی وفات پر مختلف حضرات کے تاثرات

مولانا محی الدین لکھوی نے نہ کوئی بہت بڑا تصنیفی کام کیا، نہ بہت زیادہ تدریسی خدمات سرانجام دیں، نہ وہ کوئی سیاسی لیڈر تھے۔ نہ شعلہ بیان خطیب تھے، نہ سیاسی لوگوں سے کوئی تعلق رکھتے تھے، نہ سیاسی جلسے جلسوں سے انھیں کوئی واسطہ تھا۔ وہ صرف اللہ کے دین کے مبلغ تھے اور اس کی تبلیغ کی وجہ سے لوگ ان کا انتہائی احترام کرتے اور ان کی باتوں سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مختلف حضرات نے جن تاثرات کا اظہار کیا، وہ ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ یہ سطور 3 جولائی 2012ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اس حساب سے ان کی وفات پر ساڑھے چودہ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ تاثرات کا اظہار کرنے والے حضرات میں سے بھی کتنے ہی لوگ وفات پا چکے ہیں۔ وفات پانے والوں کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور زندوں کو خیر و عافیت کی نعمت سے نوازے۔ تاثرات کا اظہار کرنے والے ہر شخص کا پہلے نام لکھا گیا ہے، پھر ان کی تاثراتی تحریر درج کی گئی ہے۔ یہ چند حضرات کے تاثرات ہیں جو مجھے موصول ہوئے۔

ملاحظہ فرمائیے:

1۔ مولانا محمد یحییٰ رسول نگری۔ جامعہ عزیزیہ ساہی وال فرماتے ہیں:

”مخدومی و شیخی حضرت مولانا محی الدین لکھوی میرے مرشد تھے۔ میں باقاعدہ ان کے

حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔ وہ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ اس سلسلے کے چند واقعات پیش خدمت ہیں۔

''مولانا معین الدین لکھوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ ہم ایک ضروری کام سے اپنی گاڑی پر جارہے تھے کہ چلتے چلتے راستے میں گاڑی بند ہوگئی۔ ڈرائیور نے بڑی کوشش کی، لیکن گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ ہم سخت پریشان تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ مولانا محی الدین بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے فرمایا: میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں۔ وہ بسم اللہ پڑھ کر اسٹیرنگ پر بیٹھے اور گاڑی فوراً اسٹارٹ ہوگئی۔ پھر جہاں ہم نے جانا تھا، پہنچ گئے۔

''یہی مولانا محمد یحییٰ رسول نگری بیان کرتے ہیں کہ گگومنڈی کے مولانا عبدالرحیم نے بتایا کہ ان کا بیٹا فوج میں ملازم تھا اور وہاں سے بھاگ کر گھر آگیا۔ اب پولیس والے اس کی گرفتاری کے لیے ان کے گھر آنے لگے، وہ پریشان ہوکر مولانا محی الدین لکھوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی۔ مولانا نے فرمایا: لڑکے کو میرے پاس بھیج دو۔ چنانچہ لڑکے کو ان کے پاس بھیج دیا گیا۔ پولیس والوں کو اس کا پتا چلا تو مولانا کے گاؤں پہنچ گئے اور کہا کہ وہ فوجی لڑکا جو آپ کے پاس آیا ہے، ہمارے حوالے کیا جائے۔ مولانا نے فرمایا: اسے ہمارے پاس ہی رہنے دو، تم اسے لے جا کر کیا کرو گے، لیکن پولیس والوں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔ اب مولانا نے فرمایا اسے پکڑلو اور لے جاؤ۔ مولانا محمد یحییٰ رسول نگری کے بقول تھانیدار اسے پکڑنے لگا تو خوف زدہ ہوکر مولانا سے معافی مانگنے لگا اور لڑکے کو وہیں چھوڑ کر پولیس کے ساتھ واپس چلا گیا۔

''مولانا محمد یحییٰ رسول نگری ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ساہی وال کے محلّہ نور پارک کے ایک شخص مرزا محمد صدیق نے بتایا کہ ایک دفعہ ان کے گھر کے تمام افراد بیمار پڑ گئے۔ علاج معالجے کا سلسلہ چلا لیکن کسی کو آرام نہ آیا۔ نہایت پریشانی ہوئی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مولانا محی الدین لکھوی سے دعا کراؤ۔ وہ مولانا کی خدمت میں ان کے گاؤں گئے اور انھیں اپنے ساتھ ساہی وال لائے۔ مولانا نے دعا کی اور اللہ نے سب

مریضوں کو شفا عطا فرما دی۔

''مولانا محمد یحییٰ کے بقول مولانا محمد صادق ساکن 16 4/12 بھی حضرت مولانا لکھوی کی قبولیت دعا کے بعض واقعات بیان کیا کرتے تھے۔''

2۔ مولانا محمد حسین شیخوپوری مرحوم:

''مولانا محی الدین لکھوی اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔ نیکی کے کام کرنے کا انھیں انتہائی شوق تھا۔ اتحادِ ملت کے لیے عمر بھر کوشاں رہے والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس کی صحیح ترین مثال تھے۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔''

3۔ مولانا خوشی محمد کلیروی:

''میں نے اپنی زندگی کا بیشتر اور بہتر حصہ جو میری جوانی پر مشتمل تھا، مولانا محی الدین لکھوی کے ساتھ گزارا۔ میں نے کبھی ان کو کوئی خلافِ شرع کام کرتے نہیں دیکھا۔ وہ عمر بھر قرآن وحدیث کا درس دیتے رہے۔ ان کی رفاقت میں کبھی دل کو بے چینی نہیں ہوئی۔ پنجابی ادب سے انھیں بڑا تعلق تھا۔ اقبال سے بھی خصوصی شغف تھا۔''

4۔ مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری۔ حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ

''مولانا محی الدین لکھوی نے پوری زندگی ذاتی مفاد کو نظر انداز کیے رکھا۔ ہمیشہ للّٰہیت ان کے پیش نظر رہی۔ غیر شرعی کاموں سے سخت نفرت تھی۔ آپ کا تحریری اور تصنیفی کام تو نہیں ہے، البتہ تقریری سلسلے میں آپ کی خدمات لا جواب ہیں۔ مریدوں سے جہاد کی بیعت لیتے تھے اور خود ان سے زکوٰۃ وصول کر کے حق داروں تک پہنچاتے تھے۔ ہر کام کتاب وسنت کے مطابق کرتے۔ بے شمار لوگ ان سے فیض یاب ہوئے۔ ایمان اور رشد وہدایت کا منبع تھے۔ عمر بھر اتحاد بین المسلمین کا جذبہ دل میں رہا اور اس کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اللہ کے خوف سے بے تحاشا روتے۔''

5۔ میاں طفیل محمد مرحوم (سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان)

"مولانا محی الدین لکھوی جیسا شخص اس قحط الرجال میں ملنا محال ہے۔ نہایت خدا پرست اور باعمل عالم تھے۔ ان کی نماز بے مثال تھی۔ ایسی نماز میں نے زندگی بھر کسی اور کی نہیں دیکھی۔ نماز میں اتنا خشوع و خضوع کہ دیکھنے والے دم بخود رہ جاتے۔ ان کا طرزِ عمل فقیرانہ تھا، دنیا داروں سے کنارہ کشی کرتے اور دین داروں سے محبت۔ 1951ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ لیکن یہ ماحول ان کے لیے اجنبی تھا۔ فرمایا کرتے یہ دنیا داروں اور دنیا پرستوں کا اڈہ ہے۔"

6۔ مولانا معین الدین لکھوی مرحوم و مغفور:

"بھائی صاحب نے پوری زندگی دین کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ انھیں گھریلو معاملات اور سیاسی امور سے کوئی غرض نہ تھی۔ صرف فکر آخرت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ساری عمر جہاد کا شوق رہا۔ دینی معاملات کے علاوہ کسی طرف دھیان نہ تھا۔ سب دنیوی معاملات میرے ذمے تھے۔ حتیٰ کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے کے بعد جائداد کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں بھی انھوں نے ذرہ بھر کوشش نہیں کی۔ ان کی زندگی اور ان کا طرزِ عمل خود میرے لیے اور میرے جیسے بے شمار لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروڑوں رحمتوں سے نوازے اور قیامت کے دن ہمیں اکٹھا کر دے۔"

7۔ پروفیسر غفور احمد نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان:

"مولانا محی الدین مرحوم و مغفور نے اس آزمائش اور ابتلا کے دور میں مطلب پرستوں اور دنیا داروں کے درمیان رہتے ہوئے کبھی آخرت کو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے ایسی زندگی گزاری ہے، جس کا ہر لمحہ اللہ کی یاد میں اور آخرت کو سنوارنے میں بسر ہوا۔ ان کی صالح زندگی نہ صرف ان کے اور اہلِ پنجاب کے لیے بلکہ تمام اہلِ پاکستان کے لیے سعادت کا سبب تھی۔ اللہ ان کی عبادات قبول فرمائے، ان کا پیغام رہتی دنیا تک زندہ رکھے، اور ان کا

مقام بلند فرمائے۔ آمین۔"

8۔ مولانا محمد اسلم سلیمی۔ جماعت اسلامی۔ منصورہ۔ لاہور

"میں مولانا محی الدین لکھوی کا پرانا عقیدت مند اور خادم ہوں۔ مولانا نے سلف صالحین کی طرح زندگی گزاری۔ وہ کامل ولی اللہ تھے۔ تمام عمر دعوتِ دین میں مصروف رہے۔ ان کا ہر عمل سنتِ رسول (ﷺ) کے مطابق ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے۔"

9۔ حافظ احمد شاکر مدیر ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور

"مولانا محی الدین لکھوی دائماً عابد شب زندہ دار اور زاہد مرتاض تھے۔ کسی سائل کو واپس نہ کرتے۔ اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت کرتے۔ رحمت اور شفقت کا جذبہ طبیعت پر غالب تھا۔ ہر ملنے والے کو نصیحت فرماتے۔ ناراضی، رنجش، ذاتی پرخاش اور مخالفت سے ان کی زندگی مبرا تھی۔ دنیا کی بے ثباتی انھیں دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔"

10۔ شیخ الحدیث حافظ مفتی ثناء اللہ مدنی۔ لاہور

"میں گزشتہ دنوں کویت کے نجی دورے پر تھا۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ ہماری جماعت کے ممتاز عالم دین مولانا معین الدین لکھوی کے برادرِ بزرگ مولانا محی الدین لکھوی وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس قحط الرجال کے زمانے میں مولانا محی الدین لکھوی جیسے عابدو زاہد علما کا دنیا سے اٹھ جانا، ایک بہت بڑا خلا ہے۔ وہ نیک اطوار بزرگ تھے۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔"

11۔ مولانا سیف الرحمٰن الفلاح چک نمبر 34 (ضلع اوکاڑہ)

"حضرت مولانا محی الدین لکھوی بھی دنیائے فانی چھوڑ کر سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ ان کی وفات ہمارے لیے بہت بڑے صدمے کا باعث ہے۔ مولانا میرے سب سے پہلے استاذ تھے، جنھوں نے مجھے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھایا اور دین سے لگاؤ پیدا کیا۔ اس دوران

انھوں نے نہ مجھے کبھی ڈانٹا اور نہ ناراض ہوئے۔ ہمیشہ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ اگر وہ مجھ سے شفقت کا برتاؤ نہ کرتے تو شاید میں جہالت کے گڑھے سے باہر نہ نکل پاتا۔

''میری آخری ملاقات مولانا مرحوم سے 11۔فروری 1998ء کو ہوئی۔ بیماری نے ان کو اس قدر لاغر کر دیا تھا کہ بس ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آتے تھے۔ خیریت پوچھی اور کچھ باتیں کرنے کے بعد جب میں نے واپس آنا چاہا تو فرمانے لگے میرے لیے خصوصی دعا کرنا۔ راستے میں بار بار یہ خیال آتا رہا کہ مولانا کے پاس لوگ دعا کرانے کے لیے حاضر ہوتے تھے، آج وہ خود دعا کی درخواست ہم گناہ گاروں سے کر رہے ہیں۔ ان کی وفات سے جہاں ان کے صاحب زادوں اور دیگر اقربا کو صدمہ پہنچا ہے، وہاں جماعت اہل حدیث کا ایک ایک فرد سوگ وار ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔''

12۔ قاری محمد ابراہیم خلیل منصور پوری (چک نمبر ۵۳ گ ب)

''گزشتہ دنوں ہمارے قابلِ قدر فاضل رہنما حضرت مولانا محی الدین لکھوی وفات پا گئے۔ ان کی وفات پر بے حد صدمہ پہنچا۔ حضرت مرحوم ایک روحانی شخصیت تھے اور واقعتاً ولی اللہ تھے۔ ان کی نمازِ جنازہ میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی اور تمام وفات شدہ مسلمین و مسلمات کی مغفرت فرمائے۔''

13۔ مولانا عبدالجبار سلفی خطیب مرکزی جامع مسجد اہل حدیث، حویلی لکھا ضلع اوکاڑہ

''پیکرِ اخلاص وعمل، نفور از نمود وریا، بقیۃ السلف حضرت مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آیۃ من آیات اللہ تھے۔ انھیں دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ چند روز قبل مولانا محمد یوسف کی خدمت میں راجووال حاضری دی تو مولانا مرحوم کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ مولانا محی الدین لکھوی کے بعد جماعت میں کوئی شخص ان جیسا صالح اور نیک نہیں ہے۔ وہ اپنی وضع کی ایک منفرد شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں

اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی اولاد کو صحیح معنوں میں ان کا جانشین بنائے آمین۔''

14۔ عبدالحفیظ لکھوی دیپال پور ضلع اوکاڑہ

''بقیۃ السلف حضرت مولانا محی الدین رحمۃ اللہ علیہ نہایت خوش اخلاق اور نمونہ اسلاف تھے۔ انھیں دیکھ کر بزرگانِ دین، اولیائے کرام اور صحابہ کرام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا، لکھوی خاندان کے تمام افراد ان کی شرافت، نیکی اور عبادت کو بطور ضرب المثل بیان کرتے ہیں۔ مسجد محمدی اہل حدیث رتہ کھنہ روڈ دیپال پور ضلع اوکاڑہ کی بنیاد انھوں نے رکھی اور اس کے لیے لوگوں سے چندہ بھی لاتے۔ انھیں کسی قسم کا کوئی لالچ نہ تھا۔ ہر ماہ ایک جمعہ اس مسجد میں پڑھاتے۔ مجھے سمجھاتے کہ رشتہ داروں کی باتیں سن کر ناراضی نہ کیا کرو، دین کا کام کرتے رہو۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اشاعتِ اسلام اور تبلیغِ دین میں گزری۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی ہر قسم کی انسانی کم زوریوں سے درگزر فرمائے۔ عذابِ قبر سے محفوظ فرمائے۔ ان کی قبر کو جنت کا باغ بنا دے اور ان کی اولاد کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

''ان کی ایک کرامت سنیے! میرے محلّہ پیر محمدی رتہ کھنہ روڈ دیپال پور میں مولانا عبدالستار سفری بن مولانا عبداللہ سفری رحمۃ اللہ علیہ رہائش پذیر ہیں۔ انھوں نے خود اپنا واقعہ مجھے دو دفعہ سنایا اور پھر آج مورخہ 5۔ مارچ 1998ء کو تیسری دفعہ تصدیق کرنے کے بعد واقعہ تحریر کر رہا ہوں۔

''آج سے تقریباً تین سال پہلے کی بات ہے کہ ان کے گھر بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ پیدائش کے وقتِ مقررہ سے پندرہ دن زیادہ گزر چکے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر کو چیک کروایا گیا تو اس نے کہا بچہ ٹیڑھا ہے، بغیر آپریشن کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کی والدہ اور بچے کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ دائی نے بھی یہی کہا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ آپریشن پر بیس پچیس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ چنانچہ مولانا عبدالستار

صاحب رقم اکٹھی کرنے لگے۔ پھر خیال آیا کہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے حضرت مولانا محی الدین صاحب سے دعا کرائی جائے۔

تقریباً دن کے 9 بجے وہ مولانا محی الدین کے پاس ان کے گاؤں پہنچے۔ مولانا سے ملاقات ہوئی اور اپنی پریشانی بیان کی۔ مولانا نے انھیں بیٹھک میں بٹھایا اور گھر چلے گئے۔ وضو کر کے واپس آئے اور دو نفل نماز پڑھی۔ اس میں تقریباً پونے دو گھنٹے صرف ہوئے۔ سلام پھیرا اور پانچ چھ منٹ دعا فرمائی۔ پھر مولوی عبدالستار کی طرف منہ کر کے فرمایا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام کام درست کر دے گا اور ان شاء اللہ لڑکا عطا فرمائے گا۔ ہسپتال جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ گھر میں ہی مہربانی فرمادے گا۔ پھر فرمایا اپنی بیوی کو لے کر آؤ۔ چنانچہ مولوی عبدالستار صاحب اسی دن بوقت عصر اپنی بیوی کو لائے۔ حضرت مولانا نے کچھ پڑھا اور اسے کہا کہ اپنے ہاتھ باہر نکالو۔ مولانا نے ہاتھوں پر دم کیا اور کہا اپنے سر سے لے کر پاؤں تک ہاتھ پھیرلو۔ اسی طرح تین دفعہ دم فرمایا۔ چار دن گزرے تھے کہ نمازِ عشا کے بعد ولادت کے آثار پیدا ہوئے۔ عام دائی بلائی گئی۔ اور آسانی سے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگئی۔ اس وقت وہ لڑکا جس کا نام ناصر ستار ہے، الحمد للہ تین سال کا ہے۔'' [1]

مولانا رحمۃ اللہ علیہ مہمان نواز تھے۔ اور اگر کوئی سوالی آتا اسے خالی جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ صاف دل اور صاف گو تھے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

15۔ محمد یونس مدرسہ خادم القرآن حویلی لکھا:

''حضرت مولانا محی الدین لکھوی صاحب مرحوم پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل ہی اپنے علاقے لکھوکے میں دینِ حنیف کی تبلیغ میں مصروف تھے۔ الحمد للہ ان کی تبلیغ سے سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں نے عقیدہ توحید اپنایا۔ ان کا انداز بیان اتنا پرلطف تھا کہ انسان سنتا ہوا تھکتا نہ تھا۔ 1947ء کے بعد پاکستان آکر اس سے بھی زیادہ تبلیغ میں مصروف

[1] یہ سطور 2۔ جولائی 2012ء کو لکھی جارہی ہیں۔ اب اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہے۔

رہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی دعا قبول کی جاتی تھی۔ ایک وقت تھا کہ حویلی لکھا (ضلع اوکاڑہ) میں اہل حدیث جماعت نہ تھی۔ ایک دفعہ ماسٹر محمد حسن مرحوم نے مولانا موصوف کو جمعہ پڑھانے کی دعوت دی۔ لیکن شہر کے لوگوں نے مسجد میں جمعہ پڑھانے کی اجازت نہ دی کہ یہ لوگ اہلِ حدیث ہیں۔ پھر ایک چھپڑ کے کنارے پر کھڑے ہو کر مولانا سے دعا کرائی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کلمات سے دردِ دل سے دعا کی کہ یا اللہ ہمیں اپنا گھر بنانے کی توفیق عطا کرتا کہ تیرا دین لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اللہ کریم نے دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ آج الحمدللہ حویلی لکھا شہر میں تقریباً دس مساجد ہیں اور جماعت بڑی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے اخلاق وتقویٰ کو قبول فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے آمین۔"

16۔ صوبے دار نور احمد بن حاجی محمد رمضان: (الہ آباد) تحصیل دیپال پور۔

"حضرت مولانا محی الدین میرے استاذِ محترم تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ جس احسن انداز میں انھوں نے پڑھایا وہ فلاحِ دارین کا سبب ہے۔ مولانا صاحب کی تقریروں کا موضوع فکرِ آخرت اور دنیا سے بے رغبتی ہوتا تھا۔ زندگی سادہ اور قرآن وسنت کے مطابق تھی۔ حد درجہ سخی یوثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصه کا اعلیٰ نمونہ تھے۔

"تکلیف پر خود بھی صبر کرتے اور حلقۂ احباب کو بھی صبر کی تلقین فرماتے۔ خطبہ جمعہ میں اکثر والعصر سورۃ کی تلاوت فرماتے۔

"حضرت مرحوم کا شرک وبدعات کے خلاف جہاد جاری رہتا۔ اس کے لیے بڑی سے بڑی مخالفت کی بھی پروانہ کرتے۔ امتِ مسلمہ کے اتحاد کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور فروعی اختلاف سے اکثر دور رہنے کی تلقین فرماتے۔ ہر مسلمان کی عزت کرتے۔

"اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت مرحوم کی دینی مساعی کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور انھیں جنت الفردوس سے نوازے۔"

17۔ چودھری بشیر احمد: آئرن سٹور دیپال پور ضلع اوکاڑہ

"مولانا مرحوم کی وفات سے تقریباً تین ماہ پہلے میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا۔

عرض کیا کہ آپ اپنی زندگی کا اچھا عمل جو ہمارے لیے وصیت ہو بیان فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ بیٹا آپ تیسرے کلمے کا جو کہ آپ نے پڑھ کر سنایا کثرت کے ساتھ ورد کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ سب کام درست فرمادے گا ان شاء اللہ۔ دعا ہے اللہ رب العزت مولانا صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین''

18۔ پروفیسر اعجاز احمد: گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور۔

''میرے لڑکپن کے دن تھے۔ والد صاحب دکان پر کبھی کبھی بٹھادیا کرتے تھے۔ ہمارا چشموں کا کام تھا۔ کبھی کبھار ایک لمبے قد کے ادھیڑ عمر بزرگ ہنڈا موٹر سائیکل پر آتے۔ معلوم ہوا کرتا تھا کہ کسی لمبے سفر سے لوٹے ہیں۔ مخاطب ہوتے۔ بیٹے! اپنے والد سے کہنا میری عینک ٹھیک کردیں۔ یہ پہلا تعارف تھا جو مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ پھر ملاقات، تعلقات اور محبت بڑھی۔ ان کے بیٹوں سے دوستی ہوئی اور یہ بات مشاہدے اور تجربے میں آئی کہ حضرت مرحوم مجاہد ہیں اور دینِ حق کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ دنیا سے رخصت ہونے کے چند دن پہلے تک تبلیغ میں مصروف رہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے مقرب بندوں میں شامل فرمائے۔''

19۔ ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمود اختر، شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

''میں مولانا محی الدین کی زیارت سے محروم رہا۔ لیکن برادرم حماد لکھوی صاحب کی وساطت سے میرے ذہن میں ان کی شخصیت، ان کے تقویٰ اور دین میں ان کے تبحر کا ایک نقشہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات کو قبول ومنظور فرمائے اور ان کے آخرت میں درجات بلند فرمائے۔''

20۔ میجر (ر) فرخ حسین: دیپال پور

''حضرت مولانا محی الدین لکھوی اس دنیا میں نیکی کے لیے آئے اور آخرت میں جنت میں ہوں گے، ان شاء اللہ۔ ان کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ اور موجودہ حالات میں روشنی

کا مینار تھی۔ ان جیسے لوگ دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں؟"

21۔ محمد طیب گلزار خاں، منصورہ۔ لاہور

"محترمی ومکرمی مولانا محی الدین لکھوی صاحب جیسی علم دوست اور متوکل علی اللہ شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی خدمات عالیہ کو قبول فرمائے اور ان کے فیض کو جاری رکھے اور ان کی اولاد کو اپنے دین کی خدمت میں لگا دے۔"

22۔ ڈاکٹر محمد سعد صدیقی، شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

"آج محترم مولانا محی الدین لکھوی صاحب علیہ الرحمہ کی تعزیت کے لیے یہاں حاضری ہوئی۔

اللہ تعالیٰ مولانا کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائے ان کی قبر کو منور فرمائے، انھیں اعلیٰ علیین میں شامل فرمائے۔ ان کی اولاد واحفاد اور خاندان کو صبر واستقامت کے ساتھ اس صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت نصیب فرمائے۔ اللھم آمین والحمد للہ رب العلمین"۔ 5۔ مارچ 1998ء

23۔ میجر محمد سرور۔ موضع سرپیر ہٹھاڑ

"میری تہہ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے حضرت مولانا محی الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

"میری یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو ان کی تعلیم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔"

24۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی رانا۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج۔ گلبرگ لاہور

"اللہ تعالیٰ مولانا محی الدین لکھوی صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

25۔ پروفیسر محمد حسین وٹو پرنسپل گورنمنٹ کالج حویلی لکھا:

''مولانا محی الدین لکھوی صاحب اس علاقے کی نہایت معتبر اور معزز شخصیت تھے۔ اپنے پرائے سب دل سے ان کا احترام کرتے تھے۔ ایسی ہستیاں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کی اولاد کو ان کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین۔''

26۔ ماسٹر عبدالعزیز ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ستلج ہائی سکول اوکاڑہ:

''بڑے مولوی صاحب نے جس طرح پُر سکون زندگی گزاری، سوچ کر رشک آتا ہے، کاش ایسا ٹھہراؤ میری زندگی میں بھی آجائے۔''

27۔ پروفیسر مطیع اللہ باجوہ:

جناب پروفیسر مطیع اللہ باجوہ صاحب نے پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ صالح صاحب کی نگرانی میں مولانا پر ایم اے کا مقالہ لکھا ہے، جس میں خاصی تفصیل سے مولانا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا محی الدین لکھوی مرحوم نے اپنی ساری زندگی دعوت دین حق میں گزاری۔ تقویٰ آپ کو وراثت سے ملا اور نیکی آپ کا شیوہ تھی۔ اور ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمة آپ کا خاصا۔ آپ کی دعوت محبت کی بنا پر ہوتی تھی۔ مرکزی خیال ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی بہ صدق دل عبادت کرتے ہوئے اس کی بارگاہ سے انعامات کا حق دار بننا اور جہنم کی ہولنا کیوں سے بچنا ہوتا تھا۔''



سینتیسواں باب

چند تعزیتی مضامین

مولانا محی الدین لکھوی کی وفات پر بہت سے حضرات نے ان کے صاحب زادوں کے نام تعزیتی خطوط لکھے، جن میں مولانا کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور اپنے تعلقات کی وضاحت کی۔ یہ خطوط مولانا کی وفات (28۔فروری 1998ء) سے فوراً بعد کے ہیں۔یعنی زیادہ تر مارچ 1998ء کے پہلے ہفتے کے۔ان میں سے جو خطوط مل سکے وہ گزشتہ باب میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آئے۔

اب وہ تعزیتی مضامین ملاحظہ فرمایئے جو بعض اصحابِ قلم نے بعض اخباروں میں تحریر کیے۔ یہ وہ مضامین ہیں جو ہمیں دست یاب ہوئے، ممکن ہے اور بھی ہوں جو ہمارے علم میں نہیں آئے۔ ان مضمون نگار حضرات میں سے بھی بعض حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، لیکن یہ مضمون اسی طرح بیان کیے جارہے ہیں، جس طرح اخبارات میں شائع ہوئے۔

ان میں سے پہلا مضمون مولانا محمد ابراہیم خادؔم قصوری کا ہے جو کنگن پور (ضلع قصور) میں اقامت گزیں تھے اور وہاں انھوں نے جامعہ ابراہیمیہ کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا تھا۔ جماعت اہلِ حدیث کے یہ مشہور خطیب اور مقرر تھے۔ ان کا یہ مضمون 10۔مارچ 1998ء کے روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا۔اس کے بعد انھوں نے اسے ہاتھ سے لکھ کر مولانا محی الدین لکھوی کے صاحب زادۂ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی کو بھیجا۔

افسوس ہے مولانا محمد ابراہیم خادم قصوری 14۔اگست 2012ء کو وفات پا گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب ذیل میں ان کا مضمون پڑھیے۔

حضرت مولانا محی الدین لکھوی مرحوم سابق ایم۔ایل۔اے کا شمار اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں میں ہوتا تھا جن کی زیارت سے روح کو بالیدگی نصیب ہوتی تھی۔عمر بھر فرقہ واریت سے بالاتر رہے اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا کی دعوت کو مقصد حیات قرار دیا۔عابدوزاہد اور شب زندہ دار تھے۔تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا وطمعا ومما رزقنھم ینفقون کی عملی تصویر تھے۔آپ باعمل عالم تھے،جن کی دعوت وتبلیغ منفرد انداز کی تھی۔موت،قبر،احوالِ قیامت،عذاب دوزخ زندگی بھر یہی موضوع رہے۔بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگ آپ سے دعائیں لیتے۔ان کی کوشش اور تمنا تھی کہ پاکستان میں اسلام کا غلبہ ہو۔توحید وسنت کے سچے اور سچے داعی تھے۔

پاکستان میں آپ کے ارادت مند خاصی تعداد میں تھے۔آپ اہل حدیث جماعت کے عظیم ستون تھے۔عرصہ پندرہ سال سے اس بندۂ فقیر خادم قصوری کو ان کی خدمت کا شرف حاصل تھا۔میرے محسن اور روحانی باپ تھے۔28۔فروری 1998ء کو بروز ہفتہ رات (تقریباً 9 بجے) کے مابین 84 سال کی عمر پا کر اس دارفانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون سقی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ آمین۔آپ حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدنی مدفون مدینہ منورہ کے بیٹے تھے۔الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم تھے۔مولانا معین الدین لکھوی کے بڑے بھائی اور استاذ العلماء حضرت مولانا عطا اللہ لکھوی کے بھانجے تھے۔خاندان لکھویہ کی علمی وتبلیغی خدمات دنیا بھی میں مشہور ہیں۔آپ کے جدِ امجد حضرت حافظ محمد لکھوی مرحوم نے پہلی مرتبہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر پنجابی اشعار میں مکمل کی جو سات جلدوں پر ''تفسیر محمدی'' کے نام سے معروف ہے۔''احوال الآخرت'' اور ''زینت الاسلام'' بھی آپ کی مقبول ترین تصانیف ہیں،جن کو پڑھ کر بعض غیر مسلموں نے

اسلام قبول کیا اور بے شمار مسلمان بدعات اور غیر اسلامی رسوم کے ارتکاب سے تائب ہوئے۔مولانا محی الدین لکھوی مرحوم 1951ء میں پتوکی، چونیاں، کنگن پور کے حلقے سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

مولانا معین الدین لکھوی صاحب نے نہایت خشوع وخضوع سے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی ، جنازے سے قبل مولانا معین الدین نے فرمایا کہ میں اپنے بڑے بھائی کے مشن کو زندہ رکھوں گا۔ وہ اتنے اللہ والے تھے کہ کبھی دنیا کی فکر نہ کی۔ پوری زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کیے رکھی۔

مرشدی مولانا محی الدین لکھوی مرحوم نہایت سخی اور نرم مزاج تھے۔ ان کے جنازے میں حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی سمیت بہت سے شیوخ الحدیث، علما، حفاظ، خطباء، سیاسی رہنما، ارکان اسمبلی شامل تھے۔

مولانا محی الدین لکھوی عشاء کی نماز کے بعد جلد سونے کی تلقین کرتے تاکہ صبح کی نماز قضا نہ ہو۔

مجھے پنجاب کے اکثر تبلیغی پروگراموں میں آپ کی رفاقتیں میسر رہیں۔ کنگن پور (ضلع قصور) میں ریلوے اسٹیشن کے سامنے میرے دینی مرکز ''الجامعۃ الابراہیمیہ'' کی بنیاد مولانا مرحوم نے اپنے دست مبارک سے رکھی۔ اب اس کے ناظم میرے بیٹے محمد اسحاق خادم قصوری فاضل وفاق المدارس ہیں۔

مولانا محی الدین لکھوی مرحوم کے صاحب زادگان میرے نزدیک عباد الرحمٰن میں سے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمود لکھوی گورنمنٹ ڈگری کالج رینالہ خورد کے پرنسپل ہیں اور جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کے ناظم ہیں۔ مولانا کے دیگر صاحب زادے بھی تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہیں۔

مولانا محی الدین لکھوی کے شرکائے جنازہ میں سے جن حضرات سے میری ملاقات ہوئی، یہ ہیں: مولانا سید ضیاء اللہ شاہ بخاری، حافظ احمد شاکر مدیر ہفت روزہ الاعتصام، مولانا

محمد اسحاق بھٹی مصنف کتب کثیرہ، حافظ صلاح الدین یوسف، میاں محمد جمیل صاحب، حافظ محمد سعید امیر مرکز الدعوۃ والا شاد، مولانا محمد حسین شیخوپوری، مولانا محمد یوسف راجووال، مولانا محمود احمد غضنفر لاہور، حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی، پروفیسر عبدالغفور راشد، میاں نعیم الرحمٰن بن میاں فضل حق مرحوم، حاجی عبدالرزاق ایم۔پی۔اے، مولانا ارشاد الحق اثری، پیر مختار احمد ایم۔پی۔اے، ملک رشید احمد خاں ایم۔پی۔اے، حاجی سردار خاں سابق ایم،پی۔اے، شیخ الحدیث مولانا عبداللہ امجد چھتوی، مولانا عطاء اللہ طارق گگومنڈی، پروفیسر عبدالحکیم سیف کوٹ رادہ کشن، مولانا محمد ابراہیم خلیل، مولانا محمد اکبر سلیم الہ آباد، مولانا عطاء الرحمٰن شیخوپوری اور دیگر بہت سے حضرات۔

مولانا محی الدین لکھوی نے بہت سی مسجدیں تعمیر کرائیں۔ آپ ''آیۃ من آیاتِ اللہ'' تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی۔ آپ کے بارے میں بہت سی روایات مشہور ہیں۔ جن میں ایک یہ ہے کہ بھنا ہوا گوشت ہوتا تو اس میں تھوڑا سا پانی ڈال لیتے۔ صرف اس لیے کہ شوربے کا سالن آقائے نام دار صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

ان کے انتقال سے دودن قبل عیادت کے لیے کنگن پور سے دیپال پور کو روانہ ہوا۔ راستے میں راجوال سے مولانا محمد یوسف صاحب کو بھی ہمراہ لیا۔

مرحوم کے گھر جا کر عیادت کی اور کافی دیر میرا ہاتھ پکڑے رکھا۔ جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ لیکن نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ گفتگو زیادہ نہ کر سکتے تھے۔

ایک دفعہ اس فقیر نے کنگن پور چونیاں کے حلقے سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ مگر میری کامیابی اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھی۔ حضرت مرحوم نے الیکشن کے بعد فرمایا خادم قصوری پریشان نہ ہونا۔ اگر اسمبلی نہیں ہے تو نہ سہی۔ میدان تبلیغ میں تمھاری آواز ہر جگہ پہنچے گی اور اللہ والے تم سے ازخود دین کا کام لیں گے اور لوگ تجھ سے محبت کریں گے۔

ایک مقام پر احباب نے مولانا محی الدین لکھوی مرحوم سے درخواست کی کہ قحط سالی ہے، بارش کی دعا کریں۔ فرمایا سب باہر چلو۔ جنگل میں اشک بار آنکھوں کے ساتھ ''صلوٰۃ

الاستقاء" (بارش کی نماز پڑھائی) اللہ نے دعا قبول فرمائی۔ خوب بارش برسی۔ دیپال پور (ضلع اوکاڑہ) کے نواحی گاؤں موضع تارا سنگھ (الہ آباد) میں آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا۔ **اللھم اغفر لہ وارحمہ آمین یا رب العالمین۔**

مولانا محی الدین لکھوی کی یاد میں

یہ مضمون حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے تلمیذ مولانا عبدالعظیم انصاری مرحوم کا تحریر فرمودہ ہے۔ انھوں نے نہایت صاف الفاظ میں اپنے استاد زادہ مولانا محی الدین لکھوی کے حالات بیان کیے ہیں۔ یہ مضمون 20۔ مارچ 1998ء کے ہفت روزہ "الاعتصام" میں شائع ہوا۔ وہیں سے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ افسوس ہے مولانا عبدالعظیم انصاری 27۔ دسمبر 2002ء کو وفات پا گئے۔

مولانا عبدالعظیم انصاری کا مضمون ملاحظہ ہو:

عظیم خاندان کے عظیم فرزند مولانا محی الدین لکھوی 28۔ فروری 1998ء کو اس دارِفانی سے کوچ فرما کر عالم جاودانی کو روانہ ہو گئے۔

یہ عاجز مولانا محمد ابراہیم، پروفیسر محمد سعید عابد اور چودھری لیاقت علی بھلر پرنسپل ایلیمنٹری کالج قصور کی معیت میں قریباً ایک بجے تارا سنگھ پہنچا۔ تمام راستے جنازے میں شمولیت کرنے والے عقیدت مندوں اور عوام سے اٹے پڑے تھے۔ گاڑیوں، بسوں، ٹرالیوں اور دیگر سواریوں کی وجہ سے راستے بند تھے۔ ہم بمشکل اپنی گاڑی کو آگے لے جا سکے۔ پھر بھی ان کی اقامت گاہ سے کافی دور اتر کر پیدل وہاں پہنچے۔ اعلان کے مطابق ٹھیک ڈیڑھ بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ کندھا دینے کی بہت کوشش کی مگر بے پناہ ہجوم کی وجہ سے ناکام رہا۔ صرف چارپائی کو ہاتھ ہی لگا سکا۔

جنازے کے پیچھے حدِ نگاہ تک انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اس وقت امام اہل سنت حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول یاد آیا۔ آپ فرماتے تھے کہ:

''اہلِ بدعت اور ہمارے درمیان فرق دیکھنا ہو تو جنازے کے موقع پر دیکھا جاسکتا ہے۔''

دور دراز سے ہزاروں عقیدت مند، علاقے کے معززین، حکام وافسرانِ انتظامیہ اور عام لوگ جنازے میں شمولیت کے لیے آئے ہوئے تھے اور ابھی آرہے تھے۔

نمازِ جنازہ سے قبل مولانا محی الدین کے چھوٹے بھائی جناب مولانا معین الدین لکھوی (ایم۔این۔اے) نے بادیدۂ تر رندھی ہوئی آواز میں اپنے برادرِ بزرگ کے بارے میں مختصر مگر جامع خطاب فرمایا۔

آپ نے مرحوم کی زندگی پر سرسری تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے بزرگ بھائی مولانا محی الدین کی ساری زندگی درویشانہ اور فقیرانہ گزری ہے۔ دنیا کے ساتھ انھیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ہمہ وقت یادِ الٰہی اور فکرِ آخرت میں مصروف رہتے۔ اپنے عقیدت مندوں کو بھی یہی راہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے۔ انھیں دنیوی امور سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہاں تک کہ انھیں یہ بھی علم نہ تھا کہ ان کی جائداد یا زمین وغیرہ کتنی ہے۔ تمام زمینوں کی دیکھ بھال اور جائداد کی نگاہ داشت میں خود ہی کرتا۔ وہ ہر وقت ذکرِ خداوندی یا تبلیغِ دین میں مصروف رہتے۔

اس کے بعد نمازِ جنازہ بھی مولانا معین الدین نے پڑھائی۔ ان کے آخری دیدار کے لیے لوگ وفورِ شوق سے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ بمشکل چودھری لیاقت علی صاحب کی حکمتِ عملی سے بندہ آپ کے جسدِ خاکی تک پہنچا اور آخری دیدار سے مشرف ہوا۔

برصغیر پاک وہند میں مولانا محی الدین کا خاندان علمی، دینی اور روحانی لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے والد گرامی مولانا محمد علی لکھوی مدفون مدینہ منورہ سے (بندہ کو شرفِ تلمذ حاصل ہے) اجداد میں سے مولانا عبدالرحمٰن مدفون (مدینہ منورہ) حافظ محمد لکھوی اور حافظ بارک اللہ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وتبلیغ کے ذریعے قرآن وسنت کی اشاعت کا اہم فریضہ انجام دیا۔ اس خاندان کے ہزاروں شاگرد ملک اور بیرونِ ملک میں موجود ہیں۔ حافظ

محمد لکھوی نے قرآن مجید کی مکمل تفسیر پنجابی زبان میں نظم کی صورت میں سات جلدوں میں تصنیف کی۔ اس کے علاوہ زینت الاسلام، محامد الاسلام، احوال الآخرت، ابواب الصرف وغیرہ وقیع کتابیں ان کی تالیف کردہ ہیں۔ آپ کے والد گرامی مولانا محمد علی لکھوی نے استخلاصِ وطن اور ملک کی آزادی کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کی جماعتِ مجاہدین میں شامل ہو کر مجاہدانہ کارنامے انجام دیے۔ مسجد نبوی ﷺ میں بہت عرصہ درس حدیث دیتے رہے۔ وہیں وفات پائی اور جنت البقیع میں آسودہ لحد ہیں۔

غرضیکہ مولانا محی الدین لکھوی اور ان کے عالی مرتبت خاندان کی دینی، ملی اور علمی خدمات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو بہشتِ بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق بخشے۔ **اللهم اغفرله وارحمه وارفع درجته في المهديين۔ وادخله جنة الفردوس ۔ آمين**

حضرت مولانا محی الدین لکھوی کا حادثۂ انتقال

حضرت مولانا مرحوم سے متعلق یہ ایک خاتون شاہینہ طفیل کا مضمون ہے، جس میں مولانا کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مضمون 22۔مئی 1998ء کے الاعتصام میں چھپا۔ مطالعہ فرمایے۔

ایک دفعہ نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا: قرب قیامت میں علم اٹھالیا جائے گا۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا کس طرح یا حضرت؟ فرمایا: ''علماء کو اٹھا لیا جائے گا۔'' 28۔فروری 1998ء کی رات جید عالمِ دین اور بقیۃ السلف مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ اس جہانِ فانی سے عالمِ بالا میں منتقل ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم اپریل 1914ء میں لکھوکے (ضلع فیروز پور ہندوستان) میں ایک ممتاز دینی و علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا محمد علی ثقہ عالم تھے۔ سلسلۂ نسب 29ویں پشت میں حضرت علی مرتضیٰ سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی۔ 1933ء میں 587 نمبر لے کر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد قرآن کریم،

حدیث، فقہ، تفسیر، حرف ونحو وغیرہم علوم کی تحصیل کی۔ آپ کے اساتذہ کرام میں امام العصر حافظ محمد گوندلوی۔ آپ کے ماموں عطاء اللہ لکھوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

1928ء میں آپ کے والد گرامی مدینہ منورہ تشریف لے گئے، جہاں وہ پینتالیس سال تک مسجد نبوی میں درسِ قرآن وحدیث دیتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے 45 حج کیے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے،

آپ کے دادا مولانا حافظ محمد بن بارک اللہ لکھوی نابغۂ روزگار ہستی تھے۔ انتہائی دگرگوں حالات میں آپ نے اصلاحِ امت کا بیڑا اٹھایا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد کم وبیش 30 ہے۔ سب سے اہم کارنامۂ خیر آپ کی معرکہ آرا تفسیر قرآن ہے جو سات جلدوں پر مشتمل پنجابی نظم میں لکھی گئی۔ شعری حسن کے ساتھ ساتھ تفسیری نکات کا بھی خصوصی التزام کیا گیا ہے۔ حافظ صاحب کی تصانیف ''زینت الاسلام'' اور ''احوال الآخرت'' وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔ کسی زمانے میں یہ کتابیں پنجاب کے ہر گھر میں پڑھی جاتی تھیں۔

آزادی وطن کے بعد حضرت مولانا محی الدین لکھوی نے اپنے بہت سے رشتہ داروں کے ساتھ پاکستان ہجرت کی اور سب سے پہلا کام ''جامعہ محمدیہ'' کی ازسرِ نوتشکیل کا کیا۔ ''جامعہ محمدیہ'' آج بھی اوکاڑہ میں علم کی روشنی بکھیر رہا ہے۔

پاکستان میں منعقد ہونے والے سب سے پہلے انتخابات میں مولانا محی الدین موجودہ جغرافیائی اعتبار سے ضلع قصور کی سیٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ 1951ء میں ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہوئے۔ اس علاقے میں ان کے بے شمار عقیدت مند آباد ہیں، انھی کے ووٹوں سے وہ کامیاب ہوئے۔

خاندان لکھویہ کے یہ روحانی پیشوا بچپن ہی سے بعض خصوصیات کے حامل تھے۔ چھوٹی عمر میں آپ کا معمول تھا کہ مصلّٰی لے کر، روزہ رکھ کر جنگل میں نکل جاتے۔ وہاں مصروفِ عبادت ہوجاتے۔ عام بچوں کی طرح کبھی لہو ولعب کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

مولانا ممدوح ''العلماء ورثۃ الانبیاء'' کی زندہ تصویر تھے۔ دینی علوم میں مہارت کے باوجود علمی مجالس سے خاص طور پر رغبت رکھتے۔ یہی علم دوستی آپ کو امام العصر مولانا حافظ محمد گوندلوی کی مجلس میں لے گئی۔

حضرت مولانا مرحوم نے تمام عمر، دامے درمے، قدمے، سخنے جہاد کا وعظ کیا۔ خود گھڑسواری، جنگی کھیلوں اور گتکا کی تربیت حاصل کی۔ ان کا ذوقِ اسپ شناسی بڑا مشہور تھا۔ ''جامعہ محمدیہ'' (مرکز الاسلام) میں طلبہ کو بھی جہاد کی تربیت دیتے رہے۔ پاکستان آنے کے بعد افغانستان جہاد میں حصہ لیا۔ کشمیری مجاہدین کی اعانت بھی فرماتے رہے۔

مولانا لکھوی رحمہ اللہ مرکز الاسلام میں بالعموم دن کو روزہ رکھتے اور شب کو عبادت کرتے۔ شب بیداری کی بنا پر آپ کی آنکھوں میں ایک خاص نور تھا جو اللہ والوں کی نشانی ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی آپ پر پوری طرح عیاں تھی۔

انما الحیوۃ الدنیا لعب ولهو وزینة وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد

(اور خوب جان رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشا، زینت اور آپس میں فخر (وغرور) اور مال واولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے)

عمر بھر حضرت نے صلہ رحمی کو شعار بنائے رکھا۔ کبھی کسی سائل کو خالی نہ لوٹایا۔ آپ کی وفات پر اقربا اور عوام الناس کا ایک جم غفیر غم زدہ دکھائی دیا، جن میں بیشتر ایسے تھے جن کی آپ مالی اعانت کیا کرتے تھے اور اب وہ اس محرومی پر اشک بار تھے۔

مولانا اونچے قد کاٹھ، مضبوط جسم، جھکی ہوئی نظریں، روشن پیشانی اور مسکراتے ہوئے وجیہ چہرے کے مالک تھے۔ ہمہ وقت محبت الٰہی سے سرشار، شیریں گفتار اور بلند کردار تھے۔ اکل حلال، صدقِ مقال اور عملِ صالح سے مزین واعظِ بے مثال تھے۔ مستجاب الدعوات اور ذکرِ الٰہی سے رطبِ اللسان رہنے والی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں سے تھے۔

سورۃ العصر میں ارشاد ہے ان الانسان لفی خسر الاالذین اٰمنوا وعملوا

الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ مولانا نے اپنی حیات کو اس سورہ کا تابع بنا رکھا تھا۔ شریعتِ اسلامیہ کے تمام اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب۔

مولانا مرحوم آنحضرت ﷺ کی ہر چھوٹی بڑی سنت پر عمل کو دنیا ومافیہا سے افضل جانتے۔ تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد کا اہتمام رہتا۔ حتیٰ کہ آخری ایامِ حیات میں بھی جب کمزوری نے غلبہ پا رکھا تھا، سنت کے خلاف پانی تک نہ پیتے۔ دل ودماغ سنتِ نبوی ﷺ کی محبت سے سرشار تھے۔

حضرت مولانا لکھوی تمام عمر لوگوں کو فکرِ آخرت کی نصیحت فرماتے رہے۔ خوفِ آخرت آپ کی زندگی پر ہمیشہ غالب رہا۔ احکام الٰہی آپ کی تمام مصروفیات میں دریا کے پانی کی طرح رواں دواں رہے۔ ہر مسئلے کو آخرت کے نقطہ نظر سے دیکھتے۔ کبھی دنیا کو پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ گویا آپ اپنے افکار کو بصورت صدقۂ جاریہ چھوڑ گئے۔

خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ مولانا ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور مینارِ رشد وہدایت تھے۔ عقیدت مند آپ سے مل کر آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی سکینت کا سامان پاتے۔ یہ سب برکتیں کثرتِ تلاوتِ کلام پاک کی بنا پر تھیں۔ شدید بیماری کی حالت میں بھی جب غنودگی طاری رہتی، مسلسل ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن سے رطب اللسان رہتے۔ ہزاروں نیاز مند خدمت میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوئے۔

حضرت مولانا اگست 1997ء سے رحلت تک انتہائی علیل رہے مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ اللہ کی تسبیح وتحمید ہی وردِ زباں رہتی۔ آپ کے بڑے صاحب زادے حافظ محمد لکھوی آپ کی حیات ہی میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے تھے۔ اتنے بڑے صدمے پر بھی آپ نے صبر واستقامت کا دامن نہ چھوڑا اور فرمایا اللہ کی امانت تھی جو اس نے واپس لے لی۔

سادگی، وقار اور متانت ایمان کی علامات ہیں۔ آپ کی شخصیت ان خوبیوں سے مزین تھی۔ طبعاً انتہائی حلیم تھے۔ لباس میں بھی سادگی کو شعار بنایا۔ تمام عمر سفید لباس زیب تن کیا۔ سر پر سفید ٹوپی پہننا پسند کرتے۔

حضرت کے پس ماندگان میں چھے نرینہ اولادیں شامل ہیں۔ سب صاحب زادے پرہیزگار اور شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ اور ''جامعہ محمدیہ'' کی ترقی میں کوشاں۔ آپ اپنی اولاد کے لیے ہمیشہ یہی نصیحت پسند کرتے۔ **کن فی الدنیا کأنك غریب اوعابر سبیل** کہ دنیا میں اس طرح رہو جس طرح ایک اجنبی مسافر رہتا ہے۔

دعا ہے رب العالمین حضرت مولانا محی الدین لکھوی کو اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ پس ماندگان، اعزہ اور عقیدت مندوں کو صبرِ جمیل اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آہ! العبد التقی النقی مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ علیہ

مولانا عبدالجبار سلفی (حویلی لکھا ضلع اوکاڑہ) ممتاز عالم دین اور مولانا محی الدین لکھوی کے مخلص ترین عقیدت مند ہیں۔ مولانا سے متعلق ان کے بعض تاثرات گزشتہ صفحات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک مضمون 27۔ مارچ 1998ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا تھا، جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

یکم مارچ بروز اتوار بوقت صبح فون پر اطلاع ملی کہ گزشتہ روز یعنی 28۔ فروری بروز ہفتہ مولانا محی الدین لکھوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا مرحوم تقریباً 85 سال قبل اس دنیا میں تشریف لائے اور عاش حمیدًا امات حمیدًا پر رخصت ہوئے۔ ہزاروں بندگانِ الٰہی نے آپ کے وعظ وارشاد سے ایمان وہدایت کی نعمت حاصل کی۔ اور ایمان وعمل پر اس دنیا کو خیر باد کہا۔

آپ کریم بن کریم بن کریم بن کریم تھے یعنی آپ خود بھی عالمِ باعمل مبلغ اسلام تھے۔ اور آپ کے والد مولانا محمد علی لکھوی مدینہ منورہ میں حدیث کے استاد تھے اور وہیں ان کی دوسری شادی عرب خاتون سے ہوئی تھی، جس سے آپ کے دو بیٹے حسن اور حسین پیدا ہوئے۔ اور آپ کے دادا مولانا عبدالرحمٰن محی الدین لکھوی پنجاب کے مشہور بزرگ اور اہلِ دل عالم تھے۔ انھوں نے مرزائے قادیان سے ٹکر لی اور وہ آپ کے مقابلے کی تاب نہ

لا سکا۔ آپ مدینہ منورہ میں عالمِ آخرت کو تشریف لے گئے اور جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

آپ کے پردادا مولانا حافظ محمد لکھوی کو تو پورا پنجاب جانتا ہے۔ شاید ہی پنجاب کا کوئی دین دار گھرانا ان کی احوال الآخرت، زینت الاسلام، سیف الاسلام، انواعِ محمدی، تفسیرِ محمدی وغیرہ کتابوں سے خالی ہو۔ اوران کے والد حافظ بارک اللہ لکھوی مشہور ولی اللہ تھے۔ الغرض یہ گھرانا صدیوں سے پنجاب، سندھ اور حجاز مقدس میں خلقِ خدا کو راہِ خدا دکھا رہا ہے۔

بات مولانا محی الدین لکھوی سے شروع ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں زہد وتقویٰ اور توکل وانابت کا وافر ذخیرہ جمع کر دیا تھا۔ آپ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ آپ نے زندگی بھر کسی کا گلہ نہیں کیا اور آپ کی زبان پر کسی کے خلاف کبھی حرفِ شکایت نہ آیا۔

آپ بڑے ملنسار، حوصلہ مند اور بردبار تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے پہلے مصافحہ کرتے اور محبت بھرا معانقہ کرتے۔ ہر سائل کے سوال کا تسلی بخش جواب دیتے اور جو کچھ دل میں ہوتا، زبان پر لے آتے اور بلا خوف لومۃ لائم بیان کر دیتے۔ کسی کی مخالفت کی ذرہ بھر پروا نہ کرتے۔

فی الحقیقت آپ سچے فقیر، درویش اور عالم باعمل تھے۔ ریا ونمود اور شہرت طلبی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اشتہارات پر اپنے نام کے ساتھ القابات کو سخت ناپسند کرتے۔ بلکہ ایسی کانفرنسوں میں شرکت بھی نہ کرتے، جہاں ہوس پرست علما کا جمِ غفیر ہوتا۔

ایک مرتبہ منڈی احمد آباد (سابق منڈی ہیرا سنگھ) میں تقریر فرمارہے تھے کہ کسی نے آپ کا نام لے کر زندہ باد کا نعرہ لگایا تو آپ نے اسے سخت الفاظ میں ڈانٹا۔

آپ وعدے کی پابندی کرتے۔ کبھی سواری نہ ملتی تو پیدل پہنچ جاتے اور کبھی زندگی میں وعظ پر روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ اگر کوئی آپ کو آپ کے مطالبے کے بغیر کچھ دے دیتا تو آپ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق کہ **اذا اتاك الله مالاً من غير طمع ولا اشراف نفس فلا ترده فانما هو رزق ساقه الله اليك** کے تحت قبول فرمالیتے۔ نہ ملنے پر کبھی ملال نہ کیا۔ اگر کسی نادار نے دس مرتبہ بھی بلایا تو فوراً اس کے ہاں چلے جاتے۔ اپنی تقریر میں دردِ

دل پیش کرتے۔ انھیں کسی کو کافر یا مشرک یا بدعتی بنانے کی عادت نہ تھی۔ بلکہ مشرکوں، کافروں، بدعتیوں کو مسلمان بنانے کی فکر تھی۔ مولانا مرحوم کو سب لوگوں کی ہدایت مطلوب رہی۔ اس لیے آپ دوسروں کو بھی یہی ہدایت کرتے کہ کسی مسلمان کو بلا دھڑک کافر یا مشرک نہ کہا جائے۔

آپ ساری زندگی جس قسم کی تبلیغ کرتے رہے اور جو چیز آپ کے دل میں پنہاں تھی، اس کا اندازہ ان کی منظوم سی حرفی سے لگایا جا سکتا ہے، جسے سن کر اہل دل اور اہل ایمان وجد میں آجاتے۔ [1]

سخاوت کا یہ عالم تھا کہ آپ کے پاس سیکڑوں ضرورت مند آتے۔ آپ اللہ کے دیے ہوئے مال سے ان کی معاونت کرتے اور بعض لوگ آپ سے قرض حسنہ لے کر جاتے اور واپس کرنے کا نام نہ لیتے۔ جب آپ نے کسی کو قرض کی ادائیگی کا احساس دلانا ہوتا تو کسی ملاقاتی سے کہتے۔ ''فلاں کو ہماری طرف سے سلام عرض کرنا۔'' جب چار پانچ سال گزر جاتے تو کھاتے پر خطِ تنسیخ پھیر دیتے اور کہتے کہ اگر ان اللہ کے بندوں کے پاس ہوتا تو وہ واپس کر جاتے۔ مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کسی کو کھانا کھلائے بغیر واپس جانے دیا ہو۔ جو کچھ گھر میں ہوتا فوراً حاضر کر دیتے۔ ناداروں اور مصیبت زدہ لوگوں کا درد ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ایک صاحب طویل علالت کے بعد آپ کے ہاں حاضر ہوئے اور قرضِ حسنہ طلب کیا۔ آپ نے اسے مطلوبہ رقم فراہم کرنے کے بعد آمد و رفت کا کرایہ بھی دیا اور کہا کہ آپ یہ رقم واپس نہ کریں، کیوں کہ آپ مستحق ہیں۔

نماز میں آپ کے خشوع و خضوع کے چرچے زبان زد خاص و عام تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف نے آپ کے پیچھے نماز ادا کی۔ آپ نے سورہ قمر تلاوت کی تو قیامت کا منظر عین الیقین نظر آنے لگا۔

ایک صاحب نے اتفاق سے آپ کے پیچھے نماز ادا کی تو پکار اٹھا کہ عرصہ دراز کے بعد کسی صاحبِ دل کے پیچھے نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا ہے، جس کے اللہ اکبر کہنے میں عجب سوز ہے۔

[1] یہ سی حرفی کتاب کے گزشتہ صفحات میں درج کی گئی ہے۔

آپ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ آپ کی دعا سے کتنے ہی لوگوں کی اللہ نے تکلیفیں رفع فرمائیں اور بیماریوں سے نجات بخشی۔

آپ کو اللہ نے بے شمار خصوصیات سے نوازا تھا۔ آپ کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ ہم عاجز بندوں کی اللہ کے حضور عاجزانہ دعا ہے **اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔**

حضرت مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد یوسف انور کا شمار ہمارے دیرینہ دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک مدت سے مرکزی جامع مسجد اہلِ حدیث (امین بازار فیصل آباد) کے منصبِ خطابت پر فائز ہیں اور تحریر کا بھی ان کا خاص انداز ہے۔ شروع ہی سے مرکزی جمعیت اہل حدیث سے وابستہ ہیں اور اب اس کے اکابر میں گردانے جاتے ہیں۔ مولانا محی الدین لکھوی اور دیگر لکھوی علمائے کرام سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں مولانا سے متعلق انھوں نے جن پُر خلوص جذبات کا اظہار کیا ہے، وہ لائق ملاحظہ ہیں۔

کریم ابن کریم حضرت مولانا محی الدین لکھوی رحمۃ اللہ علیہ ان درویش منش علماء میں سے تھے جو نام ونمود سے بے نیاز ہو کر ذکر وفکر اور وعظ وتذکیر میں مگن رہتے تھے۔ اللہ نے ان کو زہد وتقویٰ اور سلف صالحین کی سی سادگی اور متواضع طبیعت عطا فرمائی تھی۔ آواز میں جلال آمیز شیرینی پائی جاتی تھی اور دلنشین پیرایہ میں جب وہ تقریر کے دوران قرآنی آیاتِ مبارکہ تلاوت فرماتے اور بعض اوقات اپنے جدّ امجد حضرت حافظ محمد لکھوی کی کتاب احوال الآخرت کے اشعار پڑھتے تو سامعین میں بھی اور خود ان میں بھی ایک خاص رقت پیدا ہو جاتی۔ ان کی عام تقریروں، جمعے کے خطبوں اور درس قرآن کا زیادہ تر موضوع فکرِ آخرت ہوتا۔ تقریر کے دوران جب اللہ اکبر کہتے تو اللہ تعالیٰ کے جلال وکبریائی کے تصور میں کھو جاتے۔

قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب اسمبلی کے پہلے انتخابات ہوئے تو یہ تحصیل چونیاں سے اس کے رکن منتخب کیے گئے۔اس حلقے میں اہل حدیث حضرات کی اکثریت ہے، یہ انہی کی کوشش سے کامیاب ہوئے۔

مولانا محی الدین لکھوی کے اور ان کے نامی گرامی آبا و اجداد کے حالاتِ زندگی تو مورخ جماعتِ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھ رہے ہیں، جو مولانا کے پرانے ساتھی اور ہم وطن ہیں، ہم تو ان کی بڑھاپے کی زندگی میں ان کی خدمات دینیہ سے روشناس ہوئے۔ان کی اس دور کی مجالس اور خطابت کی تاثیر سے جو تسکین حاصل ہوتی اس کے اثرات اب تک دل و دماغ میں موجزن ہیں۔

فیصل آباد میں شہر کے وسطی حصے میں مندر کی بلڈنگ میں مسجد رحمانیہ کا قریباً 55 برس قبل جب قیام عمل میں آیا تو مولانا لکھوی نے افتتاحی خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا تھا۔ راقم اس مسجد میں تیس سال تک خدمتِ خطابت انجام دیتا رہا ہے اور اب مولانا محمد صدیق کی وفات کے بعد گزشتہ بیس برس سے مرکزی جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار میں یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔

مولانا محی الدین لکھوی نے ایک مرتبہ ہفت روزہ تبلیغی اجتماع میں جو جمعرات کو مسجد رحمانیہ میں ہوا تھا، خطاب فرمایا۔ پھر دوسرے دن جمعۃ المبارک کا خطبہ بھی ارشاد فرمایا، جس سے لوگ نہایت متاثر ہوئے۔

کئی برس پہلے کی بات ہے کہ ضلع قصور کے قصبات کنگن پور اور شام کوٹ میں دو مرتبہ ان کے پُر تاثیر خطبات کے بعد مجھے تقریر کرنے کا موقع ملا اور ان مقامات پر ان کی ایمان افروز محفلوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔اس سے پیشتر خانیوال کے جلسے میں ان کی زیرِ صدارت میں نے چند منٹ کچھ گزارشات پیش کیں تو انھوں نے خوش ہو کر مجھے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ضخیم حجیتِ حدیث نمبر بہ طور انعام عطا فرمایا۔اس جلسے کے مہمان خصوصی حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی تھے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ساتھ شروع ہی سے وابستگی کے باعث زیادہ تر میل ملاقات اور روابط ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی کے ساتھ رہے جو ملک کے نامور سیاسی رہنما اور ممتاز عالم دین تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو اپنے عظیم القدر بزرگوں کے ساتھ جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

مولانا محی الدین لکھوی کے فرزندانِ گرامی میں سے جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی ناظم جامعہ محمدیہ اوکاڑہ اور پرنسپل گورنمنٹ کالج رینالہ خرد سے میرے گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر محمد حماد لکھوی شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی اور خطیب مسجد مبارک اہل حدیث (لاہور) سے بھی میرے روابط قائم ہیں۔ یہ دونوں بھائی ہمارے مخلص تریں عزیز ہیں اور جماعت اہل حدیث کا گراں قدر سرمایہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ انھیں اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو خوش رکھے اور یہ حضرات اپنے اسلاف کی طرح دین کی خدمت سرانجام دیتے رہیں۔

قیمتی لمحات

مولانا ابوبکر صدیق سلفی سے راقم کے تعلقات قیامِ پاکستان سے بہت پہلے سے قائم ہیں۔ ان کا گاؤں ''کرما'' ضلع فیروز پور میں لکھوکے سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں کے لوگ لکھوی علمائے کرام کے عقیدت مند تھے اور مسئلے مسائل کے لیے انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ نیک اور مخلص لوگ تھے۔۔۔ مولانا ابوبکر سلفی قیام پاکستان کے بعد طالب علم کی حیثیت سے لاہور آئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہیں سکول میں ملازمت کر لی اور پھر اسی شہر کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ 13 تا 19 جولائی 2012ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ''قیمتی لمحات'' کے عنوان سے ان کا مضمون چھپا ہے جو مولانا محی الدین لکھوی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مضمون اس کتاب (تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی) میں درج کیا جا رہا ہے۔ آپ مطالعہ فرمایئے۔

بندۂ عاجز راقم الحروف کا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی توفیق سے بچپن ہی سے مسجد

اور علماء سے تعلق رہا ہے۔ ہمارا گھرانا کوئی علمی گھرانا تو نہ تھا، البتہ والد مرحوم نمازی تھے اور بڑے بھائی بھی مسجد میں جایا کرتے تھے۔ میں کبھی بھائیوں کے ساتھ اور کبھی اکیلا ہی مسجد میں پہنچ جاتا۔ ہمارا گاؤں کرما آبادی کے لحاظ سے آس پڑوس کے دیگر دیہاتوں سے بڑا تھا۔ گاؤں کی مسجد کے امام مولوی شمس الدین مرحوم عالم اور طبیب تھے۔ ان کے تعلق سے اور عوام میں تبلیغ دین کے جذبے کے تحت علمائے کرام ہمارے گاؤں کی جامع مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے، مثلاً مولوی شہاب الدین زیروی مرحوم، مولوی میر محمد بھانبڑی اور دیگر علماء کئی کئی روز قیام کرتے۔ لوگ ان کے وعظ دلچسپی سے سنتے۔ ان علماء میں لکھوی برادران بھی تھے۔ مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی۔ یہ اس وقت بیس بائیس سال کے بالکل نوجوان تھے۔

ایک دفعہ مولانا محی الدین لکھوی نے جمعہ ہمارے گاؤں میں پڑھایا۔ جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد آپ کی مجلس میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ غالباً میں اس وقت سکول کی چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں بجلی نہ تھی، دستی پنکھوں کا رواج تھا۔ میں مولانا محی الدین لکھوی مرحوم کو دستی پنکھے سے ہوا دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب عقیدت مند لوگ چلے گئے، میں برابر دستی پنکھے سے ہوا دیتا رہا۔ میں نے کالر والی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ مجھے فرمانے لگے یہ کالر تو ٹھیک نہیں، اس کے بغیر قمیص صحیح ہے۔ میں بڑا شرمندہ ہوا۔ ایک ہاتھ سے دونوں کالر پکڑے رکھے اور دوسرے ہاتھ سے پنکھا جھلتا رہا۔ جب فارغ ہو کر گھر گیا تو میں نے والدہ ماجدہ سے قینچی مانگی۔ ان کے پوچھنے پر میں نے کہا میں اپنی قمیص کے کالر کترنا چاہتا ہوں، یہ جائز نہیں ہیں۔ والدہ مرحومہ نے فرمایا آئندہ قمیص میں کالر نہ لگوانا، انھیں رہنے دو مگر میں نہ مانا۔ قینچی سے کالر کتر ڈالے تو طبیعت میں سکون آ گیا۔ یہ واقعہ 35، 1934ء کا ہے۔

1950ء میں دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے صحیح بخاری شریف پڑھ کر مولانا سید داؤد غزنوی کے دستِ مبارک سے سند وصول کی۔ انہی

دنوں مسجد قدس چوک دالگراں لاہور میں مولانا محی الدین لکھوی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا فی الحال بخاری شریف پڑھ کر فارغ ہوا ہوں۔ فرمانے لگے اب بخاری شریف مجھ سے پڑھو، اس وقت ان کا غالبًا اشارہ یہ تھا کہ علم کے ساتھ ساتھ عملی اعتبار سے بھی تمھاری تربیت کروں گا۔

پنجاب اسمبلی کے پاکستان میں پہلے الیکشن میں آپ قصور کے علاقے سے ایم ایل اے منتخب ہوئے۔ ان دنوں دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کی بلڈنگ کے ایک کمرے میں میری رہائش تھی۔ مولانا محی الدین لکھوی میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے مجھے مشورہ دو میں اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوں یا نہ؟ میں نے عرض کیا لوگوں نے آپ کو اپنا نمائندہ چنا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس نمائندگی کے مسئول ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ فرمانے لگے اللہ تعالیٰ کو تو میں جواب دے لوں گا۔ اسمبلی کے اجلاس میں شریک لوگوں سے میری طبیعت نفور ہے۔ میرا دل چاہتا ہے جنگل کی طرف بھاگ جاؤں۔

میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جون 1954ء سے مسجد نجم اہل حدیث احاطہ تھانیدار لاہور کی امامت اور دیگر امور کی ذمہ داری نبھا رہا ہوں۔

ایک دفعہ میں بچوں کو دعا یاد کرا رہا تھا۔ میں نے کہا:

"لا ملجأ و لا منجأ الا اليك۔"

مولانا محی الدین لکھوی میرے پاس تشریف فرما تھے، فرمانے لگے: بھائی! درست اس طرح ہے:

"لا ملجأ و لا منجأ منك الا اليك"

"منك" کی غلطی نکالی۔

میں ایک دفعہ ترجمہ قرآن پڑھا رہا تھا اور آپ بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ (ویأ توکم من فورھم ھذا) میں (فور) کا ترجمہ فوراً کیا۔ مولانا فرمانے لگے: نہیں، (فور) کے معنی یہاں جوش کے ہیں، یعنی اگر وہ اسی جوش میں آئیں تو ان کی نصرت میں پانچ ہزار

فرشتے آئیں گے۔

جامع مسجد نجم میں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ میرے نام بعض اداروں کی امداد کے لیے سفارشی رقعہ بھیجتے تھے۔

میں مولانا کا بے حد ممنون ہوں اگرچہ میں ان کا باقاعدہ شاگرد تو نہ ہوا لیکن جو انھوں نے میری اصلاح فرمائی وہ استاد ہی کے شان کی تھی۔ میں ان کا بے مایہ شاگرد ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائے اور ہمیں بھی نیک عمل کی توفیق بخشے، آمین۔

مولانا محی الدین لکھوی کے ساتھ میرا ایک اور تعلق بھی تھا، وہ میرے محترم ومکرم استاد مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے داماد تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہمارے گاؤں میں لوئر مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ نہایت پارسا اور حسنِ اخلاق کے پیکر تھے۔ طلباء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بہتر تربیت بھی فرماتے تھے۔ میں نے آپ سے بچپن میں فیض پایا۔ میرے استاد مرحوم کے نواسے اور مولانا محی الدین لکھوی کے بیٹے ڈاکٹر محمد حماد لکھوی اور ڈاکٹر محمد حمود لکھوی اور دیگر برادران اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پرہیزگار ہیں۔ میرے ان سے مخلصانہ تعلقات ہیں اور میرے ساتھ عزت سے پیش آتے ہیں۔ میں ان کے نانا کا شاگرد ہوں، اس کا انھیں پورا احساس ہے۔ ان میں اپنے باپ کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ انھیں دین ودنیا کی حسنات سے نوازے۔ زندگی بھر مولانا محی الدین لکھوی سے عقیدت مندانہ تعلق رہا تا آنکہ آپ کے جنازے میں اپنے مہربان دوست عمران حمید مرزا، جو ایک مخلص ساتھی تھے، کے ہم راہ شرکت کی سعادت ملی۔ زندگی کا تعلق تو ختم ہوا، لیکن جو فیض میں نے ان سے پایا وہ مجھے ان کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور مجھ گناہ گار کے گناہ معاف فرمائے، آمین یارب العالمین۔

اس باب میں خوانندگانِ گرامی نے حضرت مولانا محی الدین لکھوی مرحوم ومغفور سے متعلق مختلف حضرات کے تعزیتی مضامین پڑھے۔ ان میں سے (جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا) بعض حضرات وفات پاگئے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واقعہ یہ ہے کہ ان صاحبان نے مولانا کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ بالکل صاف ہے، اس میں کسی نوع کا الجھاؤ نہیں ہے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار اوصافِ حسنہ سے متصف فرمایا تھا اور ان کا شمار اللہ کے صالح بندوں میں ہوتا تھا۔



اڑتیسواں باب

حیات مولانا محی الدین لکھوی مرحوم کی چند روشن یادیں

(از پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی)

کتاب ضبط تحریر میں آچکی تھی کہ 8۔ اگست 2012ء کو مولانا محی الدین لکھوی سے متعلق ان کے صاحب زادہ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی (پرنسپل گورنمنٹ کالج رینالہ خورد ضلع اوکاڑہ) کا یہ مضمون موصول ہوا۔ اس عنایت پر میں ان کا شکرگزار ہوں۔ اس میں مولانا لکھوی کے بارے میں بعض ایسی معلومات درج ہیں، جن سے ہم آگاہ نہیں تھے۔امید ہے خوانندگانِ محترم ان معلومات کا دلچسپی سے مطالعہ کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں:

والد گرامی مخدومی حضرت مولانا محی الدین لکھوی ایک نامور عالم دین، کامل ولی اللہ اور سلف صالحین کا بہترین نمونہ تھے۔ آپ کی زندگی اسوۂ رسول ﷺ کی عملی تصویر تھی۔ آپ جیسے بزرگوں کے حالاتِ زندگی عوام الناس کے سامنے پیش کرنا اس لیے ضروری ہے کہ لوگ اپنے قریب کے زمانے میں اسوۂ رسول ﷺ کی ایک جھلک دیکھ سکیں اور انھیں معلوم ہو سکے کہ آج کے دور میں بھی شریعت پر عمل کیا جا سکتا ہے اور ہمارے بزرگ جو ہمارے جیسے انسان تھے، جب انھوں نے پاکیزہ زندگی بسر کی اور ہمیشہ سنتِ نبوی پر عمل پیرا رہے تو ہمارے لیے بھی پاکیزہ زندگی گزارنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس غرض سے بندہ والدِ گرامی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ایک کتاب تحریر کرنے

کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اب جب کہ مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے یہ ذمہ داری اٹھائی ہے تو میں بھی اس کار خیر میں حصہ ڈالنے کے لیے ان کی چند روشن یادیں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ کسی فرد کے لیے انھیں ہدایت کا ذریعہ اور میرے لیے نجات کا وسیلہ بنا دے۔

اسم گرامی: مولانا محی الدین لکھوی

ولدیت اور سلسلہ نسب: مولانا محمد علی مدنی بن مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی بن حافظ محمد بن حافظ بارک اللہ بن حافظ احمد بن حافظ محمد امین بن عالم شاہ بن ابوداؤد ڈھنگ شاہ

ولادت: 1914ء

جائے ولادت: موضع لکھوکے ضلع فیروز پور

ابتدائی تعلیم:

گھر سے تعلیم کا آغاز کیا۔ پھر مدرسہ محمدیہ میں زیر تعلیم رہے۔ گورنمنٹ مڈل سکول لکھوکے بہرام (ضلع فیروز پور) سے مڈل تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں جونیئر سپیشل سکول فیروز پور میں داخلہ لیا اور پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد واپس جامعہ محمدیہ میں داخلہ لے لیا۔

دینی تعلیم:

ناظرہ قرآن مجید والدہ سے شروع کیا۔ ترجمہ قرآن مجید کی تکمیل والد محترم سے کی۔ بعدازاں جامعہ محمدیہ کے جید علماء سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بخاری شریف کی ابتداء والد گرامی مولانا محمد علی المدنی سے کی اور بعد میں اپنے ماموں مولانا عطاء اللہ لکھوی سے بخاری شریف کی تکمیل کی اور دیگر کتب صحاحِ ستہ اور صرف ونحو، فقہ۔ فارسی زبان وادب کی گلستاں وبوستاں اور دیگر علوم مروّجہ کی تحصیل کی۔ اس طرح درسِ نظامی کی تکمیل فرمائی۔

درس وتدریس:

تکمیلِ تعلیم کے بعد اپنے والدِ گرامی کے قائم کردہ مدرسہ مرکز الاسلام میں

درس وتدریس کا آغاز کیا۔ لکھو کے سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جھوک ٹہل سنگھ ریلوے اسٹیشن کے قریب مرکز الاسلام کی بنیاد مولانا محمد علی مدنی نے رکھی تھی۔ مولانا محمد علی کے 1929ء میں مدینہ منورہ کو ہجرت کے بعد مدرسہ مرکز الاسلام کا انتظام وانصرام مولانا محی الدین کے سپرد کر دیا گیا۔ آپ تقسیمِ ہند تک اس مدرسے کو بخوبی چلاتے رہے۔ ہجرت کے بعد موضع کھرل کلاں علاقہ راجووال تحصیل دیپال پور ضلع اوکاڑہ میں اپنی آبائی زمینوں میں آباد ہوگئے۔ بعدازاں اس علاقے میں بہت بڑا سیلاب آیا اور تمام علاقہ زیرآب آنے کی وجہ سے کھرل کلاں کی سکونت ترک کر کے اوکاڑہ شہر محلّہ دارالسلام میں آباد ہوگئے۔ اوکاڑہ شہر میں جامعہ محمدیہ میں بطور مدرس خدمات سرانجام دینا شروع کیں، بعدازاں اپنی والدہ ماجدہ کے اصرار پر قلعہ تاراسنگھ تحصیل دیپال پور منتقل ہوگئے، اور تاحیات وہیں مقیم رہے۔ قلعہ تاراسنگھ میں آپ نے اپنے گھر کے ساتھ مسجد تعمیر کروائی اور مدرسہ مرکز الاسلام کا احیاء کیا۔

دینی خدمات:

مولانا محی الدین لکھوی نے ساری زندگی کتاب وسنت کی ترویج واشاعت اور دعوت وتبلیغ میں صرف کی۔ جامعہ محمدیہ سے سندِ فراغت کے بعد مرکز الاسلام میں خود درس وتدریس کا آغاز کیا۔ بطور استاد بچوں کو تعلیم دیتے رہے۔ نماز پنجگانہ کے علاوہ مرکز الاسلام میں خطبہ جمعہ بھی آپ کے ذمہ لگا دیا گیا تھا۔ راقم کی دادی امت اللطیف مرحومہ فرمایا کرتی تھیں کہ محی الدین کی ابھی ڈاڑھی نہیں آئی تھی، جب اس نے جمعہ پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

مرکز الاسلام میں جمعہ والے دن بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ گردونواح کے دیہات سے لوگ کثیر تعداد میں جمعہ پڑھنے کے لیے آتے اور جمعہ کے بعد آپ سے دینی مسائل اور اپنے ذاتی مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں سمجھتے اور اپنی روحانی وجسمانی بیماریوں سے شفاء کے لیے آپ سے دم کرواتے اور اپنی مشکلات اور الجھنوں سے نجات کے لیے دعا کراتے۔ آپ کی لوگوں کے حق میں کی ہوئی دعائیں اکثر قبول ہوجاتی تھیں، اس لیے آپ کو دینی حلقوں اور عوام الناس میں مستجاب الدعوات کہا جاتا تھا۔

شاعری:

مولانا محی الدین لکھوی شاعر بھی تھے اور ''حسان'' تخلص کرتے تھے۔ آپ کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

چشم بددور اب تو رہیے فکر ناؤ نوش میں
داد دیجے عیش کی فردوس چشم وگوش میں
نشہ صہبا اتر جائے گا شام زندگی
ہوش میں آئیں گے صاحب موت کی آغوش میں

(حسان)

نیا گل کون سا شاید کھلے گا
خدا کا عرش جانے کب ہلے گا
نہ موئے ریشِ مسلم ساجہاں میں
کوئی مظلوم ڈھونڈے سے ملے گا

(حسان)

گریجویٹ کی ہستی عجب ہے
نئی تہذیب نے ڈھایا غضب ہے
نہ پاس دیں نہ احساسِ ضلالت
مگر بی۔اے کا معنی بے ادب ہے

(حسان)

بھلا مخلوق کا صانع نہیں ہے؟
جو معطی ہے وہ کیا مانع نہیں ہے؟
ملے کھانے کو غم پینے کو غصہ
ہنوز اے نفس تو قانع نہیں ہے

(حسان)

بلاغ حق کا مبلوغ ہو جا
دباغ دین سے مدبوغ ہوجا
بظاہر اور بباطن اے مسلماں
خدا کے رنگ میں مصبوغ ہوجا

(حسان)

دعوت وتبلیغ:

آپ کی زندگی دعوت وتبلیغ کے لیے وقف تھی۔ اس کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں اپنایا۔ گھر میں ہوتے تو ارادت مندوں کے مسائل اور سماجی مصروفیات کے بعد جو وقت بچتا اسے مطالعہ میں صرف کرتے۔ اکثر نماز عصر کے بعد گھر کے صحن میں چار پائی بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہم سب بچوں کو جمع کرتے اور مشکوۃ المصابیح یا بخاری شریف کا درس دیتے۔ کبھی تفسیر ابن کثیر پڑھ کر سناتے اور کبھی ہمیں باری باری پڑھنے کو کہتے۔

عام طور پر منگل اور بدھ کے روز گھر میں قیام فرماتے۔ ان ایام میں مسجد میں نماز پنجگانہ کی امامت کراتے اور بعد نماز فجر بلاناغہ درس دیتے۔

جمعرات کو اپنے تبلیغی دورے پر روانہ ہوجاتے اور جہاں خطبہ جمعہ ارشاد فرمانا ہوتا اس گاؤں یا بستی میں جمعرات کی شام کو پہنچ جاتے یا کسی قریبی بستی میں قیام فرماتے۔ فجر کی نماز کے بعد درس دیتے اور جمعہ کے خطبے کے لیے اگلی بستی میں تشریف لے جاتے۔ جمعہ کے خطبے کے بعد لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے اور دم دعاء کرانے والے عقیدت مندوں کا تانتا بندھ جاتا۔ نماز عصر تک لوگوں کے مسائل سنتے، دعا کرتے اور بستی سے آنے والے بچوں، عورتوں کے لیے مختلف اشیا پر جو وہ ہمراہ لائے ہوتے دم کرتے جاتے۔

اس سلسلے میں بچپن کی یادوں میں ایک یادگار تبلیغی دورہ جو مجھے کبھی نہیں بھولتا، کھڈیاں

کے قریب موضع مرالی ہٹھاڑ کا ہے۔ سال میں ایک جمعہ مرالی ہٹھاڑ پڑھایا کرتے تھے۔ وہاں کے امام مسجد مولوی نظام دین آپ کو لینے آتے۔ ان سے قبل ان کے والد بابا سلطان مرحوم لینے آیا کرتے تھے۔

جمعرات کی شام تک مرالی ہٹھاڑ پہنچ جایا کرتے۔ پھر جمعہ کے خطبے کے بعد ہماری برادری کے حکیم محمد رفیق صاحب جو کوٹ موتا سنگھ سے اپنی گھوڑی لے کر آتے تھے ان کے ساتھ کوٹ موتا سنگھ چلے جاتے۔ رات وہاں قیام کرتے۔ فجر کے بعد درس ہوتا اور پھر عقیدت مندوں کی آمد تا دیر جاری رہتی۔ بعدازاں اردگرد کے دیہات کی طرف چلے جاتے، جن میں چورکوٹ، کھودے، لونیکی اور دیگر بستیاں شامل ہیں۔ پھر سوموار کو واپسی ہوتی اور منگل بدھ گھر میں قیام فرماتے اور دور دور سے آنے والے مہمان جو سوموار سے ہی آپ کے منتظر ہوتے تھے، ان کے مسائل سنتے اور ان کی مناسب راہنمائی فرماتے۔

ایک مرتبہ آپ مرالی ہٹھاڑ جا رہے تھے، راقم بھی ہمراہ تھا۔ مرالی ہٹھاڑ کا زیادہ تر لوگ پیدل سفر کرتے تھے۔ وہاں کے بڑے زمیندار حاجی بشارت ڈوگر مرحوم جو کہ والد گرامی کے مرید تھے اور حاجی اکبر ڈوگر بھی مرید تھے۔ یہ دونوں صاحبان اپنے امام مسجد کو والد گرامی صاحب کے پاس وعدہ یاد دلانے اور گاؤں میں لانے کے لیے بھیجتے تھے اور اکثر اپنا گھوڑا کھڈیاں تک بھیج دیتے تاکہ والد گرامی کو پیدل نہ چلنا پڑے۔

اس وقت کے امام مسجد مولوی نظام دین کے والد بابا سلطان والد صاحب کے استقبال کے لیے کھڈیاں آئے۔ ہم سب تانگے پر سوار ہو کر مرالی ہٹھاڑ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس دور میں مرالی ہٹھاڑ کی طرف کوئی راستہ اور سڑک نہ تھی۔ کھنگراں والا گاؤں تک کچی سڑک تھی اور اس سے آگے نہر پار کر کے مرالی ہٹھاڑ جانے کے لیے جنگل میں سے گاؤں کو سیدھ کر کے چلے جاتے تھے۔ سارا علاقہ سیم زدہ تھا۔ جگہ جگہ پانی کھڑا نظر آتا تھا۔ ہم سب لوگ تانگے پر سوار جا رہے تھے کہ اس سیم زدہ علاقے میں تانگہ پھنس گیا۔ ہم نیچے اترنے لگے کہ تانگے کو

کیچڑ سے نکالا جائے تو بابا سلطان مرحوم نے والد صاحب سے کہا آپ اور بیٹا بیٹھے رہیں۔ میں اور کوچوان خود تانگے کو باہر نکالیں گے۔ بابا سلطان بھاری جسم کے تھے۔ تانگے کے ایک بانس کو بابا سلطان نے پکڑا اور دوسرے کو کوچوان نے، دونوں نے مل کر جب زور لگایا تو تانگہ تو کیچڑ سے نہ نکل سکا البتہ بابا سلطان کیچڑ میں جا گرے۔

اس طرح دور دراز کے علاقوں میں کبھی پیدل، کبھی کسی سواری پر آپ کے تبلیغی دورے جاری رہتے تھے۔ بعض تبلیغی دوروں میں بندہ والد گرامی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس طرح کے بہت سے تاریخی تبلیغی دورے میرے ذہن میں محفوظ اور دل پر نقش ہیں۔

زہد وورع اور عفوودرگزر:

والد گرامی مخدومی مولانا محی الدین لکھوی عفوودرگزر کرنے والے نیک سیرت انسان تھے۔ دنیا سے بے رغبتی اور خدا خوفی سے دل سرشار تھا۔ زہد کا یہ عالم تھا کہ اپنی ذاتی اور وراثتی زمین کے بارے میں کبھی دلچسپی نہ لی اور تاحیات کبھی یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میری زمین کتنی ہے اور کہاں ہے۔ جتنا ٹھیکہ آپ کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی یا ان کے بیٹے بارک اللہ انجم دیتے، لے لیتے۔ کبھی استفسار نہ کیا کہ کتنا ٹھیکہ بنتا ہے اور کتنی زمین ہے۔ تاحیات یہی رویہ رہا۔

جب کوئی سوالی مسجد میں آتا تو جو وہ سوال کرتا اسے حتی الوسع وہی کچھ دینے کی کوشش کرتے۔ کئی مرتبہ سردیوں کے موسم میں اپنے اوپر اوڑھنے والی گرم چادر افغانستان سے محنت مزدوری کرنے کے لیے آنے والے پٹھانوں کو دے دیتے۔ ان کے لیے مسجد کے حجرے میں ٹھہرنے اور قیام وطعام کا بندوبست کرتے۔ دعوت وتبلیغ کے لیے جاتے تو اکثر اوقات جو کچھ مدعو کرنے والوں کی طرف سے خدمت کی جاتی وہ غریب غربا میں تقسیم کر دیتے۔ تبلیغی سفر سے واپسی پر دیپال پور شہر سے اس تانگے پر بیٹھتے جس کے پاس کوئی سواری نہ ہوتی۔ پھل فروٹ اس ریڑھی والے سے خرید کرتے جس کے پاس کوئی گاہک نظر نہ آتا۔ عفوودرگزر کا کمال نمونہ تھے۔ بڑی بڑی کڑوی کسیلی باتیں سن کر بھی غصہ نہ کرتے بلکہ معاف کر دیتے۔ ایک مرتبہ ایک

آدمی نے کہا کہ فلاں مولوی صاحب آپ کو گالی دیتے ہیں تو فرمایا بھائی ہم گالی لیتے ہی نہیں ہیں، وہ گالی دیتے ہیں تو دیتے رہیں۔ میری دادی مرحومہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ہمارے عزیز حکیم احمد علی صاحب کسی بات پر والد گرامی سے ناراض ہوگئے اور مسجد میں بیٹھ کر بہت تو تکرار کی اور سخت کلامی تک اتر آئے۔ والد گرامی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگلے روز ہی حکیم احمد علی صاحب گھر آئے اور دادی صاحبہ سے کہا کہ آپ سب لوگوں کی ہمارے گھر دعوت ہے۔ دادی اماں کہتی ہیں کہ میں بڑی حیران ہوئی کہ کل یہ لڑائی کر کے گیا ہے اور آج دعوت دینے آگیا ہے۔ معلوم نہیں محی الدین اس کی دعوت کا سن کر کیا کہے گا۔ جب والد گرامی گھر تشریف لائے تو دادی اماں نے بتایا کہ احمد علی دعوت کا کہہ کر گیا ہے۔ دعوت کھانی ہے یا نہیں۔ والد گرامی نے فرمایا گالیاں تو ہم نے کھالی ہیں، اب دعوت کھانے میں کیا حرج ہے، بلکہ دعوت قبول کرنا اور کھانا تو ثواب کا کام ہے۔

حلیہ:

آپ کی گوری رنگت، کشادہ پیشانی اور موٹی آنکھیں تھیں اور داڑھی قدرتی طور پر نہ چھوٹی تھی نہ بڑی۔ لیکن اختصار کے ساتھ چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مضبوط جسم اور لمبے قد کی بڑی بارعب شخصیت تھے۔ نظریں اکثر جھکی رہتیں۔ کسی کو نگاہ بھر کے نہیں دیکھتے تھے۔ جب کبھی کسی کو نگاہ بھر کے دیکھا تو اس پر رعب طاری ہو جاتا۔ شب بیداری اور عبادت کی وجہ سے آپ کی آنکھیں سرخی مائل تھیں۔

عزم وہمت:

والد گرامی عزم وہمت کا پہاڑ تھے۔ دینی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ کبھی پست ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دین کی خاطر مشکل سے مشکل کام کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے۔ دعوت وتبلیغ کے لیے بڑے بڑے مشکل سفر کیے۔ پھر جہادی تنظیم لشکر طیبہ (جواب مرکز الدعوہ کے نام سے کام کر رہے ہیں) کے لیے چندہ مہم میں بھرپور حصہ لیا اور اوکاڑہ، ساہیوال، قصور کے اضلاع میں بنیادی طور پر اس جہادی تنظیم کا تعارف والد گرامی کی وجہ سے ہوا۔ اس کی چندہ مہم کے سلسلے میں ایک مرتبہ دارالحدیث راجووال میں رات کو تہجد کے لیے

اٹھے تو چھت سے نیچے گر پڑے، لیکن مہم اسی طرح جاری رکھی۔ اپنی ذاتی گاڑی چندہ مہم کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ناکارہ ہوگئی۔ اپنی زمین کھرل کلاں نزد جھوک 2 ڈی راجووال میں مسجد کی تعمیر کے لیے خود ذمہ داری اٹھائی۔ آخری ایام میں صحت بہت خراب ہوگئی تو ہم سب بھائیوں نے عرض کیا آپ آرام کریں۔ ہم مسجد کی تعمیر کا بندوبست کرا دیتے ہیں۔ فرمانے لگے آپ مجھے گاڑی دے دیں اور ایک ڈرائیور دے دیں۔ مسجد میں خود تعمیر کراؤں گا۔ چنانچہ زندگی کے آخری ایام میں ساری مسجد کی تعمیر خود اپنے ہاتھوں سے کرائی۔

سیاسی وسماجی خدمات:

معاشرتی اصلاح کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ لکھو کے میں قیام کے دوران ہی سکھ اور ہندو لوگ اپنے فیصلے کرانے کے لیے والد گرامی کے پاس آتے۔ قیام پاکستان کے بعد تو پنجاب کے بہت سے لوگ خصوصاً ضلع قصور کے لوگ اپنے سیاسی وسماجی معاملات کے لیے والد گرامی کے پاس آتے۔

1951ء میں ضلع قصور کی مہاجر سیٹ سے انتخابات میں حصہ لیا اور ایم ایل اے منتخب ہوئے۔ پہلے اجلاس میں ہی اسلامی دستور کے لیے آواز بلند کی۔ راقم کے استفسار پر بتایا کہ جب تقریب حلف وفاداری ہوئی، میں نے سپیکر سے سوالیہ انداز میں پوچھا کہ اگر یہ وفاداری کسی موڑ پر اسلام کی وفاداری سے ٹکرائے گی تو پھر کیا صورت ہوگی؟ والد صاحب نے فرمایا اس سوال پر ہال میں سناٹا چھا گیا اور صرف ایک آواز آئی۔ کسی نے بھاری بھرکم آواز میں کہا ہم اس وفاداری کو چھوڑ دیں گے۔ والد صاحب نے فرمایا میں نے کہا جزاک اللہ اور یہ آواز مولانا عبدالستار خاں نیازی مرحوم کی تھی۔ والد گرامی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے سپیکر کے پاس رکھے ہوئے رجسٹر پر دستخط کیے اور اسمبلی ہال سے باہر آگیا۔ جب باہر آیا تو دیکھا کہ سامنے ملکہ برطانیہ کا بت کھڑا ہے۔ فوراً ذہن میں کئی سال پہلے کا خواب آگیا کہ ایک بہت بڑا اجتماع ہے اور لوگ ملکہ کا جنازہ پڑھ رہے ہیں۔ گویا کہ یہ اس خواب کی تعبیر ہوئی۔ [1]

---

[1] یہ واقعہ اور پورا خواب صفحہ نمبر 33 تا 35 اور صفحہ نمبر 270 پر ملاحظہ فرمائیں۔

ورزش اور کھیل:

والد گرامی بچپن سے کھیل اور ورزش کے شوقین تھے۔ جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ہر کھیل اور ورزش کو جہاد کی تیاری کا ذریعہ گردانتے تھے۔ بچپن میں کبڈی، دوڑ، چھلانگ، نیزہ بازی، گھوڑسواری اور پیراکی بڑے شوق سے کرتے تھے۔ یہ سب کام اس نیت سے سیکھے کہ جہاد میں کسی بھی مشق کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ گتکے کی پریکٹس ہمیشہ کرتے رہتے تھے۔ ہمیں بھی سب بھائیوں کو گتکے کا ہنر سکھایا۔

اتباع سنت:

مخدومی والد گرامی سنت نبوی کی اتباع کرنے والے باعمل عالم تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں والد گرامی قدر کو کوئی کام خلاف شرع کرتے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائے اور جنت میں اعلیٰ درجات سے نوازے۔ اتباع سنت کی ایک چھوٹی سی مثال پیش خدمت ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں جب بیماری کا غلبہ تھا، آپ بیت الخلا جانے سے بھی قاصر تھے۔ ان دنوں ہم سب بھائیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ باری باری ہر بھائی چند دن والد صاحب کی خدمت کرے گا۔ چنانچہ جب والد گرامی کی خدمت کے لیے میری باری تھی تو ایک دن میں آپ کے کپڑے بدلوانے کے لیے آپ کی قمیص آتارنے لگا تو میں نے قمیص کے دائیں بازو کو اتارنے کی کوشش کی۔ آپ نے بازو پیچھے کر لیا۔ میں نے سمجھا شاید شدت تکلیف کی وجہ سے بازو جھٹکا ہے۔ کچھ توقف کے بعد میں نے عرض کی اباجی میں قمیص اتاردوں۔ سر کے اشارے سے فرمایا ہاں۔ میں نے پھر دایاں بازو اتارنے کی کوشش کی تو فرمانے لگے اوں ہوں۔ میں نے کہا جی قمیص اتارنی ہے۔ فرمایا پہلے بائیں طرف سے اتارو۔ پھر میں نے کہا جی پہلے دائیں طرف اتارلوں۔ پھر بائیں طرف سے اتاروں گا۔ سخت تکلیف میں مبتلا تھے اور آپ کی حالت بتا رہی تھی کہ بول نہیں سکتے۔ شدید تکلیف میں بھی اتنے صبر کا مظاہرہ کرتے کہ نہ کوئی ناشکری کا لفظ منہ سے نکالتے اور نہ کراہتے بلکہ ذکر واذکار میں مصروف رہتے۔ اس شدید تکلیف میں جب میں نے قمیص اتارنے کی دوبارہ بات کی تو فرمایا

پہنتے وقت پہلے دایاں بازو پہنتے ہیں اور اتارتے وقت پہلے بایاں بازو اتارتے ہیں۔ آپ کی یہ بات سن کر میں حیران رہ گیا کہ سنت کی اتباع کی کتنی فکر ہے کہ اس بیماری اور تکلیف کے عالم میں بھی سنت نبوی کو نہیں بھولے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کو سنت سے کتنی محبت تھی۔ غور فرمایے جو شخص بیماری کے عالم میں اور سخت تکلیف کی حالت میں سنت کا متبع ہے وہ جوانی اور مضبوط قویٰ کی حالت میں کتنا بڑا عاملِ سنت ہوگا۔ آپ نے ساری زندگی سنت نبوی ﷺ کی اتباع کی اور اپنے مریدوں سے بھی بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ والد گرامی کی تمام خطائیں معاف فرمائے، آپ کو جنت الفردوس عطاء فرمائے اور آپ کے مریدین ومعتقدین کو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سنتِ نبوی کا پابند بنائے۔

قبولیت دعا کی چند مثالیں

والدِ گرامی مستجاب الدعوات تھے۔ اکثر مریدین کہتے ہیں کہ ہم جب کسی کام کے لیے باباجی کے پاس آتے تو باباجی فرماتے دعا سے ان شاء اللہ تمھارا کام ہوجائے گا۔

جب ایم ایل اے منتخب ہوئے تو لوگ کام کروانے کی غرض سے آتے اور سفارش کے لیے کہتے تو والد گرامی سفارش کی بجائے دعا کر دیتے۔ وقتی طور پر سائل پریشان ہوتا لیکن بعد میں جب کام ہوجاتا تو بہت خوش بھی ہوتا اور حیران بھی کہ مولانا صاحب نے سفارش بھی نہیں کی اور کام بھی ہوگیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مولانا محمد سیف الرحمٰن الفلاح کا ہے کہ جب انھوں نے سکول ٹیچر کے لیے درخواست دی تو والد صاحب کے پاس آئے اور عرض کی آپ ایم ایل اے ہیں ضلع ساہیوال میں سکول اساتذہ کی سیٹیں آئی ہیں۔ آپ میرے ساتھ ساہیوال چلیں۔ آپ ان کے ساتھ ساہیوال چلے گئے۔ ساہیوال پہنچ کر ڈی ای او کے دفتر میں درخواست جمع کروانی تھی۔ مولانا سیف الرحمٰن سے کہا آپ درخواست جمع کروائیں میں مسجد میں نفل پڑھتا ہوں۔ مولانا سیف الرحمٰن پریشان ہوئے کہ میں ان کو سفارش کے لیے ساتھ لایا ہوں اور یہ نفل پڑھنے کے لیے مسجد میں جارہے ہیں۔ چنانچہ وہ اکیلے ہی ڈی ای او کے دفتر گئے اور درخواست جمع کروادی۔ دفتری عملے نے کہا آپ بیٹھیں، آپ کو ابھی آرڈر

ٹائپ کر کے دیتے ہیں۔ مولانا سیف الرحمٰن نے آرڈر لیے اور مسجد میں آ گئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میرے بڑے ہم زلف والد گرامی کے مرید مولوی محمد علی بیان کرتے ہیں کہ میرے پیر بھائی حاجی حاکم علی بنگی کلیہ والے نے مجھے خود بتایا کہ مولانا محی الدین صاحب ایم ایل اے تھے اور ہمارے گاؤں بنگی تبلیغ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں نے مولانا صاحب سے عرض کی میری بھینس چوری ہوگئی ہے اور میرا ایک مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے، سفارش کر دیں تاکہ مقدمے سے بری ہو جاؤں اور تھانیدار سے کہیں میری بھینس واپس کروائے۔ مولانا صاحب نے استغفر اللہ پڑھا اور کہا کہ آؤ بھائی مل کر دعا کرتے ہیں۔ مسجد میں کھڑے ہو کر دعا کی اور واپس روانہ ہو گئے۔ حاجی حاکم علی کہتے ہیں ان کی مولانا کے پاس اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ میں بڑا مایوس ہوا کہ مولانا صاحب ایم ایل اے ہیں اور میرے لیے کوئی سفارش کرنے کی بجائے صرف دعا کر کے چلے گئے ہیں۔

مولوی محمد علی کہتے ہیں کہ حاجی حاکم علی نے بتایا کہ چند دنوں بعد مجھے محمد دین ڈوگر جھنڈ والے نے پیغام بھیجا کہ آ کے اپنی بھینس لے جاؤ۔ میں گیا اور اپنی بھینس واپس لے آیا۔ کچھ دنوں بعد جب عدالت میں پیشی کے لیے گیا تو عدالت کے باہر سے ہی مجھے آواز دی کہ حاکم علی کون ہے؟ میں نے کہا کہ میں ہوں۔ آواز دینے والے نے کہا کہ جج صاحب آپ کو صبح سے بلا رہے ہیں۔ میں جج کے سامنے پیش ہوا اور جج نے مجھے کہا میں آپ کو مقدمے سے بری کرتا ہوں۔

مولانا کی قبولیت دعا کا ایک واقعہ سنیے جو علاقہ بصیر پور کے گاؤں فقیریا کے رہنے والے ان کے عقیدت مند بابا برہان وٹو بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ساون کے مہینے میں وہ والد گرامی صاحب کے پاس آئے اور عرض کی کہ دریائے ستلج میں بہت زیادہ طغیانی آ گئی ہے اور دریا نے نصف گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے کر تباہ کر دیا ہے اور پانی گاؤں کے وسط میں مسجد تک پہنچ چکا ہے۔ آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ چلیں اور دعا کریں۔

والد صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ راقم بھی ہمراہ تھا۔ گاؤں پہنچ کر مسجد میں نماز ظہر ادا کی۔

گاؤں والوں نے بتایا کہ آدھا گاؤں دریا برد ہو چکا ہے۔ مسجد سے باہر نکلے تو دریا کا پانی مسجد کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مسجد کی جنوبی دیوار کے ساتھ والی زمین پر کھڑے ہو کر مولانا نے دعا شروع کر دی۔ تمام نمازیوں نے ان کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ آدھ پون گھنٹا دعا کرتے رہے۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کٹاؤ والی زمین دریا میں گر نہ جائے لیکن والد گرامی سکون کے ساتھ دعا کرتے رہے۔ دعا مکمل کر کے ہم بابا برہان کے رقبے پر واقع رہائش پر چلے گئے۔ رات وہیں بسر کی۔ اگلے روز گاؤں والوں نے بتایا کہ دریا کا پانی اس جگہ سے پیچھے ہٹ گیا ہے، جہاں پر کھڑے ہو کر مولانا صاحب نے دعا کی تھی۔



انتالیسواں باب

اولاد و احفاد

مولانا محی الدین مرحوم کے تذکار کے سلسلے میں متعلق اس کتاب میں لکھوی خاندان کی گذشتہ نسلوں کا تذکرہ بھی خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا، اب ان کے ''اولاد واحفاد'' کے ذیل میں اس خاندان کی نئی نسل کے مختصر تعارف سے واضح ہوگا کہ اس خاندان کا ہر فرد لائق احترام اور ہر رکن قابلِ تکریم ہے۔ اسلام کا نام تو ہر مسلمان لیتا ہے اور اس پر عمل کا دعوے دار بھی ہے لیکن صحیح معنوں میں مسلمان وہی ہے، جس کی زبان پر اس کی کچھ تفصیل آئے تو سننے والوں کے دلوں پر تاثر پذیری کی حسین لہریں نمودار ہو جائیں۔ مولانا محی الدین لکھوی کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا تھا جو ہمارے علم کے مطابق حتی الامکان اسلام کے ہر حکم پر عامل اور اس کی بیان کردہ ہر نہی سے دامن کشاں رہتے تھے۔ ان کی ذات گرامی اپنے اسلاف کے اوصافِ حسنہ سے متصف اور ان کے طریقِ تربیت سے باخبر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی اپنی اولاد کی بہتر طریقے سے تربیت کی اور (جہاں تک یہ فقیر جانتا ہے وہ سب) ماشاء اللہ اسلام کی راہِ مستقیم پر گام زن ہیں۔ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق آیے ان سے متعارف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ (یہاں یہ یاد رہے کہ اولاد واحفاء کی "شماریات" کا تعلق 2012ء کے آغاز تک ہے۔ اس کے بعد کی صورت حال اس میں شامل نہیں)

مولانا محی الدین لکھوی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی تقسیم ملک سے تیرہ چودہ سال

پہلے اپنے ماموں اور استاذِ مکرم حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی صاحب زادی امۃ الرحمٰن سے بمقام لکھو کے 1934ء میں ہوئی۔ اس وقت مولانا بیس برس کے جوانِ رعنا تھے۔ اس خاتون سے مولانا کے دو بیٹے پیدا ہوئے حافظ محمد لکھوی اور حافظ محمد احمد لکھوی۔ اور تین بیٹیاں میمونہ، نفیسہ اور فاطمہ۔!

دوسری شادی تقسیم ملک کے سات برس بعد 1954ء میں چالیس برس کی عمر میں اپنے خاندان ہی کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن لکھوی (سکول ٹیچر) کی دختر مختار بیگم سے دیپال پور میں ہوئی۔ مولانا محی الدین کی رہائش قلعہ تاراسنگھ (الہ آباد) میں تھی اور وعظ و تبلیغ کے سلسلے میں پورے پنجاب کے دینی حلقوں میں ان کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ محترمہ مختار بیگم سے مولانا کے پانچ بیٹے ہوئے اور چھے بیٹیاں۔ بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں: محمد حامد، محمد حمود، محمد حماد، محمد حُمید اور محمد زید۔ اور بیٹیاں ہیں زکیہ بیگم، حفیہ بیگم، بریہ بیگم، سلمیٰ بیگم، بشریٰ تمنا اور زہریٰ بیگم۔

دونوں بیویوں سے مولانا کی کل سولہ اولادیں ہوئیں۔ سات بیٹے اور نو بیٹیاں۔ اب تاریخہائے ولادت کی ترتیب سے ان سب کا مختصر تعارف۔۔۔

پہلے بیٹوں کا تذکرہ۔

1۔ حافظ محمد: یہ مولانا کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو جون 1937ء میں بمقام لکھو کے پیدا ہوئے۔ استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے نواسے اور مولانا محمد علی لکھوی مدنی کے پوتے۔ ان کا عقیقہ مرکز الاسلام میں جمعۃ المبارک کے روز ہوا تھا، جس میں رشتے داروں سمیت اردگرد کے دیہات کے بے شمار لوگ شامل تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی نے جمعہ پڑھایا تھا اور اپنے عظیم المرتبت دادے کا نام لے کر نومولود پوتے کا نام حافظ محمد رکھا تھا۔ یہ حافظ قرآن نہیں تھے، حافظ ان کے نام کا جز تھا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقہ درس میں شامل تھا جو وہاں خدمتِ تدریس سرانجام دیتے تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی کا وہ خطبۂ جمعہ نہایت دلچسپ تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ میرے والد مولانا

محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کو مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا تھا کہ ان فرعون وھامان وجنودھما کانوا خاطئین۔اس کا مطلب یہ تھا کہ مرزا غلام قادیانی اور اس کے متبعین فرعون اور ہامان اور ان کے ساتھیوں کی مانند ہیں یعنی کافر ہیں۔ اس الہام کے جواب میں مرزا قادیانی نے کہا تھا کہ مجھے الہام ہوا ہے، محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نرینہ اولاد سے محروم رہیں گے۔لیکن میری ولادت سے مرزا قادیانی کا الہام غلط ثابت ہوا اور اس کی پیش گوئی اور بددعا کی بھی تکذیب ہوگئی۔ اس طرح میرا وجود مرزا غلام احمد قادیانی کے جھوٹا ہونے کی چلتی پھرتی دلیل ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں مرزا غلام قادیانی کی بددعا کا نتیجہ ہوں۔ ان کی ان باتوں سے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ بھی پھیل گئی تھی اور آنکھوں میں آنسوں بھی آ گئے تھے۔ یہ باتیں کتاب کے چوتھے باب میں (جس میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا تذکرہ کیا گیا ہے) بیان کی جا چکی ہیں۔

حافظ محمد لکھوی نے اپنے آباواجداد کی جاری کردہ درس گاہ جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں تعلیم حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں خدمتِ تدریس انجام دینے لگے تھے اور وہ جامعہ کے نائب شیخ الحدیث بھی تھے۔ باپ کی زندگی میں 16۔فروری 1995ء کو وفات پائی۔ مولانا کو ان کی وفات پر سخت صدمہ پہنچا تھا،لوگ ان کے پاس اس عظیم حادثے پر اظہار افسوس کے لیے آتے تو وہ پیکر صبر عالم فرماتے،ان کا وجود ہمارے پاس اللہ کی امانت تھا، وہ لے گیا۔ ہم اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے۔

حافظ محمد کے تین بیٹے ہیں محمد طیب، محمد طاہر اور محمد علی اظہر۔ ایک بیٹی ہے منیبہ۔ سب شادی شدہ اور بچوں والے ہیں۔ بیٹے قلعہ تارا سنگھ (الہ آباد) میں سکونت پذیر ہیں اور بیٹی چک نمبر 18 ون ایل (نزد رینالہ خورد) میں۔

2۔ محمد احمد لکھوی: یہ بھی مولانا کی پہلی بیوی سے ہیں۔ 31۔دسمبر 1957ء کو پیدا ہوئے۔ درس نظامی کی تکمیل جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں کی۔ قرآن مجید بھی حفظ کیا۔ بی اے تک عصری تعلیم حاصل کی۔ دیپال پور کے ہائی سکول میں عربی کے استاد ہیں۔ صالح فطرت اور

نیک اطوار عالم دین۔ سکونت دیپال پور شہر میں ہے۔

حافظ محمد احمد کے دو بیٹے ہیں جنید احمد اور خبیب احمد۔۔۔! جنید احمد سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں اور خبیب احمد پنجاب یونیورسٹی میں انجینئرنگ کے طالب علم ہیں۔

چار بیٹیاں ہیں وجیہہ، بدرہ، وسیمہ اور سدرہ۔۔۔!

وجیہہ کی شادی محمد احمد کی چھوٹی بہن حفیہ کے بیٹے محمد سفیان ظفر سے ہوئی۔ یہ گھرانا حجرہ شاہ مقیم میں مقیم ہے۔

بدرہ کی شادی لاہور میں ہوئی۔ (ان سطور کی تحریر تک) دو چھوٹی بیٹیاں غیر شادی شدہ ہیں۔

3۔محمد حامد لکھوی: 5۔جنوری 1959ء کو قلعہ تارا سنگھ (الہ آباد) ضلع اوکاڑہ میں ان کی ولادت ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کیا۔ وفاق المدارس السلفیہ سے الشہادۃ العالمیہ حاصل کی۔ چند برس جامعہ ابوبکر الاسلامیہ (کراچی) میں پڑھتے رہے۔ عربی زبان سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے ہیں۔ نیکی اور پارسائی میں اپنے والد محترم مولانا محی الدین کے مشابہ ہیں۔ دیپال پور شہر میں مقیم ہیں۔ ہائر سیکنڈری سکول رینالہ خورد (ضلع اوکاڑہ) میں عربی زبان وادب کے سینئر استاد (سبجیکٹ سپیشلسٹ) کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اولاد تین بیٹے ہیں اور تین بیٹیاں۔۔۔ بڑے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن بدر ہے۔ اس نے دینی مدرسے میں بنیادی تعلیم پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے بی ایس مینجمنٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے چھوٹا محبّ الرحمان بدر ہے۔ حافظ قرآن ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں کمپیوٹر انجینئرنگ کا طالب علم ہے۔ سب سے چھوٹا مطیع الرحمٰن یوسف چوتھی جماعت کا طالب علم ہے اور قرآن پاک حفظ کر رہا ہے۔

تین بیٹیوں کے نام ہیں وبیصہ مریم، عائشہ اور فاطمہ۔ بڑی دو بیٹیاں ایم اے اسلامیات ہیں اور چھوٹی ایک اسلامی سکول میں پڑھتی ہے۔ بڑی دونوں صاحب زادیاں

شادی شدہ ہیں۔

4۔ ڈاکٹر محمد حمود لکھوی: ان کی تاریخ پیدائش 13۔مارچ 1964ء ہے۔ رہائش اوکاڑہ شہر میں ہے۔ ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مقالے کا موضوع تھا ''حافظ محمد بن بارک اللہ کا تفسیری منہج''۔ اسلامیات کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ آج کل رینالہ خورد (ضلع اوکاڑہ) ڈگری کالج میں پرنسپل ہیں۔ علاوہ ازیں جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کے ناظم ہیں۔ اپنے عم محترم مولانا معین الدین لکھوی کی صاحب زادی سے شادی ہوئی۔ اولاد ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ بیٹے کا نام عزالدین عاذب حمود ہے جو پنجاب یونیورسٹی میں بی ایس علوم اسلامیہ کا طالب علم ہے اور بیٹی حدیقہ حمود کالج میں پڑھتی ہے۔

5۔ڈاکٹر محمد حماد لکھوی: تاریخ پیدائش 9۔دسمبر 1965ء۔ ایم اے اسلامیات (گولڈ میڈلسٹ) پنجاب یونیورسٹی۔ اسی یونیورسٹی سے ایم اے عربی کیا اور اسی یونیورسٹی سے ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کیا۔ مقالے کا عنوان تھا: ''حریت فرد کا اسلامی تصور''۔ پوسٹ ڈاکٹریٹ سنٹر فارسٹڈی آف اسلام یونیورسٹی آف گلاسکو۔ سکاٹ لینڈ (برطانیہ)۔ جامعہ محمدیہ کے شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم مرحوم سے سندِ حدیث لی۔

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ علوم اسلامیہ میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ سکونت لاہور میں ہے۔ جامع مسجد مبارک اہل حدیث لاہور میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ بہت اچھے خطیب ہیں۔ اپنے چچا مولانا معین الدین لکھوی کی صاحب زادی سے شادی ہوئی۔

اولاد چار بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا حسن حماد ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں الیکٹریکل انجینئرنگ کا طالب علم ہے۔ اس سے چھوٹا بیٹا حسین حماد، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بی ایس اصول الدین کا طالب علم ہے۔ تیسرا بیٹا حنین حماد، ایف ایس سی کا طالب علم ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹا حسان حماد، چھٹی جماعت کا طالب علم ہے اور قرآن

پاک حفظ کر رہا ہے۔

6۔ محمد حمید لکھوی: 12۔ جنوری 1968ء کو پیدا ہوئے۔ دیپال پور شہر میں رہ رہے ہیں۔
تعلیم: ایم اے اسلامیات اور ایم اے اردو۔ گورنمنٹ ہائی سکول دیپال پور میں سینئر استاد ہیں۔ اولاد دو بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ بیٹوں کے نام ہیں محی الدین حمدون اور صلاح الدین حماس۔ بیٹیوں کے نام عیشہ اور عریشہ ہیں۔ چاروں بچے سکول میں پڑھتے ہیں۔

7۔ محمد زید لکھوی: یہ مولانا محی الدین لکھوی کے ساتویں بیٹے ہیں۔ تاریخ پیدائش ہے 17۔ مارچ 1972ء۔ رہائش اوکاڑہ شہر۔ تعلیم ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی۔ پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کر رہے ہے۔ عربی مقالے کا عنوان ہے:
"الموازنة بين العصر الحاضر والجاهلي في القيم الاخلاقية الحربية۔"
ڈی پی ایس اوکاڑہ کے کالج سیکشن میں اسلامیات/عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔
اولاد تین بیٹے ہیں اور تین بیٹیاں۔ بیٹیوں کے نام ہیں اسامہ، ثمامہ اور محی الدین۔۔۔
بیٹیوں کے نام ہیں خولہ، خنساء اور منیحہ۔
چھوٹا بیٹا اور بیٹی ماں کی گود میں ہیں اور باقی سکول میں پڑھتے ہیں۔
اب ملاحظہ ہو مولانا محی الدین لکھوی کی بیٹیوں کا تذکرہ۔

1۔ میمونہ: یہ مولانا کی پہلی بیوی کے بطن سے ہے اور اس کی تاریخ ولادت ہے 1940ء اور مقام ولادت لکھو کے ضلع فیروز پور (ہندوستان)۔ اس کی شادی مولانا کے بھانجے مولانا منیر الدین بن مولانا قدرت اللہ لکھوی سے ہوئی۔ سکونت چک نمبر 18 ون ایل میں ہے۔
اولاد دو بیٹے ہیں راشد منیر اور فاہد منیر۔ ڈاکٹر راشد منیر اسلامیات میں پی ایچ ڈی ہیں اور انجنیئرنگ یونیورسٹی لاہور میں اسلامیات کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ فاہد منیر ایم اے (صحافت) ہیں اور شعبہ تعلیم سے ہی وابستہ ہیں۔ پانچ بیٹیاں ہیں حمنہ، منزہ، مبرّہ، ثمرہ اور رشدہ۔ بیٹے بیٹیاں سب شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ بڑی بیٹی حمنہ

اوکاڑہ شہر میں جامعہ محمدیہ للبنات کے انتظام وانصرام کی ذمہ دار بھی ہے اور صدر معلّمہ بھی۔

2۔نفیسہ: پیدائش 1946ء (مرکز الاسلام لکھوکے)۔ ان کی شادی مولانا معین الدین لکھوی کے بڑے صاحب زادے بارک اللہ انجم سے ہوئی۔

اولاد: ایک بیٹا داؤد انجم اور ایک بیٹی حاجرہ جبیں۔ داؤد انجم حافظ قرآن ہے اور پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں بی اے آنرز کیا ہے۔ رہائش: اوکاڑہ شہر

3۔فاطمہ: پیدائش: 1952ء الہ آباد (قلعہ تاراسنگھ) ضلع اوکاڑہ۔

شادی اپنے پھوپھی زاد حکیم اثیر الدین بن مولانا قدرت اللہ لکھوی سے ہوئی۔ رہائش: چک نمبر 18 ون ایل نزد رینالہ خورد۔ دو بیٹے: ہود احمد اور سعود احمد (دونوں پڑھے لکھے ہیں اور اپنا کاروبار کرتے ہیں)۔ دو بیٹیاں: سبرہ اور صائبہ

4۔زکیہ: پیدائش: 1955ء (الہ آباد (قلعہ تاراسنگھ)۔

شادی خالہ زاد ماسٹر مسعود الحسن شاہد بن حافظ عبدالمعید لکھوی سے ہوئی۔ رہائش: الہ آباد (قلعہ تاراسنگھ) ضلع اوکاڑہ۔

چھے بیٹے: عدنان مسعود (ایم اے آنرز علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)، فرحان مسعود (ایم اے فزیکل ایجوکیشن)، لقمان مسعود، غفران مسعود، عسفان مسعود (فاضل جامعہ محمدیہ اوکاڑہ) اور ریحان مسعود۔ دو بیٹاں: نائلہ اور شمائلہ

5۔حفیہ: پیدائش: 14۔جولائی 1958ء (الہ آباد)۔ شادی: ظفر اللہ علوی بن حبیب اللہ سے ہوئی۔ رہائش: حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ۔

تین بیٹے: سفیان ظفر (بی اے)، عثمان ظفر اور سلمان ظفر (فلائٹ آپریشن آفیسر)

دو بیٹیاں: رابعہ ظفر (ایم اے علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی)، رئیسہ ظفر (متعلمہ ایم بی بی ایس)

6۔ بریہ: پیدائش: 27۔جولائی 1960ء (الہٰ آباد)۔ شادی خالہ زاد احمد داؤد امجد بن حافظ عبدالمعید لکھوی سے ہوئی۔ رہائش: اوکاڑہ شہر

دو بیٹے: محی الدین جواد (ایم اے) اور معین الدین زیاد (متعلم بی ایس سی انجنیئرنگ پنجاب یونیورسٹی)۔ دو بیٹیاں: عمرہ (جو 2009ء میں جواں عمری میں فوت ہوگئی) اور رفدہ (ایم ایس سی ریاضی پنجاب یونیورسٹی)

7۔ سلمیٰ: پیدائش: 11۔ فروری 1962ء۔

شادی: حکیم تقی الدین ارشد بن حکیم منیر احمد علوی سے ہوئی۔

رہائش: رینالہ خورد

ایک بیٹا: عمر تقی (فاضل جامعہ محمدیہ اوکاڑہ)

چھ بیٹیاں: آمنہ، سائرہ، اقرا، حرا، رکزہ اور عرفہ

8۔ بشریٰ: پیدائش: یکم نومبر 1971ء۔

شادی: پھوپھی زاد آصف فاروق بن مولانا زین العابدین لکھوی سے ہوئی۔

رہائش: اوکاڑہ شہر

دو بیٹے: حیدر الدین (حافظ قرآن، متعلم جامعہ محمدیہ اوکاڑہ)، حارث (حفظ کا طالب علم)۔ دو بیٹیاں: حوا اور حور

9۔ زہریٰ: پیدائش: 7۔ مارچ 1974ء۔

شادی: توقیر صلاح بن مولانا صلاح الدین لکھوی سے ہوئی۔ رہائش: رینالہ خورد۔

دو بیٹے: حسام الدین توقیر (حافظ قرآن) اور زین الدین توقیر

تین بیٹیاں: عفہ، غنٰی اور اریبہ۔



چالیسواں باب

مولانا معین الدین لکھوی مرحوم

کتاب کے اس باب میں مولانا معین الدین لکھوی کے بارے میں چند باتیں بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کے بعد کتاب اختتام کو پہنچ جائے گی اور ہم آپ سے جدا ہو جائیں گے۔

جیسا کہ خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا یہ کتاب اگرچہ مولانا محی الدین لکھوی کے احوال وتذکار پر محیط ہے، لیکن اس میں لکھوی خاندان کا پس منظر بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ خاندان کے اکابر علماء کی جہودِ علمیہ کی تفصیل بھی مناسب انداز میں ضبطِ تحریر میں آگئی ہے۔ مولانا ممدوح کی اولاد واحفاد کے نام بھی تھوڑے بہت تعارف کے ساتھ کتاب میں مذکور ہیں۔

مولانا محی الدین لکھوی کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی تھے۔ ان پر میں نے ایک مضمون اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں لکھا تھا جو 33 صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ کتاب آج سے سولہ سال پیشتر اولین مرتبہ مارچ 1999ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی کتاب میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم ومغفور کے بارے میں اس فقیر کا مضمون چھپا تھا جو 62 صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

حیاتِ مستعار کے لیل ونہار کی گاڑی کا پہیہ تیزی کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ کچھ پتا نہیں کب آخری منزل آجائے اور تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ ارادہ یہ ہے کہ اگر زندگی نے مہلت دی اور قلم وقرطاس سے رابطہ رہا تو ان شاء اللہ مولانا معین الدین لکھوی کا تذکرہ بھی کتابی صورت میں کیا جائے گا۔ کتاب میں ان کی سیاسی تگ ودو کی تفصیل بھی

بیان کی جائے گی اور دیگر معاشرتی شعبوں میں اُنھوں نے جو کارنامے سرانجام دیے ان کا تذکرہ بھی کیا جائے گا۔ ان کے روحانی علاج کے جن واقعات کا پتا چلا وہ بھی کتاب میں مرقوم ہوں گے۔ ان کی بہت سی مساعی خیر کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے۔ ان شاء اللہ کوشش کی جائے گی کہ زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے یک جا کر دی جائیں۔ ان سطور میں ان کا مختصر الفاظ میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مولانا معین الدین لکھوی یکم جنوری 1921ء کو اپنے آبائی گاؤں لکھوکے میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی حضرت مولانا محمد علی لکھوی اور ماموں کا حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی تھا، جنھوں نے تدریسی حلقوں میں استاذِ پنجاب کے عظیم لقب سے شہرت پائی۔ وہ بالخصوص صرف ونحو میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ ددھیال اور ننھیال کی رو سے ہم مولانا معین الدین لکھوی کو نجیب الطرفین قرار دیں گے۔

دینیات کی تعلیم کا آغاز اپنے گھر میں کیا اور درسی کتابیں والد مکرم مولانا محمد علی لکھوی اور خال محترم مولانا عطاء اللہ لکھوی سے پڑھنا شروع کیں۔ انہی دنوں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی لکھوکے آئے جو دہلی میں حدیث کی نصابی کتابیں پڑھ چکے تھے اور حدیث اور رجال حدیث سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ استاذِ پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی سے مختلف فنون کی بعض کتابیں پڑھنا چاہتے تھے۔ مولانا لکھوی نے ان کو اس شرط پر فنون کی کتابیں پڑھانے کی ہامی بھری کہ وہ طلباء کو حدیث کی بعض کتابیں پڑھائیں گے۔ چنانچہ اس شرط کے مطابق مولانا محی الدین لکھوی، مولانا معین الدین لکھوی، حافظ محمد اسحاق حسینوی اور بعض دیگر طلباء نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے مشکوۃ شریف پڑھنا شروع کی۔ اس اعتبار سے مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین نے دینی تعلیم کے ابتدائی دور میں حدیث پڑھنے کا آغاز لکھوکے میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے کیا جو طالب علم کے طور پر وہاں آئے تھے۔ [1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الاعتصام کا مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نمبر مارچ 2005ء ص: 334۔ مضمون حافظ محمد اسحاق حسینوی۔ نیز دیکھیے راقم کی کتاب ''گلستانِ حدیث'' ص: 320۔ ناشر مکتبہ قدوسیہ، لاہور۔ 2011ء

بعد ازاں ان دونوں بھائیوں نے علم حدیث اور دیگر فنون کی متوسطات اور متعدد انتہائی درجات کی کتابیں مولانا عطاء اللہ لکھوی اور مولانا محمد علی لکھوی سے پڑھیں۔ لکھو کے سے فراغت کے بعد بعض آخری درجے کی کتابوں کی تکمیل کے لیے مولانا معین الدین نے گوجرانوالا کا عزم کیا اور حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی بارگاہِ ادب میں زانوئے شاگردی تہہ کیے اور سند لی۔

اس وقت گوجرانوالا کے گھنٹا گھر کے قریب ایک اہل حدیث بزرگ ڈاکٹر عظیم اللہ سکونت پذیر تھے جو سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے اور لکھوی علمائے کرام کے عقیدت مند تھے۔ انھیں جب پتا چلا کہ لکھوی خاندان کا ایک لڑکا وہاں کے مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہا ہے تو وہ مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں آئے اور معین الدین سے ملے اور ان کے کھانے کا انتظام اپنے گھر میں کیا۔

اس زمانے میں شعبان، رمضان اور شوال میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اپنے مسکن سیالکوٹ میں اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری اندرون شیراں والا گیٹ لاہور میں فارغ التحصیل طلباء کو قرآن مجید کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا معین الدین لکھوی نے ان دونوں حضرات سے اخذِ فیض کیا اور امتحان میں دونوں مقامات پر درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔

مولانا احمد علی صاحب کے حلقہ درس تفسیر میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو اس سال سندات و انعامات مولانا عبید اللہ سندھی نے تقسیم کیے تھے جو مولانا احمد علی مرحوم کے چچا تھے۔ مولانا سندھی کو جب مولانا معین الدین کے خاندان کے بارے میں بتایا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ اس لڑکے کو تفسیر کے امتحان میں اوّل ہی آنا چاہیے تھا۔ پنجاب میں قرآن مجید کی پنجابی نظم میں پہلی تفسیر اس کے پردادے حافظ محمد لکھوی نے لکھی جو تفسیر محمدی کے نام سے سات ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ پھر فرمایا: مجھ پر ذاتی طور سے اس خاندان کا بہت بڑا احسان ہے۔ قبولِ اسلام سے پہلے میں نے مولانا عبید اللہ مالیر کوٹلوی کی

کتاب تحفۃ الہند اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی تصنیف تقویۃ الایمان پڑھیں۔ ان کتابوں سے میں بہت متاثر ہوا اور اسلامی تعلیم کی سچائی میرے دل میں راسخ ہو گئی۔ پھر اس لڑکے کے پردادے حافظ محمد لکھوی کی پنجابی نظم کی کتاب ''احوال الآخرت'' کے چند شعر پڑھے تو کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

مولانا معین الدین لکھوی کے زمانۂ طالب علمی میں لکھوکی کے مدرسے کے مہتمم (یا ناظم) حضرت مولانا محمد حسین لکھوی تھے جو حضرت حافظ محمد لکھوی کے بیٹے؛ مولانا محی الدین عبدالرحمان لکھوی کے چھوٹے بھائی اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ [1]

اکتوبر 1943ء (ذیقعدہ 1362ھ) میں حضرت مولانا محمد حسین لکھوی نے فرمایا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مدرسے کے اہتمام کی ذمہ داری اُٹھانا اور اس کے لیے مختلف مقامات کا سفر کرنا اب میرے لیے مشکل ہے۔ مولانا محی الدین بن مولانا محمد علی لکھوی عالم بھی ہیں اور جوان بھی ہیں۔ مدرسے کے مہتمم آئندہ یہی ہوں گے۔ چنانچہ لکھو کے اور مرکز الاسلام دونوں مقامات کی درس گاہوں کا اہتمام مولانا محی الدین کے سپرد ہوا، جسے جامعہ محمدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کا اعلان ایک اشتہار کی صورت میں ہوا، جس کا عنوان ہے ''مدرسہ

---

[1] یہاں یہ عرض کر دیں کہ لکھوی خاندان کے تین علمائے کرام نے دہلی جا کر حضرت میاں صاحب سے استفادہ کیا؛ حضرت حافظ محمد لکھوی نے اور ان کے دو بیٹوں مولانا محی الدین عبدالرحمان لکھوی اور مولانا محمد حسین لکھوی نے...... مولانا محمد حسین لکھوی بہت اچھے واعظ تھے۔ اپنے وعظوں میں مسدس حالی کے اشعار بڑے سوز اور لحن کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ اپنے آبائی مدرسے میں فریضہ تدریس انجام دیتے رہے۔ گاؤں کی مسجد کا منصب خطابت وامامت بھی ان کے سپرد تھا۔ مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ گداز جسم اور کھلی ڈیل ڈول کے خوش مزاج عالم تھے۔ اپنے آبا و اجداد کی طرح تقوی وصالحیت کی دولت سے مالا مال۔ میں نے ان کے حالات اپنی ایک کتاب ''دبستان حدیث'' میں لکھے ہیں۔ اُنھوں نے محرم 1365ھ (جنوری 1946ء) میں بمقام لکھو کے وفات پائی۔

محمدیہ لکھو کے (پنجاب) کا نیا نظام ...... جامعہ محمدیہ"۔ یہ اشتہار "امرت الیکٹرک پریس فیروز پور شہر" میں ذیقعدہ1362ھ ۔ اکتوبر1943ء میں چھپا اور مجھے مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری (ساکن حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ) کی وساطت سے ملا۔

آج سے 71 سال قبل کی تاریخ سے مطلع ہونے کے لیے یہ اشتہار ملاحظہ فرمایے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدرسہ محمدیہ لکھو کے (پنجاب) کا نیا نظام

"جامعہ محمدیہ"

زیر اہتمام مولانا صوفی محی الدین بن مولانا الحاج صوفی محمد علی بن مولانا عارف بالرحمان محی الدین عبدالرحمٰن بن مفسر کلام اللہ المجید مولانا العلامہ الحافظ محمد قدس سرہ۔

پنجاب کی ایک چھوٹی سی بستی سے والد بزرگوار علامہ حافظ محمد قدس سرہ نے جو اصلاحی اور تبلیغی کام شروع کیا تھا وہ دو حصوں پر منقسم تھا، تحریری اور تدریسی۔ تحریر کے رنگ میں حضرت محترم رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف نے پنجاب کے عوام میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ تدریسی رنگ میں مدرسے کی شکل میں ایک ایسا پودا لگایا جس کے برگ و بار سے اس وقت سے اب تک کہ اسی (80) سال کا طویل عرصہ ہو رہا ہے، سارا پنجاب فیض یاب ہو رہا ہے۔ حضرت والد محترم قدس سرہ کے بعد مدرسے کے انتظام کی سعادت میرے حصے میں آئی جسے میں مقدور بھر سرانجام دیتا رہا۔ چند سال ہوئے کہ اپنی پیرانہ سالی اور ضعف سے میں نے مدرسے کا نظام مولانا عبدالقادر صاحب محدث لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے بہترین جانشین اور مدرسے کے چالیس (40) سالہ خادم استاد پنجاب مولانا عطاء اللہ صاحب لکھوی کے سپرد کر دیا، جو بحمد اللہ تعالیٰ چند سال نہایت خوش اسلوبی سے چلاتے رہے۔ (بارک اللہ فی مساعیہ) قوموں کی

حیات میں اسی (80) سال ایک بہت بڑی مدت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت سے اب تک ہماری زندگی کے ہر شعبے میں تغیر رونما ہے۔ ماحول کی ضروریات بدل چکی ہیں۔ اس خیال سے مناسب معلوم ہوا کہ مدرسے کا نظام اب نوجوانوں کے سپرد کر دیا جائے۔ غور وفکر کے بعد ہماری نگاہِ انتخاب عزیزم صوفی محی الدین پر پڑی۔ اس لیے کہ عزیز موصوف میں اپنے خاندان کی تصنیفی، تدریسی، تقریری، اصلاحی استعداد موجود ہے۔ ساتھ ہی بحمداللہ عزیز محترم علومِ قدیمہ اور جدیدہ کے جامع ہیں۔ ان وجوہ کے پیشِ نظر مدرسہ عزیز موصوف کے انصرامِ میں کر دیا گیا۔ اور آج سے نئے نظام کو ''جامعہ محمدیہ'' کا عنوان دیا جاتا ہے۔ تعلیم کا مختصر خاکہ سردست یوں بنایا گیا ہے کہ آٹھ جماعتیں بنا دی گئی ہیں۔ نصاب تعلیم دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے مطابق ہے۔ صرف اتنی ترمیم سے کہ لکھوی خصوصیات یعنی (صرف ونحو) کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ چوں کہ مالی حالت ایک ہی دفعہ سارا نصاب جاری کرنے کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے فی الحال صرف دو مدرس ہیں۔ مدرس اعلیٰ کے لیے استاد پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ مدظلہ کی خدمات بدستور جامعہ کو حاصل ہیں اور مدرس نائب کے لیے مولانا عبدالرحمٰن خلف الرشید حضرت مولانا موصوف کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ نصف شوال سے نصف شعبان تک ایام جمعہ اور ایام تشریق کے سوا تعطیل نہ ہوگی۔ خیال یہ ہے کہ تاریخ، جغرافیہ، انگریزی اور ادبیات کے لیے جلد ہی اساتذہ کا اضافہ کیا جاوے۔ طلبا کے قیام وطعام میں عمدگی پیدا کی جاوے اور مدرسے کے قدیمی کتب خانے میں جدید ضروریات کا بھی کافی ذخیرہ جمع کیا جاوے۔ توقع ہے کہ مدرسہ اپنے نئے نظام میں زمانے کی جدید ضروریات کو سامنے رکھ کر ضیاباری کرے گا اور خالص کتاب وسنت کی روشنی میں ملک وملت کی رہنمائی کا فرض سرانجام دے گا۔ (ان ذالک علی اللہ یسیر) ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کام نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم سب مل کر عزیز موصوف کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ مجھے امید ہے کہ جملہ اہل اسلام۔ ہمارے معتقدین پہلے

سے زیادہ سرگرمی اور کوشش سے مدرسے کی امداد فرمائیں گے۔ خصوصاً تعلیم یافتہ بھائیوں کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ اس کو اپنائیں اور ہر قسم کے مفید مشوروں سے مستفید فرمائیں۔ واللہ الموفق وھوالمستعان وصلی اللہ علیہ علٰی سیدنا محمد وآلہ وسلم۔ نوٹ: آئندہ سالانہ رپورٹ میں مدرسے کے تفصیلی حالات درج ہوں گے۔ ان شاء اللہ

خادم اسلام: (مولانا) محمد حسین صاحب بن علامہ حافظ محمد قدس سرہ محدث لکھو کے ضلع فیروز پور (پنجاب)

(اکتوبر 1943ء ۔۔۔ ذوالقعدہ 1362ھ)"

یہاں یہ یاد رہے کہ جامعہ محمدیہ کا کوئی مستقل سفیر نہ تھا جو کہیں جا کر لوگوں سے مالی امداد طلب کرتا، البتہ ایک بزرگ مولوی سراج الدین تھے جو یہ خدمت سرانجام دیتے تھے، وہ بھی بہت کم۔ یہ بزرگ فیصل آباد کے مولانا محمد رفیق مدن پوری مرحوم اور مولوی محمد ابراہیم مرحوم (ساکن بھیڑیاں ضلع قصور) کے والد محترم تھے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ دو مہینے کے بعد مرکز الاسلام آتے، دو تین دن وہاں رہتے اور چلے جاتے۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں لاہور آیا تو یہاں بھی وہ کئی دفعہ تشریف لائے اور ان سے مل کر پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ مرحوم کا شمار لکھوی علماء کے عقیدت مندوں اور شاگردوں میں ہوتا تھا۔

مولانا محی الدین لکھوی کے اہتمام کا سلسلہ تقسیم ملک تک جاری رہا۔ تقسیم کے بعد مولانا ممدوح نے دیپال پور کے قریب قلعہ تارا سنگھ میں سکونت اختیار کر لی اور تبلیغ دین کو اپنی سرگرمیوں کا محور قرار دے لیا، جس کی تفصیل ان کے فرزند گرامی قدر پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی نے مقدمہ کتاب میں بیان کر دی ہے اور خوانندگانِ محترم نے اس کا مطالعہ فرما لیا ہے۔ کسی ادارے کے انتظامی معاملات کی گاڑی کو چلانا اور اس کے لیے مختلف مقامات میں جا کر لوگوں سے طالب امداد ہونا مولانا محی الدین لکھوی کی افتادِ طبع سے ہم آہنگ نہ تھا۔ وہ فطرتی طور پر (بذریعہ وعظ وتذکیر) تبلیغ دین اور اشاعت کتاب وسنت سے دلچسپی رکھتے تھے

اور ان کی تمام زندگی اسی کام کے لیے وقف رہی۔ اس ضمن میں ان کا قیام گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ بلکہ بہت زیادہ رہا۔ صوبہ پنجاب کے بے شمار مقامات تو ان کی تبلیغ کا مرکز تھے ہی، سندھ اور خیبر پختون خوا کے بھی متعدد دیہات وقصبات میں ان کے مواعظِ حسنہ کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے طریق تبلیغ سے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور ان کے حلقۂ ارادت سے کثیر تعداد میں لوگوں نے وابستگی اختیار کی۔ اس قسم کے ہمہ وقتی سراپا خلوص مبلغِ دین اب کہاں پیدا ہوں گے، وہ سانچے ٹوٹ گئے جن میں یہ لوگ ڈھلے تھے اور ان کے ذہن نے تربیت پائی تھی۔

بات مولانا معین الدین کے بارے میں ہو رہی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد مولانا معین الدین نے اوکاڑہ شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ نہایت افراتفری کا زمانہ تھا اور لوگ انتہائی پریشانی کا شکار تھے۔ کسی دینی تدریسی ادارے کے لیے کسی اچھی عمارت کا الاٹ کرانا بڑا مشکل کام تھا۔ مولانا معین الدین باہمت آدمی تھے۔ اُنھوں نے بھاگ دوڑ کرکے اوکاڑہ میں جامعہ محمدیہ کے لیے بلڈنگ الاٹ کرائی جس کے دروازے پر یہ الفاظ لکھے تھے: ''آریہ پتری پاٹھ شالا'' یعنی آریہ گرلز سکول۔ یہ ہندوؤں کے آریہ سماجی فرقے کی لڑکیوں کا ہائی سکول تھا۔ یہ عمارت جامعہ کے نام الاٹ تو ہوگئی لیکن اس کے خاصے حصے پر مختلف مقامات کے پناہ گزین قابض تھے۔ ان کو وہاں سے نکالنا اس زمانے میں بہت بڑا مسئلہ تھا۔

ہم لوگ اپنے آبائی وطن سے نکل کر جڑاں والا (ضلع لائل پور) کے ایک گاؤں میں آبسے تھے۔ مجھے مولانا معین الدین کے اوکاڑہ میں قیام کا پتا چلا تو ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچا۔ دو چار روز کے بعد میرے مرکز الاسلام کے ساتھی چودھری غلام حسین تہاڑیا بھی وہاں آگئے۔ جامعہ محمدیہ کی عمارت کی الاٹ منٹ ہمارے سامنے ہوئی۔ الاٹ منٹ کے کچھ عرصہ بعد مولانا معین الدین نے کوشش کرکے اچھی خاصی رقم ان لوگوں کو دی، جنھوں نے جامعہ محمدیہ کے کچھ حصے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس طرح پوری عمارت جو دو منزلوں پر مشتمل تھی جامعہ کے قبضے میں آئی۔ قابضین کے استعمال سے اس عمارت کا کافی حصہ ٹوٹ پھوٹ کی زد میں آگیا تھا۔ ہزاروں روپے خرچ کرکے اس کی مرمت کرائی گئی۔

اوکاڑہ میں جامعہ محمدیہ کے ناظم مولانا معین الدین لکھوی تھے اور تمام زندگی وہ اس منصب پر فائز رہے۔ رمضان المبارک میں مولانا ممدوح بالخصوص مختلف مقامات میں جا کر اس کے لیے چندہ جمع کرتے۔ طلباء کے اخراجات اور مدرسین کے مشاہرات اسی چندے کی رقم سے پورے ہوتے تھے۔ مولانا معین الدین نے ہر معاملے میں جامعہ محمدیہ کو مقدم رکھا اور اپنے اسلاف کی اس یادگار کی اُنھوں نے بے حد خدمت کی۔ کہنا چاہیے کہ جامعہ محمدیہ اور مولانا معین الدین آپس میں لازم ملزوم تھے۔

اوکاڑہ میں جامعہ محمدیہ کے اولین معلم استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی تھے۔ پھر جلد ہی حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا ہدایت اللہ ندوی، مولانا محمد عبدہ الفلاح فیروز پوری اور بعض دیگر اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ طلباء جامعہ محمدیہ کا نام سنتے ہی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ بعد ازاں ایک وقت آیا کہ جامعہ محمدیہ کی پرانی عمارت گرادی گئی اور نئی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی جو تہہ خانے اور اوپر کی تین منزلوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کئی دکانیں بھی تعمیر کی گئیں جو جامعہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ ہیں۔

مولانا معین الدین نے کوشش کر کے اوکاڑہ شہر سے باہر فیصل آباد روڈ پر بھی جامعہ کے لیے خاصی زمین خریدی جس کی بنیادیں بھری گئی ہیں۔ کچھ زرعی رقبہ بھی جامعہ کے نام ہے۔

مولانا معین الدین نے وفات سے کچھ عرصہ پیشتر اپنے فرزند گرامی ڈاکٹر زعیم الدین عابد کو جامعہ محمدیہ کے مہتمم اور مولانا محی الدین لکھوی کے فرزند ارجمند پروفیسر ڈاکٹر محمد حمود لکھوی کو (جو مولانا معین الدین کے داماد بھی ہیں) جامعہ کے ناظم مقرر کر دیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے جامعہ کا انتظامی اور تدریسی سلسلہ بہت اچھے طریقے سے چل رہا ہے اور بہترین انداز سے کام ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ ہوتا رہے گا۔ جامعہ کے ارباب انتظام جدید و قدیم علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور خوب صورتی سے سلسلہ کار کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ انھیں کام کرنے کا شوق بھی ہے اور دل جذبۂ خدمتِ دین سے معمور بھی ہیں۔ اپنے اسلاف کی تین سو سال سے جاری اس عظیم یادگار کو وہ بہرصورت قائم رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

انھیں اس عمل خیر کو جاری رکھنے میں ان شاء اللہ کامیابی عطا فرمائے گا۔

لکھوی خاندان کے علماء کو جماعت میں ہمیشہ احترام کا مقام حاصل رہا۔ قیامِ پاکستان سے گیارہ مہینے بعد مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی زیرِ صدارت 24 جولائی 1948ء کو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا (جسے سقوط مشرقی پاکستان کے بعد مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کہا جانے لگا) اس کے اوّلین اجلاس میں مولانا معین الدین لکھوی شامل تھے۔ اس کے بعد انھیں مجلس شوریٰ، مجلس عاملہ اور ہر کمیٹی اور سب کمیٹی کے رکن بنایا گیا۔ وہ 1974ء سے 1994ء تک بیس سال مرکزی جمعیت کے امیر بھی رہے۔ اُنھوں نے جماعت کی بہت خدمت کی۔

اسلام آباد میں ضیاء الحق کے دورِ صدارت میں جامعہ سلفیہ کے لیے انھی کی کوشش سے پلاٹ ملا۔ حکومت کے بعض بااثر لوگ یہ پلاٹ اہلِ حدیث حضرات کو نہیں دینا چاہتے تھے۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ پلاٹ مل گیا اور اس میں تعلیم کے لیے چند کمرے بھی تعمیر ہو گئے، پھر وزیر داخلہ نے حکم جاری کر دیا کہ کمرے گرادو ورنہ حکومت گرادے گی اور تم سے گرانے کا خرچہ بھی لیا جائے گا۔ مولانا معین الدین نے اس صورت حال سے ضیاء الحق کو آگاہ کر دیا تھا۔ ایک دن میں مولانا کو ملنے کے لیے اوکاڑے گیا اور رات انھی کے پاس رہا۔ رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب مولانا کو صدر کا ٹیلی فون آیا۔ وہ کسی غیر ملکی دورے پر جا رہے تھے۔ اُنھوں نے مولانا سے دعا کی درخواست کی اور ساتھ ہی بتایا کہ متعلقہ سیکرٹری کو بلا کر جامعہ سلفیہ (اسلام آباد) کے لیے پلاٹ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس پلاٹ میں جامعہ سلفیہ کی پوری عمارت تعمیر ہوئی، جس میں کئی سال سے متعدد اساتذہ کرام فریضہ تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔

صدر ضیاء الحق، مولانا معین الدین لکھوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے روحانی علاج سے وہ بڑے متاثر تھے۔ اُنھوں نے مولانا کو مجلس شوریٰ کا رکن بنایا۔ علاوہ ازیں مولانا عام انتخابات میں تین مرتبہ ضلع قصور سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ لوگوں کے کام

کرواتے تھے اور لوگ ان کی بے حد تکریم کرتے تھے۔ خاندانی اعتبار سے تو وہ اہم مرتبے پر فائز تھے ہی، ذاتی طور پر بھی ان کو اعزاز کا مقام حاصل تھا۔

مولانا معین الدین لکھوی اسلامی اقدار کے علم بردار، خوش اخلاق، نیک کردار اور قومی اور بین الاقوامی سیاسیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ان کی دینی اور ملی خدمات کے اعتراف میں 14۔ اگست 1981ء کو انھیں ستارۂ امتیاز کا ایوارڈ دیا گیا۔

نواز شریف کی حکومت میں وہ مذہبی اور اقلیتی اُمور کی کمیٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ نیشنل کمیٹی برائے دینی مدارس، نیشنل سیرت کمیٹی اور انصاری دستور کمیشن کے رکن رہے۔

مولانا معین الدین مسلم لیگ کے حلیف تھے، لیکن ہر معاملے میں حکومت کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواز شریف کی مسلم لیگی حکومت نے زرعی ٹیکس نافذ کرنا چاہا تو مولانا ممدوح نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا حکومت اگر زمینداروں سے عشر وصول کرے تو یہ عین اسلامی کام ہے، لیکن جب معاملہ اور آبیانہ وغیرہ وصول کیا جاتا ہے تو پھر زرعی ٹیکس کا نفاذ ہر گز نہیں ہونا چاہیے...... اُنھوں نے ہمیشہ حکومت کو ایسے مشورے دیے جو عوام کے لیے فائدے کا باعث تھے۔

ایک مرتبہ فرزند اقبال جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال نے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کا دور سنہری دور نہیں تھا۔ مولانا نے 9۔ نومبر 1992ء کے روزنامہ ''پاکستان'' میں شائع شدہ اپنے مضمون میں جاوید اقبال کی ان باتوں کا جواب دیا اور فرمایا آپ کے والد بزرگ وار علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' میں اسے سنہری دور قرار دیا ہے اور اس نظم کا پہلا شعر یہ ہے:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

ایک مرتبہ انہی جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال نے شراب نوشی اور بے پردگی وغیرہ پر پابندی کو غیر ضروری قرار دیا تو مولانا نے جواب میں فرمایا: ان چیزوں پر پابندی کسی ملا نے

نہیں لگائی، اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے اور اس کی وجہ بھی بیان کی ہے۔

مولانا ممدوح نے 1953ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کی پاداش میں سات آٹھ مہینے منٹگمری جیل میں قید رہے۔ ایک دفعہ میں اور مولانا داؤد غزنوی ان سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کا نام محمد عمر ترین تھا، اُنھوں نے اپنے دفتر میں ہی مولانا معین الدین کو بلالیا اور وہیں ہمیں چائے پلائی اور مولانا سے ملاقات کرائی۔ جیل کے حکام مولانا کا احترام کرتے تھے۔ مولانا نے بتایا تھا کہ خان عبدالغفار خاں بھی اسی جیل میں ہیں اور وہ ان کی اقتدا میں نمازیں پڑھتے اور خطبہ جمعہ میں شامل ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ایک مرتبہ میں تنہا مولانا سے ملاقات کے لیے گیا۔ اس وقت بھی سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ مولانا نہایت خوش تھے۔ اور راہِ خدا میں یہ سزا ان کے لیے موجب مسرت تھی۔

1974ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں بھی مولانا ممدوح کے کردار کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔

مولانا معین الدین کی شادی دہلی میں مشہور مصنف و مترجم اور معروف مناظر و خطیب حضرت مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی (متوفی مارچ 1941ء) کی دختر بلند اختر سے ہوئی تھی۔ جن صاحب کی وساطت سے شادی ہوئی، ان کا نام مولوی عبدالعزیز تھا۔ وہ مولانا جوناگڑھی کے ہم زلف تھے، اصلاً گوجراں والا کے رہنے والے تھے اور اُنھوں نے مولانا محمد علی لکھوی سے اس زمانے میں کتبِ حدیث پڑھیں اور سند لی تھی، جب مولانا لکھوی لاہور کی چینیاں والی مسجد میں مولانا داود غزنوی کے زمانۂ اسارت میں خطابت و تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ یہ 33۔1932ء کی بات ہے۔

مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کا شمار دہلی کے اصحابِ ثروت مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ ان کی بہت بڑی کوٹھی باڑہ ہندوراؤ میں مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ کے قریب تھی۔ میں نے ان کی کوٹھی بھی دیکھی ہے اور مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ بھی دیکھا ہے۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ بعد یہ کوٹھی سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان کے نام الاٹ ہوگئی تھی۔

مولانا معین الدین کی بارات مولانا محی الدین سمیت (مجھے یاد پڑتا ہے) چار افراد پر مشتمل تھی۔ تین یا چار روز یہ لوگ دہلی رہے اور پھر دہلی سے بمبئی ایکسپریس پر سوار ہو کر فیروز پور کے ریلوے اسٹیشن پر اُترے اور فیروز پور سے لکھو کے گئے۔ وہیں ولیمہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد لکھو کے سے اپنے مسکن مرکز الاسلام آئے۔ دلہن کے لیے جو ہندوستان کے دارالحکومت دہلی سے آئی تھیں اور اپنے والد مکرم مولانا محمد جونا گڑھی کے ساتھ ان کے پندرہ روزہ ''اخبار محمدی'' میں کام کرتی رہی تھیں، یہ سارا ماحول اجنبی تھا۔ دیہاتی علاقہ، دھول سے اٹی ہوئی گلیاں، کچے مکان، پنجابی بولی، مرکز الاسلام کے جنگل کی فضا۔ ان سب چیزوں سے انھیں پہلی دفعہ واسطہ پڑا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس ماحول سے ان کی صلح ہو گئی تھی۔

اس نیک بخت خاتون نے 11۔ ستمبر 1984ء کو وفات پائی اور مولانا معین الدین سے ان کی 43 سالہ رفاقت ختم ہو گئی۔ میں ان دنوں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بہ طور ریسرچ فیلو تصنیفی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ مجھے پتا چلا تو اسی وقت لاہور سے روانہ ہوا اور اوکاڑے پہنچا۔ جنازے کے بعد مرحومہ کی میت اللہ آباد (قلعہ تارا سنگھ) لے جائی گئی۔ وہاں دوسرا جنازہ پڑھا گیا اور انھیں وہیں دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب آیئے مولانا معین الدین کی اولاد کی طرف۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے مولانا بارک اللہ لکھوی ہیں۔ دینی علوم کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ایم اے (اکنامکس) کیا۔ پہلے وہ مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین کے نام الاٹ شدہ زمینوں کی نگرانی کرتے تھے۔ پھر اوکاڑہ میں اپنے والدِ محترم کے ساتھ خدمات انجام دینے لگے۔ مولانا کی وفات کے بعد لوگوں کا روحانی علاج بھی کرتے ہیں۔ نیکی وصالحیت اور وضع قطع میں اپنے اسلاف کا صحیح نمونہ۔۔۔ عالی کردار اور بلند اخلاق۔ ان کی شادی اپنے تایا مولانا محی الدین لکھوی کی صاحب زادی سے ہوئی۔

مولانا معین الدین لکھوی کے دوسرے بیٹے ڈاکٹر زعیم الدین عابد لکھوی ہیں۔ وہ

امراضِ قلب اور بلڈ پریشر کے ماہر معالج ہیں۔ پہلے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز اسپتال اوکاڑہ میں خدمات انجام دیتے تھے۔ پھر سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر اوکاڑہ شہر میں اپنا کلینک قائم کر لیا۔ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو انجمن اصلاح معاشرہ (رجسٹرڈ) کھڈیاں خاص ضلع قصور کے زیر اہتمام ''فری کیمپ'' میں ڈیوٹی دیتے ہیں۔ ایک اتوار کو بہاول نگر بھی جاتے ہیں۔ وہاں بھی دل اور بلڈ پریشر کے مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔

تیسرے بیٹے ڈاکٹر عظیم الدین زاہد لکھوی ہیں۔ یہ میو ہسپتال (لاہور) میں کارڈیالوجی (شعبہ امراض قلب) میں خدمت انجام دیتے تھے۔ پنجاب میڈیکل ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اُنھوں نے چولستان کے ریگستانوں اور بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں مفت طبی خدمات سرانجام دیں۔ عظیم باپ کے یہ عظیم فرزند ضلع قصور کے مختلف مقامات میں بلا معاوضہ مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ ہم دردی کا پیکر اور اخلاق حسنہ کا مجسمہ۔ جہاں جاتے ہیں، ان کا کلینک بھی ان کے ساتھ ہی جاتا ہے۔

اب مولانا معین الدین لکھوی کی دخترانِ بلند اطوار کا تذکرہ چند الفاظ میں:

مولانا کی سات بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک بیٹی کا انتقال ہو گیا تھا۔ بیٹیوں کے کوائف حیات درج ذیل ہیں۔

(1) نجمہ بیگم: ابتدائی دینی تعلیم کے علاوہ سکول و کالج کی تعلیم بی اے تک حاصل کی۔ مولوی محمد علی سے شادی ہوئی۔ اولاد چار بیٹے ہیں اور تین بیٹیاں۔ اوکاڑہ شہر میں مقیم ہیں۔

(2) نعیمہ بشیر: تعلیم ایم اے اسلامیات (بی ایڈ) پروفیسر بشیر الدین لکھوی سے شادی ہوئی۔ گرلز ہائی سکول دیپال پور میں ہیڈ مسٹریس تھیں، ریٹائرڈ ہو چکی ہیں۔ اولاد دو بیٹے ہیں اور ایک بیٹی۔ رہائش دیپال پور (ضلع اوکاڑہ) میں ہے۔

(3) خدیجہ سرفراز: تعلیم ایم اے اسلامیات۔ گورنمنٹ کالج (برائے خواتین) اوکاڑہ میں اسلامیات کی لیکچرار رہیں۔ ڈاکٹر سرفراز علی رانا سے شادی کے بعد ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔ اولاد ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ پتوکی (ضلع قصور) میں مقیم ہیں۔

(4) قدسیہ بانو: تعلیم بی اے۔ اپنے پھوپھی زاد عمر فاروق لکھوی سے شادی ہوئی۔ اولاد تین بیٹے ہیں۔ سکونت اوکاڑہ میں ہے۔

(5) صبیحہ بیگم: تعلیم ایم اے اسلامیات۔ گورنمنٹ کالج (برائے خواتین) اوکاڑہ میں اسلامیات کی لیکچرار تھیں۔ عالم جوانی میں کینسر کے موذی مرض سے وفات پائی۔

(6) زاہدہ حماد: تعلیم ایم اے اردو، گورنمنٹ ہوم اکنامکس کالج لاہور میں اردو کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ اپنے تایا زاد پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی سے شادی ہوئی۔ اولاد چار بیٹے ہیں۔ لاہور میں اقامت گزیں ہیں۔

(7) عادلہ حمود: تعلیم بی اے۔ اپنے تایا زاد ڈاکٹر پروفیسر محمد حمود لکھوی سے شادی ہوئی۔ اولاد ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ رینالہ خورد (ضلع اوکاڑہ) میں مقیم ہیں۔

مولانا معین الدین کی ان بیٹیوں نے دینیات کی تعلیم بھی حاصل کی۔

مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین سے میری پہلی ملاقات یکم جنوری 1937ء کو ہوئی تھی، جب میں حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ اپنے آبائی وطن کوٹ کپورہ (سابق ریاست فرید کوٹ) سے طالب علم کی حیثیت سے مرکز الاسلام آیا۔ اس تاریخ سے لے کر ان دونوں بھائیوں کی زندگی کے آخری دم تک ہمیشہ ہمارے درمیان گہرے تعلقات قائم رہے۔ اس طویل عرصے میں بے شمار انقلابات آئے اور تغیر وتبدل کے لا تعداد جھکڑ چلے، لیکن ہمارے باہمی مراسم نے الحمد للہ ہر حال میں اپنا سفر نہایت خوش گوار انداز میں جاری رکھا۔

ہمارے باہمی تعلقات اور اعتماد کا یہ حال تھا کہ تقسیم ملک کے بعد مرکز الاسلام کی تقریباً دو مربعہ وقف شدہ اراضی کا مسئلہ پیدا ہوا تو مولانا معین الدین نے لاہور میں سنٹرل ریکارڈ کے حاکم مجاز کو گواہی کے لیے تین آدمیوں کے نام دیے، وہ تھے مرکز الاسلام کے قریب کے گاؤں موضع برج کے رہنے والے نمبردار میاں محمد اقبال ریک وال، اسی گاؤں کے میاں محمد صدیق ریک وال اور ان سطور کا راقم عاجز۔ اس وقت میں اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔

میں نے اپنے طور پر لکھوی خاندان کے ہر فرد کے ساتھ ہمیشہ احترام سے پیش آنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی متعدد مثالوں میں سے تین مثالیں عرض کرتا ہوں۔ 1948ء کے آخر میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے میں لاہور آیا تو ایک روز میرے دفتر شیش محل روڈ پر ایک نوجوان آئے۔ اُنھوں نے بتایا کہ میرا نام سعید احمد ہے اور میں مولوی احمد حسن لکھوی کا بیٹا ہوں۔ میں نے ہیلے کالج میں داخلہ لیا ہے لیکن ہوسٹل میں رہائش کے لیے کمرہ نہیں ملا۔ میں چاہتا ہوں کہ چند روز کے لیے آپ میری رہائش کا انتظام کر دیں۔ میں نے جواب دیا آپ لکھوی ہیں، میں آپ کے لیے ضرور انتظام کروں گا۔ میں نے اپنے کمرے کی چابی ان کو دی اور کہا جب تک جی چاہے اس کمرے میں رہیں۔ اس میں چارپائی بھی ہے اور بستر بھی۔ اُنھوں نے کہا آپ کہاں رہیں گے؟ میں نے عرض کیا آپ میری پروا نہ کریں، اپنا کام چلائیں۔

اس سے کئی سال بعد جب کہ میں ریسرچ فیلو کے طور پر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں سرکاری ملازمت کرتا تھا اور میرا دفتر کلب روڈ پر تھا، یہی سعید احمد لکھوی، مولانا معین الدین کا رقعہ لے کر آئے۔ وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کا دور تھا اور مرکز اور پنجاب کی حکومتوں میں اس پارٹی کے متعدد وزرا اور ارکانِ اسمبلی سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ ان وزراء اور ارکانِ اسمبلی میں کئی اہل حدیث حضرات بھی تھے جو لوگوں کے کام کر کے خوش ہوتے تھے۔ سعید احمد لکھوی اسلام آباد کے کسی کالج میں پروفیسر تھے اور انھیں ایک مرکزی وزیر سے کوئی کام تھا۔ مولانا معین الدین نے رقعے میں لکھا تھا کہ سعید احمد کا یہ کام ضرور کرا دو۔ چنانچہ میں نے متعلقہ وزیر کے نام خط لکھ کر سعید احمد لکھوی کو دیا اور اللہ کی مہربانی سے کام ہو گیا۔

پروفیسر سعید احمد لکھوی نے اسلام آباد سے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ اُنھوں نے میری بعض کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، جن میں لکھوی خاندان کے بزرگوں کے حالات مرقوم ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سعید احمد ساہی وال چلے گئے تھے۔ بہت سالوں کے بعد ایک مرتبہ وہ ساہی وال سے مجھے ملنے کے لیے میرے گھر لاہور آئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ

میں لمبی سی لاٹھی ہے۔ ان کی کمر دوہری ہو چکی ہے اور وہ لاٹھی کے سہارے سے چلتے ہیں۔ یہ ان سے میری آخری ملاقات تھی۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر یہ شعر میری زبان پر آئے۔

دنیا بھی عجیب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اس سے کچھ عرصے کے بعد پتا چلا کہ سعید احمد وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ مغفرت فرمائے، یہ مولانا معین الدین کے سب سے چھوٹے بہنوئی تھے۔ مجھے ان کی وفات پر بے حد افسوس ہوا۔

مولانا معین الدین کے ایک قریبی رشتے دار مولوی ولی محمد لکھوی تھے جو مرکز الاسلام سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر موضع ''دلارام'' میں سکونت پذیر تھے اور میرے مہربان تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کسی کام کے سلسلے میں وہ میرے پاس لاہور تشریف لائے اور کام کی نوعیت بیان کی۔ جس سرکاری اہل کار سے ان کے کام کا تعلق تھا، میں انھیں ان کے پاس لے گیا اور اللہ نے کرم فرمایا، کام ہو گیا۔ اُنھوں نے مجھے بڑی دعائیں دیں۔

اس قسم کی اور باتیں بھی ہیں۔ میں عرض صرف یہ کرنا چاہتا ہوں کہ لکھوی خاندان کے ہر فرد سے میرا ہمیشہ نیاز مندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق رہا، اب جب کہ میں عمر کے آخری دور میں پہنچ گیا ہوں، اللہ کے فضل سے یہی صورت حال ہے اور ان کے چھوٹے بڑے ہر فرد کا احترام میرے دل میں جاگزین ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان پر کوئی کسی بھی انداز میں تنقید کرے، میرے لیے اسے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بات مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین کے بارے میں ہو رہی تھی۔ میں نے زندگی کے طویل دورانیے میں دیکھا کہ یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کی بے حد تکریم کرتے تھے اور نہایت اعتماد کی فضاؤں میں ان کے شب و روز کا سفر طے ہوتا تھا۔ جس طرح یہ

جسمانی اعتبار سے خوب صورت تھے، اسی طرح ان کے اخلاق و کردار بھی خوب صورتی کے قالب میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں کی روح کو حسنات کی غذا حاصل ہوتی اور سکونِ قلب کی دولت ملتی تھی۔

مولانا معین الدین کی بیماری کے دنوں میں ایک مرتبہ میں اور ڈاکٹر تنویر قاسم رانا (انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور) ان کی عیادت کے لیے اوکاڑے گئے تو ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے۔

وفات سے تین مہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک دن رات کے نو بجے کے قریب میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اُٹھایا تو آواز آئی "میں اوکاڑہ سے سرفراز بول رہا ہوں۔ مولانا معین الدین آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ لاہور سے میرے یار اسحاق بھٹی کو لاؤ، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" سرفراز نے کہا: "میں صبح گاڑی لے کر آؤں گا، آپ تیار رہیں۔" چنانچہ وہ آئے اور میں ان کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نئی اور پرانی بہت باتیں ہوئیں۔

میں نے ان سے عرض کیا: ہم بہت عرصہ اکٹھے رہے ہیں۔ اس اثنا میں مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہوں گی بلکہ یقیناً ہوئی ہیں۔ اپنے حسنِ اخلاق کے تقاضے کے مطابق آپ نے مجھے معاف کر دیا ہوگا، لیکن میری درخواست ہے کہ اب پھر معاف فرما دیں۔ ارشاد ہوا میں نے سب کو معاف کیا، تمھیں بھی معاف کیا۔

شام کو ہم گاڑی پر سیر کے لیے گئے۔ اُنھوں نے فیصل آباد روڈ پر وہ جگہ دکھائی جہاں جامعہ محمدیہ منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور جامعہ کے لیے جو زرعی رقبہ خریدا گیا ہے وہ بھی دکھایا۔ اس وقت اس میں کپاس کی فصل دکھائی دے رہی تھی۔ اس جہانِ ناپائیدار میں ان کے ساتھ میری یہ آخری نشست تھی اور آخری باتیں۔

اُنھوں نے 8 اور 9۔ دسمبر 2011ء کی درمیانی شب کو اس دنیائے فانی سے منہ موڑا اور عالمِ جاودانی کو روانہ ہوئے۔ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے جب میں حافظ احمد شاکر کے ساتھ اوکاڑے پہنچا تو ان کا بے جان لاشہ جامعہ محمدیہ کے سامنے چارپائی پر پڑا تھا

اور روح جنت الفردوس کو پرواز کر گئی تھی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

ان کی چار پائی کے قریب ان کے بھتیجے داماد ڈاکٹر محمد حماد لکھوی بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور بھی بہت لوگ موجود تھے۔ ہمارے باہمی تعلقات کی گزشتہ 74 سال کی تاریخ سمٹ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی، جس کے آئینے میں ان کی نوجوانی، جوانی، دورِ کہولت، بڑھاپا، سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا اور ان تمام ادوار میں ان کی صالحیت کے نقوش بھی ابھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جھک کر ان کا معصوم چہرہ دیکھا اور پنجابی کا یہ شعر میرے ذہن میں گھومنے لگا

جا اوئے یار حوالے رب دے میلے چار دناں دے
اس دن عید مبارک ہوسی جس دن فیر ملاں گے

ان کی نمازِ جنازہ 9۔ دسمبر کو نمازِ عصر کے بعد ساڑھے چار بجے مولانا محی الدین لکھوی کے فرزند ارجمند پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی نے اوکاڑہ میونسپل سٹیڈیم کی وسیع گراؤنڈ میں نہایت رقت آمیز لہجے میں پڑھائی۔ جنازے میں علمائے کرام، صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ارکان، صحافی حضرات، وکلاء و تجار اور دور ونزدیک کے دیہات اور بلاد و قصبات کے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ جنازے کے بعد ان کی میت کو تدفین کے لیے ان کے گاؤں الہ آباد (قلعہ تارا سنگھ) لے جایا گیا، وہاں ان کی دوسری نماز جنازہ پڑھی گئی اور انھیں ان کے برادرِ کبیر مولانا محی الدین لکھوی کے پہلو میں سپردِ لحد کر دیا گیا۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه وادخله جنت الفردوس

اس طویل سفرِ تحریر کی تکمیل کے بعد آپ لکھوی خاندان کے فوت شدگان کے لیے دعائے مغفرت کریں اور زندوں کے لیے بارگاہِ الٰہی میں التجا کریں کہ وہ انھیں اپنے اسلاف کی طرح خدمتِ دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔

اب یہ خاک نشین قارئین کرام سے رخصت کی اجازت چاہتا ہے اور کسی صاحب کے بارے میں کوئی ناگوار لفظ زبانِ قلم پر آ گیا ہو تو معافی کا خواستگار ہے۔

کاروانِ سلف

تالیف

محمد اسحاق بھٹی

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

لاہور
ہادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد
بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

تذکرہ
مولانا محی الدین لکھوی رحمہ اللہ

حالات • خدمات • خاندان





مکتبہ اسلامیہ

لاہور: بادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد: بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

/maktabaislamia1 maktabaislamiapk.com maktabaislamiapk@gmail.com